کوئی ٹکراؤ بھا نظر نہیں آتا ۔ وہاں وہ کتاب و سنت کا کھلا منشا نظر آتا ہے ، اور جہاں کوئی ٹکراؤ نظر آتا یا اس کی خواہش اور منفعت پر کوئی ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دی ، یا اس کو اس خیال نے ستایا کہ دنیا میں ہم رجعت پسند مشہور ہو جائیں گے ، تو خلافت راشدہ کے تعامل یا روایات[1] کو اور اس سے بھی نیچے اتر کر کسی ایک شخص کی رائے کو اپنے استدلال کی بنیاد بنا کر کتاب و سنت کے کھلے ہوئے احکام اور پوری امت کے تعامل کو نظر انداز کرنے میں ذرہ بھی وہ تامل نہیں کرتا ، چنانچہ ایسے لوگ کبھی حضرت عمرؓ کی روایات کو بہانہ بناتے ہیں ، کبھی شرح وقایہ کے کسی جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں ، کبھی علامہ شبلیؒ اور ڈاکٹر اقبال کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں اور ان کی رائے یا قرآن و سنت کے سلسلہ میں ان کی تشریحات (جن کا مفہوم وہ خود طے کرتے ہیں) کے مقابلہ میں پوری امت کے تعامل اور اس کی تشریحات کو نظر انداز کر دیتے ہیں ، چنانچہ طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں بھی ان کا رویہ یہی ہے ، تفویض طلاق کے سلسلہ میں انھوں نے شرح وقایہ کے ایک جزئیہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنائی ، مگر طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں حضور کے واضح ارشادات ، صحابہ کے تعامل اور ائمہ اربعہ کے اجماع سب کو نظر انداز کر کے امت کے دو چار علما کی رائے کو انھوں نے ترجیح دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہی کو ترجیح کے لئے کافی تھا ۔

بہر نوع جو لوگ یہ کہتے ہیں ، کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں ، ان کا استدلال دو روایتوں پر ہے ،

پہلی روایت | پہلی روایت حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے ، کہ رکانہ کے والد عبد یزید نے اپنی عورت ام رکانہ کو طلاق دیدی ، اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی ، مگر دوسری بیوی سے نباہ نہ ہو سکا ، یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا ، آپ نے عبد یزید سے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی کو واپس بلا لو ، انھوں نے کہا کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں ، آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم ہے ، تم رجوع کر لو[2] ،

دوسری روایت میں ابو رکانہ کے بجائے خود رکانہ کا واقعہ بیان ہوا ہے ، اور اس میں لفظ ثلاثہ (تین) کے بجائے البتہ (قطعی) کا لفظ ہے ، بحث آگے آتی ہے ۔

دوسری روایت | دوسری روایت طاؤس سے مروی ہے ، کہ ایک شخص ابو صہبا حضرت ابن عباسؓ سے

---

[1] گو خلفائے راشدین کے تعامل یا ان کی روایات سے ان کا استدلال صحیح نہیں ہوتا ، مگر وہ اس کی آڑ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں ۔

[2] یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے ، مگر یہی روایت دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے ۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ، علامہ خطابی نے لکھا ہے ، "فی اسناد ھذا الحدیث مقال لان ابن جریج انما رواہ عن بعض بنی ابی رافع ولم یسمہ والمجہول لا یقوم بہ الحجۃ" (ج ۳ ص ۲۰۰) اس روایت کی سند پر کلام کیا گیا ہے اسلئے کہ ابن جریج نے ابو رافع کے خاندان کے بعض افراد سے نقل کیا ہے جس کا نام نہیں لیا گیا اسلئے یہ روایت قابل صحت نہیں ہے ۔

بہت سوال کرتا تھا، اس نے ایک بار ابن عباس سے کہا کہ آپ کو تو اس کا علم ہوگا، کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائے عہد فاروقی میں تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں، آپ نے کہا ہاں ایسا ضرور تھا، مگر جب حضرت عمر نے دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں، جس میں ان کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے تھا، تو انھوں نے حکم دیا،

اجیزوھن علیھم[1] ان پر تین طلاقیں نافذ کردی جائیں۔

ان روایات کی صحت و عدم صحت اور ان کے مفہوم کے تعین پر محدثین نے جو بحثیں کی ہیں، ان کو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نفس مسئلہ کو قرآن، سنت اور آثار صحابہ اور سلف امت کے عام تعامل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

پہلی اور دوسری ہجری تک جب کہ ابھی طلاق اور رجعت کے احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوتے تھے، تو اس میں لوگ بڑی بے اعتدالی سے کام لینے لگے تھے، ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دیدیتا تھا، اور پھر جب عورت اس سے علیحدہ ہو کر کسی اور سے اپنا نباہ کرنا چاہتی تھی، تو مرد رجوع کر لیا کرتا تھا، اور اس طرح زندگی میں کتنی ہی طلاق دیتا اور رجوع کر لیتا[2]، اس کو غصہ آیا، اس نے طلاق دیدی، غصہ فرد ہوا، رجوع کر لیا، چونکہ عورتوں کے لئے یہ صورت انتہائی تکلیف دہ تھی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اس طرح کے معاملے پیش ہوتے تھے، تو آپ اس کے جواب میں ہمیشہ توقف فرمایا کرتے تھے، اس لئے کہ قرآن میں ابھی صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ جب "الطلاق مرتان" کی آیت نازل ہوئی، تو آپ نے حکم دیدیا کہ ایک مرد زیادہ سے زیادہ تین طلاق دے سکتا ہے، حضرت عائشہ کی زبان سے اس حکم کے نزول کی تفصیل سنئے، حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ

"طلاق کا حکم نازل ہونے سے پہلے ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دیدیتا تھا اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا تھا، یہانتک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھ کو علیحدہ کرونگا، اور نہ تجھ کو اپنے قریب ہی آنے دونگا، ایسا ہی کرتا رہوں گا، یہ حضرت عائشہ کی خدمت میں آئی، اور اس نے اپنی تکلیف بیان کی، حضرت عائشہ نے اس کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ اسے سن کر خاموش ہوگئے، اور اس وقت کوئی جواب نہیں دیا، اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی،

---

[1] اس روایت کے الفاظ میں بڑا اختلاف ہے بحث آگے آئے گی، ابوداؤد اور مسلم وغیرہ کی یہ روایت ان ہی الفاظ میں مندرج ہے،

[2] جاہلیت میں اس پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے وہ عادتیں اب تک جاری تھیں،

جنوری ۱۹۸۴

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

مجیب اللہ ندوی

التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ (یوپی)

دار التالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ:- مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے، اور عام انسان کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے، اگر فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کی بہت سی دیواریں منہدم ہو جائیں گی اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جا[ئے]

سائز ۲۲ × ۱۸، صفحات [illegible]، قیمت ۵۰ پیسے

دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں و تحریروں کا مجموعہ ہے جو طلبہ، اساتذہ و منتظمین مدارس عربیہ کے سامنے ان کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں کرتے رہے ہیں، یہ تقریریں اور تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم [illegible] عثمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی نے [illegible] میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔

سائز ۲۲ × ۱۸، صفحات [illegible]، قیمت ۴ روپئے ۵۰ پیسے

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں [illegible] گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادی فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے، اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔

قیمت للعہ ۱۲/-

اسلامی فقہ

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی مدظلہ

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جو ثانوی درجات کے طلبہ اور متوسط پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں فقہ اسلامی کے مسائل کو بہت ہی آسان اور دل نشین انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر معاشرتی مسائل یعنی نکاح و طلاق، خلع، وصیت اور وراثت اور معاملات میں خرید و فروخت، قرض و رہن، مضاربت و شرکت اور اسلامی قانون اجرت پر جتنی تفصیل لکھا گیا ہے اردو زبان میں کسی دوسری کتاب میں اتنی تفصیل آپ کو نہیں ملے گی، عبادات والے حصہ میں ذکر و دعا کا بھی ایک باب ہے جس میں اس کی اہمیت اور حیثیت پر بڑے مؤثر انداز میں گفتگو کی گئی ہے اس کو پڑھ کر ذکر و دعا کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

سائز ۲۲ × ۱۸، قیمت تینوں حصوں کی مجلد ۲۵ روپئے۔

ملنے کا پتہ:- شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد، رشاد نگر اعظم گڈھ (یوپی)

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ (یوپی) چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد، رشاد نگر اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان	سالانہ چندہ
ہندوستان سے 29/=	ماہنامہ	غیر ممالک سے
چندہ ششماہی 12/=	**الرشاد**	بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ 2 - 50	جامعۃ	12/=

جلد ۶	جنوری ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ	شمارہ ۳۱

فہرست مضامین

مجلس ادارت

رشحات

اس وقت ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے سامنے جو پریشان کن معاشی، سیاسی اور تعلیمی مسائل درپیش ہیں وہ سب اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں مگر راقم الحروف کے نزدیک اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیمی پستی ہے۔ اسی تعلیمی پستی کا نتیجہ ہے کہ وہ اسلامی مملکتیں جو آزاد ہیں اور جن کے یہاں دولت کی ریل پیل ہے ان کے یہاں بھی نہ کوئی صنعتی اور سائنسی ترقی نظر آتی ہے اور نہ عوام معاشی لحاظ سے خود کفیل بن سکے ہیں۔ گذشتہ رشحات میں راقم الحروف یہ بھی عرض کر چکا ہے کہ اسلامی حکومتوں کے قبضہ میں اس وقت دنیا کے آدھے مادی وسائل موجود ہیں۔ مگر جس قوم کو اپنی دولت اور وسائل کے استعمال کا سلیقہ نہ ہو اسے زوال اور ذلت سے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔

جس جگہ مسلمان ایک قلیت کی حیثیت سے رہ رہے ہیں وہاں بھی مسلمانوں کی اصل کمی تعلیم ہی ہے خاص طور پر ہندوستان کے مسلمان اپنے ساتھ امتیازی سلوک کا شکوہ کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا گیا اور ان کو پیچھے ڈالنے کی پوری کوشش کی گئی۔ ہم اس زیادتی کی برابر شکایت کرتے رہے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم نے بھی ان حالات کے مقابلہ کے لئے اپنی پوری صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کو اس پہلو پر ضرور غور کرنا چاہئے۔ ہم یہاں اقلیتی کمیشن کے سکریٹری این۔ سی۔ سکسینہ کے مضمون کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۳ء کے پائنیر (PioneeR) میں "مسلمانوں کی پستی کا سبب جہالت ہے" کے عنوان سے انہوں نے اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ ان کے بعض مندرجات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی انہوں نے مسلمانوں کی پستی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

مسلمانوں کی پستی کا اصل سبب جہالت ہے

" تعلیمی اعتبار سے مسلمان ملک کے دوسرے فرقوں سے دس گنا پیچھے ہیں۔ ان کی معاشی پستی کا بنیادی سبب ان کی تعلیمی پستی ہے مسلم علماء کا خیال ہے کہ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم

کا اثر[1] اسلام کے لئے خطرناک ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے اسلامی ادارے جن میں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما لکھنؤ بھی شامل ہیں، انگریزی تعلیم کو اپنے نصاب سے خارج کر چکے ہیں (ندوۃ العلما اور دارالعلوم دیوبند دونوں کے بارے میں یہ بات صحیح نہیں ہے) کچھ کٹر قسم کے مسلمان تو ایسے بھی ہیں جو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں بھی بھیجنے سے منع کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انگلش میڈیم اسکولوں کے تعلیم یافتہ مسلمان اپنا امتیاز کھو بیٹھتے ہیں۔ واقعہ کے لحاظ سے مسلمانوں کا اندیشہ صحیح ہے۔

جو مسلمان کاروبار اور تجارت میں آگے نکل گئے ہیں وہ تعلیم کو لائق اعتنا سمجھتے ہی نہیں۔ صنعتی اور فنی کاموں میں ان کے انہماک نے انھیں یقین دلا دیا ہے کہ جدید تعلیم انھیں کسی فوری منافع سے ہم کنار نہیں کر سکتی۔ (یہ بات بڑے تاجروں کے سلسلہ میں تو صحیح نہیں ہے مگر چھوٹے تاجر اور صنعت کاروں کے سلسلہ میں کسی حد تک صحیح ہے۔)

مسٹر سکینہ نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کا ذمہ دار مسلم لیڈروں کو قرار دیا ہے۔ مسلم قائدین مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مسلم پرسنل لا بورڈ اور اردو وغیرہ جیسے بے کام کے کاموں کے دیوانے ہیں[2]۔ ان لوگوں نے جہالت سے نجات پانے کے لئے تعلیمی اور صنعتی اداروں کے قیام کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کی (یہ صحیح ہے کہ مسلم راہنماؤں نے واقعی اس طرف بہت کم توجہ نہیں کی مگر یہاں مسٹر سکینہ کو حکومت کی جانب دارانہ پالیسی کا بھی ذکر کرنا چاہئے تھا، اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ڈالنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔)

مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا حوالہ دیتے ہوئے مسٹر سکینہ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی تعلیمی صلاحیت میں پیچھے اور اس سلسلہ میں پوری جدوجہد سے محروم ہیں۔

---

[1] مغربی تہذیب سے مراد اگر مغرب کا وہ آزادانہ تمدن ہے جس نے انسان کو جانور کی سطح تک پہنچا دیا ہے تو بے شک علما اس کے مخالف ہیں لیکن اگر اس سے مراد ان کے علوم و فنون اور سائنس و ٹکنالوجی ہے تو اس کے علما مخالف نہیں ہیں۔ [2] افسوس ہے کہ مسٹر سکینہ ان کی اہمیت محسوس نہیں کر سکے یا پھر قصداً مسلمانوں کا ذہن ادھر سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ کام بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

بلا امتیاز مواقع

انہوں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ ملازمت کے میدان میں محض مذہب کے سبب ان کو نامنظور کر دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کی نشوونما میں دلچسپی سے کام نہیں لیتے۔ مسلم ماہرین تعلیم نے ملازمتوں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کو رد کر دیا ہے۔ انہوں نے رشید احمد شیرانی کی یہ بات نقل کی ہے کہ "مسلم اور ہندو سکول لیڈروں نے مسلمانوں سے بار بار کہا ہے کہ وہ محض امتیازی سلوک کے سبب ملازمت نہیں پا رہے ہیں"۔ میں بھی امتیازی سلوک کا منکر نہیں ہوں۔ مگر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ یہ امتیاز مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ہم ہندوستانی دنیا کے سب سے زیادہ امتیاز برتنے والے لوگ ہیں۔ اگروال بنیا ایک گپتا بنیا سے خود کو کمتر رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک سرجوپاری برہمن خود کو کنیا کبج برہمن سے ممتاز سمجھتا ہے۔ اسی طرح اسمتا ٹھاکر سے اور ٹھاکر برہمن سے امتیاز رکھتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان ملازمت کے بارے میں کوئی ایسا چانس نہیں فراہم کر پا رہے ہیں کہ ان کے خلاف بھی امتیاز کا کوئی رویہ اپنایا جائے

"اسکول چھوڑ کر نکل جاتا گیا"

۴۳۰ مسلم منتظم اسکولوں کی سروے رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ درجہ دس پاس کرنے کے بعد بیشتر طلبہ تعلیم چھوڑ دیتے ہیں گریجویٹ کی سطح پر غیر مسلم طلباء کے مقابلہ میں ان کی تعداد انتہائی کم ہوتی ہے مسٹر سکسینہ نے بتایا کہ دوسرے فرقوں کے ساتھ جہاں بھی مسلمان بستے ہیں وہ آج بھی پستی کے عالم میں ہیں۔ مصر، نائیجریا، ملیشیا اور انڈونیشیا میں بھی مسلمان تعلیم، صنعت اور سائنٹفک پیشوں میں چینیوں اور عیسائیوں سے کافی پیچھے ہیں۔ اور ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ تھائی لینڈ، فلپائن، ماریشس اور سوویت یونین میں مسلمان غریبی کی لائن سے پست زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سکریٹری صاحب کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اپنے غور و فکر کے انداز میں تبدیلی لانی چاہئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو انہیں زر زوال اور سماجی ذلت برداشت کرتے ہی رہنا ہوگا۔

"کرنے کا کام"

مسلم قائدین سے مسٹر سکسینہ کا مطالبہ ہے کہ وہ مسلم اکثریتی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ابتدا کریں۔ ترقی کی راہ کا سب سے اہم کام خود اسی قوم کو کرنا پڑتا ہے۔

(بقیہ : رشحات صفحہ ۵۲ پر)

ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کا مسئلہ

(مجیب اللہ ندوی)

آج سے تقریباً بیس برس پہلے راقم الحروف نے اپنے طویل مضمون "اجتہاد اور تبدیلی احکام" میں ان لوگوں کا جواب دینے کی کوشش کی تھی جو یہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت کے صریح احکام میں مصلحت کے تحت تبدیلی کی جا سکتی ہے اس سلسلہ میں بطور دلیل وہ عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ان چند فیصلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بادی النظر میں نص صریح کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مثلاً فدک کی زمین قطع ید کی سزا کی منسوخی، شرابی کی سزا وغیرہ وغیرہ انہی مسائل میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کا مسئلہ بھی ہے، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے ابتدائی دور تک ایسی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھی مگر حضرت عمرؓ نے سے تین قرار دیا۔

اس مسئلہ میں پوری امت یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء و محدثین متفق رہے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق تین ہی شمار ہوگی۔ سب سے پہلے* امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت کی بنا پر اس مسئلہ کو اٹھایا اور پھر ان کے تلمیذ خاص حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں اس کی مزید وضاحت کی مگر عالم اسلام میں کہیں اور کسی زمانہ میں بھی امام ابن تیمیہؒ کی رائے پر عمل نہیں ہوا مگر ہندوستان کے ہمارے اہل حدیث حضرات نے امام ابن تیمیہ کی تقلید میں اسے عین سنت قرار دے کر فتوی دینا شروع کر دیا۔ جس سے خواہ مخواہ امت میں ایک متفقہ مسئلہ کے سلسلہ میں انتشار پیدا ہو رہا ہے، حالانکہ پوری امت جس چیز کو حرام قرار دے رہی ہو اسے حلال کہدینے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت تھی مگر افسوس ہے کہ ان حضرات نے مسئلہ کی اس اہمیت کو نظر انداز کر کے اسے مفروغ عنہا مسئلہ سمجھ لیا ہے اس مسئلہ کی نزاکت اور پھر امت کو انتشار سے بچانے کے لئے سعودی عرب کے علماء نے

* ابن حزم نے اندلس میں

اپنی شرعی و تحقیقی مجلس البحوث الاسلامیہ میں اس مسئلہ کو اپنی بحث میں اولیت دی اور اس کے مسئلہ کے ماله وما علیہ پر کئی دن غور کرنے اور بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق تین ہی شمار ہوگی اور پوری امت جس پر عمل کرتی رہی ہے وہی کتاب و سنت کے عین مطابق ہے،

انہوں نے موافق و مخالف دونوں طرح کے دلائل کو پوری دیانت داری سے نقل کرنے کے بعد پھر اپنا فیصلہ دیا ہے، پورا مضمون سو صفحے سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ان کے فیصلہ کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے اور پھر اس کے بعد راقم الحروف نے اپنا وہ مضمون جو اس فیصلہ سے بیس سال پہلے لکھا گیا تھا وہ نقل کردیا ہے۔ بحمداللہ وہ تمام باتیں مزید اضافہ کے ساتھ اس میں آگئی ہیں جو البحوث الاسلامیہ کے مجلہ میں درج ہیں، اللّٰھمّ ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ۔

(ادارہ)

البحوث الاسلامیہ کا آخری فیصلہ

اس سلسلہ کی حدود روایتوں اور فقہاء کے اقوال و آراء کے ماله وما علیہ پر غور و فکر کرنے کے بعد مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ "لفظ واحد سے تین طلاق دینے سے تین ہی طلاق واقع ہوگی" مجلس نے جن وجوہات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا ہے اس کی پوری تفصیل آچکی ہے مختصر طور پر ترجیح کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ ارشاد ربانی ہے یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن اس آیت کریمہ میں جس طلاق کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد طلاق ہے جس کے بعد مدت گذارنے اور شوہر کے لئے رجوع کرنے یا چھوڑ دینے کا موقع باقی رہے، یہ بات رجعت سے پہلے مدت کے اندر تین طلاق دینے کے منافی ہے اس لئے کہ یہ طلاق، طلاق للعدۃ نہیں ہوگی، البتہ سیاق کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ طلاق بغیر العدۃ واقع ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ طلاق اگر واقع نہ ہوگی تو طلاق بغیر العدۃ دینے والا ظلم کرنے والا نہیں ہوسکتا ہے ورنہ ہی اس کے اوپر سہولت کا وہ دروازہ بند ہوسکتا ہے، جس کا ذکر آیت کریمہ "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" میں کیا گیا ہے اس مخرج سے مراد عبداللہ ابن عباسؓ کی تاویل کے مطابق رجعت ہے۔ آپؓ نے کسی ایسے شخص سے فرمایا جس نے تین طلاق دے رکھی تھی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" چونکہ تم خدا سے ڈرتے نہیں اس لئے مجھے تمہارے واسطے کوئی سبیل نظر نہیں آتی، تم نے اللہ کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہوگئی۔

اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کسی نے ایک ہی مرتبہ طلاق دیدی تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، اب سوال یہ ہے کہ تین طلاق دینے پر اگر ایک ہی طلاق واقع ہوگی تو اس فتوی کا کیا مفہوم و مطلب ہوگا جس کے اختیار کرنے سے سہولت اور آسانی حاصل ہوتی اور وہ کیا سزا ہو سکتی ہے جو حدود اللہ کو پھاند جانے والے ظالم کو اس حیثیت سے دی جائے کہ اس نے بغیر عدت طلاق دے ڈالی؛ شریعت ایسے شخص کو جس نے اپنی زبان سے کوئی غلط اور منکر بات نکالی اس غلطی کی سزا نہ دے تو پھر اس کو غلطی کی سزا مل ہی نہیں پائے گی۔ جس طرح ظہار کرنے والے کو کفارہ کی صورت میں سزا دی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تین طلاق کو نافذ کرکے یہ سزا دی ہے اور اس نے اس کے لئے سہولت کا وہ راستہ جو تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں اس کے لئے کھولا گیا تھا (بند کر دیا) "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" اور جب اس نے تقویٰ کا راستہ چھوڑ دیا تو اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا،

۲۔ دوسری بات یہ کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا جب اس نے بھی طلاق دیدی تو لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اب یہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ "لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاق الاول" امام بخاری نے اس حدیث کو "باب من اجاز الطلاق ثلاثا" کے تحت ذکر کیا ہے۔

اس حدیث سے استدلال پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث رفاعہ بنت وہب کے واقعہ کا اختصار ہے۔ ان کے بارے میں مسلم کی کئی روایتوں میں یہ ہے کہ ان کے دوسرے شوہر نے ان کو تین طلاق علیحدہ علیحدہ دیا تھا، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ تنہا واقعہ رفاعہ کی بات نہیں ہے بلکہ رفاعہ کے علاوہ ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی یہی قصہ پیش آیا تھا، ایسے اور بھی متعدد واقعات ہوئے ہیں۔ کیونکہ رفاعہ قرظی اور رفاعہ نضری دونوں ہی کے شوہر نے طلاق دی تھی اور دونوں ہی سے عبد الرحمن بن زبیر نے نکاح کرلیا تھا لیکن ان دونوں کو مجامعت سے پہلے ہی طلاق دیدی، پھر آگے علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس بنا پر ان لوگوں کا خیال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے جو صرف ظن کی بنا پر رفاعہ بنت سموئل اور رفاعہ بنت وہب کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔

جب اس حدیث کا موازنہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے کریں گے جس کو طاؤس ان سے روایت کرتے ہیں "کان الطلاق علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وصدر من خلافة عمر الثلاث واحدة" الخ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی) تو ان دونوں حدیثوں میں لفظ ثلاثا سے یکبارگی

ثلاث مراد لینا پڑے گا یا علیحدہ علیحدہ ۔ اگر ایکبارگی مراد لیں گے تو حدیث عائشہ متفق علیہ ہے اس لئے اس کو مقدم رکھنا زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس میں صراحت ہے کہ اس تین طلاق نے اسے حرام کر دیا اب بغیر دوسرے سے نکاح و وطی کئے ہوئے حلال نہیں ہو سکتی اگر علیحدہ علیحدہ مراد لیا جائے تو حدیث طاؤس لفظ ثلاث سے ایک ہی طلاق کے وقوع پر حجت نہیں ہے ۔ رہی یہ بات کہ حدیث عائشہ میں لفظ ثلاث سے علیحدہ علیحدہ اور حدیث طاؤس میں ایکبارگی مراد ہو سکتا ہے کہ نہیں ؟ تو اس کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ بعض محققین مثلاً علامہ ابن قدامہ کی یہ توجیہ کہ "نکاح ایک ملکیت ہے جس کا متفرق طور پر خاتمہ صحیح ہے تو ایکبارگی بھی اس کا ازالہ درست ہوگا جیسا کہ تمام املاک میں ہوتا ہے" اسی طرح قرطبی لکھتے ہیں کہ جمہور علماء کی دلیل بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جس عورت کو تین طلاق دیدی گئی ہو وہ طلاق دینے والے کے لئے اس وقت تک جائز نہیں ہو سکتی جب تک وہ دوسرے کے ساتھ نکاح نہ کر لے اور لفظ طلاق ثلاث میں لغتہً اور شرعاً کچھ بھی فرق نہیں ہے ۔ جو ظاہر فرق محسوس ہو رہا ہے اس کو شارع علیہ السلام نے نکاح، عتق اور اقرار وغیرہ میں لغو قرار دیدیا ہے ۔ چنانچہ اگر کسی نے اپنی باندی سے کہا کہ میں نے تمہارا ان تینوں سے نکاح کر دیا تو نکاح منعقد ہو جائے گا ۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کہتا ہے کہ میں نے اس سے، اس سے اور اس سے تمہارا نکاح کر دیا، یہی حکم عتق اور اقرار وغیرہ کا بھی ہے "......

۴۔ چوتھی بات یہ کہ چند کے علاوہ اکثر علماء کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث ان ثلاثا جدھن جد وھزلھن جد (جو کہ امت کے نزدیک مقبول و معروف ہے) کی بنا پر اجماع ہے کہ ہازل کا طلاق واقع ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہازل بالطلاق اس کے ذکر کی نیت اپنے دل میں کرتا ہے جیسا کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ہازل کے وقوع طلاق کے اسباب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں " جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طلاق میں لغو نہیں ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ ان کے خلاف دلیل موجود ہے ، اگر ہازل کی زبان سے بغیر ارادہ و نیت طلاق کا لفظ نکل گیا تو متفقہ طور پر طلاق واقع نہیں ہوگی ۔ لیکن جب اس نے بطور مذاق صرف اس لفظ کو قصداً ادا کیا ہو تو گویا اس کے دل نے اس کے ذکر کی نیت کی"

پس اگر ایک سے زائد پر اسے محمول کیا جائے تو یہ زیادتی مسلئہ طلاق سے خارج نہ ہوگی بلکہ وہ بھی صریح طلاق ہی ہوگی اور اگر ثلاث سے ایک مراد لیں گے تو اس کے بعض عدد پر تو عمل ہوگا مگر بعض بغیر دلیل کے خارج ہو جائیں گے الا یہ کہ حدیث ابن عباس کو بنیاد بنائیں ، اور حدیث ابن عباسؓ کا جواب آگے آرہا ہے ۔

۵۔ پانچویں بات یہ کہ لفظ ثلاث سے تین طلاق کا واقع ہونا اکثر علماء سے منقول ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر، عثمان عبداللہ ابن عباس، ابن عمر، ابن عمرو اور ابن مسعود وغیرہ تمام ہی اجلۂ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی مسلک ہے اور ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، امام مالک ، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل نیز ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے ۔ ابن ۔

عبدالہادی نے علامہ ابن رجب کا یہ قول نقل کیا ہے" کہ جملہ صحابہؓ تابعین اور ائمہ سلف (جن کے فتاوے کا اعتبار ہوتا ہے) میں سے کسی ایک سے بھی اس طرح کی کوئی صریح بات منقول نہیں ہے کہ دخول کے بعد لفظ ثلاث سے ایک ہی طلاق مقصود ہوگی" شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمؒ اس سلسلے کے اقوال پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ دوسرے یہ کہ، یہ طلاق، طلاق محرم اور لازم ہے یہی امام مالک، امام ابو حنیفہ اور بعد کی روایت کے مطابق امام احمد کا بھی قول ہے، اکثر صحابہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور بعد کے اکثر صحابہؓ اور تابعین رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے" علامہ ابن قیم کا بیان ہے کہ" اسمیں اختلاف ہے یعنی لفظ واحد سے تین طلاق کے وقوع کے بارے میں چار مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ تین طلاق واقع ہوگی، یہی ائمہ اربعہ جمہور تابعینؒ اور اکثر صحابہ کا قول ہے" امام قرطبی کہتے ہیں کہ" ہمارے علماء کا بیان ہے کہ اور ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے کہ لفظ واحد سے تین طلاق کا وقوع لازمی ہے اور یہی جمہور سلفؒ کا قول ہے۔

علامہ ابن العربی نے اپنی کتاب" الناسخ والمنسوخ" میں لکھا ہے جس کو علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب" تہذیب السنن" میں نقل کیا ہے کہ وہ ارشاد ربانی ہے الطلاق مرتان اس کے بارے میں اخیر زمانے میں ایک قوم بھٹک گئی اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ لفظ ثلاث سے تین طلاق واقع نہیں ہوئی بلکہ وہ اسے ایک ہی مانتی ہے وہ اپنی بات کو سلف اول کی جانب منسوب کرتی ہے چنانچہ حضرت علی، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف عبداللہ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم حجاج بن ارطاۃ کے واسطے اس کی روایت کرتے ہیں جو کہ ایک ضعیف اور غیر ثقہ راوی ہیں، اس سلسلہ میں وہ لوگ ایسی حدیثیں، بیان کرتے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں" وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ" وہ لوگ جن باتوں کو صحابہ کرامؓ کی جانب منسوب کرتے ہیں وہ سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہیں، جو نہ کسی کتاب میں مذکور ہیں اور نہ کسی صحابیؓ سے ایسی کوئی روایت منقول ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حجاج بن ارطاۃ کی حدیث کو امت نے رد کردیا ہے اور کسی امام نے اس کی تصدیق نہیں کی ہے"۔

انہی وجوہ کی بنا پر مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر کہ" عہد نبوی دور صدیقی اور اوائل عہد فاروقی میں لفظ ثلاث سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی" ایسے اعتراضات کئے گئے ہیں جن سے حدیث مذکورہ لائق ترک اور ناقابل احتجاج قرار پاتی ہے۔

جمہور کا یہ واضح مسلک ہے کہ جب خبر واحد کے لئے متعدد طرق سے منقول ہونے کے بکثرت داعی موجود ہوں مگر اس کو فرد واحد ہی نقل کر رہا ہے تو یہ اس کے عدم صحت کی دلیل ہے۔ صاحب جمع الجوامع ان اخبار پر جن کی عدم صحت یقینی ہے عطف کرتے ہوئے لکھتے ہیں" والمنقول احادا فیما تتوفر الدواعی الی نقلہ خلافا للرافضۃ" (یعنی وہ حدیث بھی صحیح نہیں ہے جس کے لئے متعدد طرق سے منقول ہونے کے اسباب موجود ہوں مگر وہ

طریق واحد ہی سے منقول ہے برخلاف دوسری نقل کے)

عبداللہ ابن عباسؓ کے تقویٰ، پرہیزگاری، ان کے علم، استقامت اور اظہار حق کی جرأت کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حضرت عمرؓ کے حکم کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے جبکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ عہد نبوی، دور صدیقی اور اوائل خلافت عمر میں طلاق کا حکم ایک ہی تھا، چنانچہ متعہ، بیع دینار کی بیع دینار سے اور ام ولد کی بیع وغیرہ کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ سے ان کا اختلاف ہر کسی کو معلوم ہے، حضرت ابن عباسؓ کی جرأت اظہار حق کا پتہ ان کے اس قول سے چلتا ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کی مخالفت کرتے ہوئے حج تمتع کے بارے میں فرمایا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

"یوشک ان تنزل علیکم حجارة من السماء اقول قال رسول اللہ وتقولون قال ابوبکر وعمر"

(یعنی قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر کی بارش نازل ہو، میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور تم لوگ کہتے ہو کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ نے کہا)

اگر بالفرض یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ حدیث ابن عباسؓ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ تمام اجلہ صحابہ کرام باوجود اس کے کہ وہ تقویٰ و ورع اور استقامت علی الحق کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور عہد نبوی، دور صدیقی اور اوائل خلافت عمر میں ایک مسئلہ کے مکمل پیرو تھے آخر وہ کس طرح حضرت عمرؓ کے ایک ایسے حکم کو تسلیم کر سکتے تھے جو سرتاسر ان کے سابقہ علم و عمل کے خلاف تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ جملہ صحابہ کرام میں سے کسی ایک صحابی سے بھی یہ ثابت نہیں ہے حضرت ابن عباس کی اس روایت کے مطابق فتویٰ دیا ہو بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ سے اس کے خلاف فتویٰ صادر کرنا ثابت ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے اگر صحیح مان بھی لی جائے تو اس کا مفہوم کچھ اور لینا ہو گا، مثلاً کسی نے مختلف الفاظ سے طلاق دیا تو وہ ایک ہی سمجھا جائے گا۔ آگے راقم الحروف کا مضمون ملاحظہ کیا جائے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابْ

جن مسائل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی کے بعد ان میں خلفائے راشدین نے تبدیلی کی، ان میں ایک طلاق ثلاثہ کا مسئلہ بھی ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں تین طلاقیں خواہ عدد کی تصریح کے ساتھ جیسے میں نے تین طلاق دی کہہ دے یا الفاظ کی تکرار کے ساتھ یعنی تین بار طلاق دی طلاق دی کہہ دے، تو عہد نبوی میں ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کردی، کہ ان کو ایک کے بجائے تین قرار دیا اور چونکہ اسی پر امت کا تعامل ہے، اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حکومت وقت یا مرکز ملت کو اسلامی مسائل میں ہر طرح کی تبدیلی کا حق حاصل ہے،

موجودہ دور میں جو لوگ اپنے کو اسلامی احکام میں تبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں، ان کی اصل ذہنیت تو یہی ہے کہ اسلامی مسائل میں ان کو ان کی خواہش کے مطابق کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرنے کا پورا حق حاصل ہے، چنانچہ خلفائے راشدین کی اولیات سے لے کر متاخرین علما کی کسی اجتہادی رائے میں اگر تبدیلی احکام کی کوئی صورت بھی نظر آجاتی ہے، تو اسے وہ اپنے لئے دلیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اسلامی قانون کے تاریخی تسلسل سے ان کا رشتہ منقطع بھی نہ ہونے پائے، اور ان کی رائے وزنی بھی معلوم ہو، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، جب کوئی صالح تبدیلی ان کی کسی خواہش کے خلاف پڑتی ہے، تو وہ اتباع سنت کا وعظ کہنے لگتے ہیں، اور پوری امت کے تعامل کو بدعت قرار دیتے ہیں چنانچہ پاکستانی حکومت نے جو عائلی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے متعدد مسائل میں تو پہلی صورت اختیار کی، یعنی خلفائے راشدین کے مقابل میں بعد کے کسی فقیہ یا موجودہ دور کے کسی مفکر کے اجتہاد کو ترجیح دی، مگر طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں اس نے اتباع سنت کا لبادہ اوڑھ لیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کتاب وسنت کے اتباع کے پیش نظر ہم حضرت عمرؓ کی تبدیلی کو تسلیم نہیں کرسکتے اور ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا چاہئے۔

ہمیں اس وقت کمیشن کی رپورٹ پر کچھ لکھنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا مقصود ہے، کہ اس وقت مسلمانوں کا حکمراں طبقہ خواہ کسی اسلامی ملک کا ہو، الا ماشاء اللہ وہ کسی وجہ سے اسلام سے اپنا تعلق منقطع تو نہیں کرنا چاہتا مگر چونکہ اس کی تعلیم و تربیت خالص مغربی طرز پر ہوتی ہے، اس لئے اس کے سوچنے کا انداز خالص مغربی ہوتا ہے وہ یہ جرأت تو نہیں رکھتا، کہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں خواہ وہ معاشرت سے متعلق ہو، یا معیشت وسیاست سے، مغربی قانون کو کھلم کھلا ترجیح دے سکے[1]، بلکہ وعظ و پند کی حد تک وہ اسلامی قانون کی فضیلت ماننے اور اس کے سامنے عقیدت کے پھول نذر کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، مگر اس کے آگے وہ کوئی عملی قدم بڑھانا نہیں چاہتا، جہاں اسے دونوں میں

---

[1] بعثت پارٹی کے افراد اور ان کے ہم نوا، اس وقت کھلم کھلا اسلام کے قانون کو فرسودہ قرار دے چکے ہیں۔

کہیں ٹکراؤ ہوتا نظر نہیں آتا، وہاں وہ کتاب و سنت کا کھلا متبع نظر آتا ہے، اور جہاں کوئی ٹکراؤ نظر آتا یا اس کی خواہش اور منفعت پر کوئی ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دی، یا اس کو اس خیال نے ستایا کہ دنیا میں ہم رجعت پسند مشہور ہو جائیں گے، تو خلافت راشدہ کے تعامل یا ادیات[1] کو اور اس سے بھی نیچے اتر کر کسی ایک شخص کی رائے کو اپنے استدلال کی بنیاد بنا کر کتاب و سنت کے کھلے ہوئے احکام اور پوری امت کے تعامل کو نظر انداز کرنے میں ذرہ بھی وہ تامل نہیں کرتا، چنانچہ ایسے لوگ کبھی حضرت عمرؓ کی اولیات کو بہانے بناتے ہیں، کبھی شرح وقایہ کے کسی جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں، کبھی علامہ شبلیؒ اور ڈاکٹر اقبال کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں اور ان کی رائے یا قرآن و سنت کے سلسلہ میں ان کی تشریحات (جن کا مفہوم وہ خود گڑھتے ہیں) کے مقابلہ میں پوری امت کے تعامل اور اس کی تشریحات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، چنانچہ طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں بھی ان کا رویہ یہی ہے، تفویض طلاق کے سلسلہ میں انھوں نے شرح وقایہ کے ایک جزئیہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنائی، مگر طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں حضور کے واضح ارشادات، صحابہ کے تامل اور ائمہ اربعہ کے اجماع سب کو نظر انداز کر کے امت کے دو چار علماء کی رائے کو انھوں نے ترجیح دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہی کو ترجیح کے لئے کافی تھا۔

بہر نوع جو لوگ یہ کہتے ہیں، کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں، ان کا استدلال دو روایتوں پر ہے۔

پہلی روایت | پہلی روایت حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے، کہ رکانہ کے والد عبد یزید نے اپنی عورت ام رکانہ کو طلاق دیدی، اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی، مگر دوسری بیوی سے نباہ نہ ہو سکا، یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، آپ نے عبد یزید سے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی کو واپس بلا لو، انھوں نے کہا کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم ہے، تم رجوع کر لو[2]۔

دوسری روایت میں ابو رکانہ کے بجائے خود رکانہ کا واقعہ بیان ہوا ہے، اور اس میں لفظ ثلاثہ (تین) کے بجائے البتہ (قطعی) کا لفظ ہے، بحث آگے آتی ہے۔

دوسری روایت | دوسری روایت طاؤس سے مروی ہے، کہ ایک شخص ابو صہبا حضرت ابن عباسؓ سے

---

[1] گو خلفائے راشدین کے تعامل یا ان کی اولیات سے ان کا استدلال صحیح نہیں ہوتا، مگر وہ اس کی آڑ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

[2] یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے، اگرچہ یہ روایت دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی، علامہ خطابی نے لکھا ہے، "فی اسناد ھذا الحدیث مقال لان ابن جریج انما رواہ عن بعض بنی ابی رافع ولم یسمہ والمجہول لا یقوم بہ الحجۃ" (ج ۳ ص ۲۳۰) اس روایت کی سند میں کلام کیا گیا ہے اسلئے کہ ابن جریج نے ابو رافع کے خاندان کے بعض افراد سے روایت کی ہے جس کا نام نہیں لیا ہے اس لئے یہ روایت قابل صحت نہیں ہے۔

بہت سوال کرتا تھا، اس نے ایک بار ابن عباس سے کہا کہ آپ کو تو اس کا علم ہوگا، کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائے عہد فاروقی میں تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں، آپ نے کہا ہاں ایسا ضرور تھا، مگر جب حضرت عمر نے دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں، جس میں ان کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے تھا، تو انھوں نے حکم دیا۔

اجیزوھن علیھم ان پر تین طلاقیں نافذ کردی جائیں۔

ان روایات کی صحت و عدم صحت اور ان کے مفہوم کے تعین پر محدثین نے جو بحثیں کی ہیں، ان کو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ نفس مسئلہ کو قرآن، سنت اور آثار صحابہ اور امت کے عام تعامل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

پہلی اور دوسری ہجری تک جب کہ ابھی طلاق اور رجعت کے احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوتے تھے، تو اس میں لوگ بڑی بے اعتدالی سے کام لینے لگے تھے، ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دیدیا تھا، اور پھر جب عورت اس سے علیحدہ ہوکر کسی اور سے اپنا نکاح کرنا چاہتی تھی، تو مرد رجوع کرلیا کرتا تھا، اور اس طرح زندگی میں کتنی ہی طلاق دیتا اور رجوع کرلیتا[2]، اس کو غصہ آیا، اس نے طلاق دیدی، غصہ فرو ہوا، رجوع کرلیا، چونکہ عورتوں کے لئے یہ صورت انتہائی تکلیف دہ تھی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اس طرح کے معاملے پیش ہوتے تھے، تو آپ اس کے جواب میں ہمیشہ توقف فرمایا کرتے تھے، اس لئے کہ قرآن میں ابھی صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ جب "الطلاق مرتان" کی آیت نازل ہوئی، تو آپ نے حکم دیدیا کہ ایک مرد زیادہ سے زیادہ تین طلاق دے سکتا ہے، حضرت عائشہ کی زبان سے اس حکم کے نزول کی تفصیل سنیے، حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ

> "طلاق کا حکم نازل ہونے سے پہلے ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دیدیتا تھا اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلیتا تھا، یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھ کو علیحدہ کرونگا، اور نہ تجھ کو اپنے قریب ہی آنے دونگا، ایسا ہی کرتا رہوں گا، یہ حضرت عائشہ کی خدمت میں آئی، اور اس نے اپنی تکلیف بیان کی، حضرت عائشہ نے اس کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ اسے سن کر خاموش ہوگئے، اور اس وقت کوئی جواب نہیں دیا، اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی،

---

[1] اس روایت کے الفاظ میں بڑا اختلاف ہے بحث آگے آئے گی، ابوداؤد اور مسلم وغیرہ میں یہ روایت ان ہی الفاظ میں مروی ہے،

[2] جاہلیت میں اس پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے وہ عادتیں اب تک جاری تھیں،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ — طلاق دو بار ہے، اس کے بعد یا تو بھلائی سے
اَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ[1] — روک لینا چاہئے، یا پھر خوش اسلوبی سے چھوڑ دینا ہے

اس کے بعد طلاق دینا اور رجوع کرنا کھیل نہیں رہا، بلکہ اب ایک آدمی ایک بار یا دو بار طلاق دے کر عدت کے بعد تجدید نکاح کرکے اس سے رجوع کرسکتا ہے، تیسری بار طلاق دینے کے بعد بیوی کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، آپ نے لوگوں کی پچھلی ذہنیت کو بدلنے کے لئے بار بار اس سلسلہ میں یہ ہدایت فرمائی کہ لوگ طلاق کو کھیل اور مذاق نہ بنائیں، بلکہ اس اجازت سے انتہائی مجبوری کی حالت میں فائدہ اٹھائیں، آپ نے بار بار فرمایا،

اَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ الطَّلَاقُ — حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز خدا کے یہاں طلاق ہے۔

آپ نے نکاح و طلاق کے بارے میں کبھی مذاق اور ہنسی کی بھی اجازت نہیں دی یعنی اگر کوئی شخص مذاق سے بھی طلاق دیدے، تو وہ مذاق بھی سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا، آپ نے فرمایا،

ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ[2] — تین چیزوں کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے، نکاح، طلاق اور رجعت۔

آپ نے اس بارے میں یہ بھی تاکید فرمائی، کہ اگر کسی کو طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے، تو حالت حیض میں طلاق نہ دیجائے، بلکہ طہر یعنی پاکی کی حالت میں دی جائے، اور ایک ساتھ نہ دیجائے، بلکہ ایک طلاق دے کر طلاق دینے والا ایک ماہ کا انتظار کرے، اگر اس درمیان میں اس کے تعلقات درست ہوگئے، تو رجوع کرلے، ورنہ پھر دوسرے مہینے طلاق دے، اس طرح اس کو اچھی طرح غور کرنے اور نادم ہونے کا موقع ملے گا، لیکن اگر اس نے طلاق کے لفظ کا بیجا استعمال کیا، یعنی اس نے حالت حیض میں طلاق دیدی، یا ایک وقت میں تینوں طلاقیں دے ڈالیں تو گو اس طرح طلاق دینا کتاب و سنت کی وضاحت کے خلاف ہے، مگر اس غلطی کی وجہ سے آدمی کو اس کے بنیادی حق سے تو محروم نہیں کیا جاسکتا تھا، البتہ اس کو اس بات کی سزا دیجا سکتی ہے کہ اس نے غور و فکر اور ندامت کے موقع کو ضائع کردیا، یہی بات ہے جسے آپ نے اور صحابۂ کرام نے اس طرح طلاق دینے والوں سے ہمیشہ فرمائی، مقصد

---

[1] یہ روایت امام بیہقی نے سنن میں نقل کی ہے اس روایت کو مرسلاً امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں درج کیا ہے،

[2] یہ روایت ائمۂ صحاح بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے،

یہ ہے کہ طلاق کے معاملہ کو ہر صورت میں سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا، اس لئے جب اس نے تین طلاق اپنی زبان سے دی، تو اس کو نافذ ہی کیا جائے گا لیکن چونکہ اپنے حق کے استعمال میں اس نے غلطی کی ہے، اس لئے اس کو اس کے گناہ گار بھی قرار دیا جائے گا، اور سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کرتے تھے[1]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی اس طرح کے معاملات پیش آئے، آپ نے ایک طرف تین طلاقیں نافذ کر دیں، اور دوسری طرف اس کو گنہگار اور غلط کار بھی فرمایا۔

حضرت محمود ابن لبیدؓ سے مروی ہے، کہ ایک شخص کے بارے میں آپ کو اطلاع ملی، کہ اس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں ایک ساتھ دے دی ہیں، تو آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کہ میری موجودگی میں کتاب اللہ سے کھیل کیا جا رہا ہے[2]،

اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ آپ نے ان طلاقوں کو نافذ کیا یا نہیں، مگر اس روایت کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں، کہ آپ نے اس کو ضرور نافذ فرمایا، جس کی تائید دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے، ابوبکر ابن عربی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

ولم یردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل امضاہ — آپ نے اسے رد نہیں کیا یعنی رجوع کا حکم نہیں دیا بلکہ تینوں کو نافذ کیا۔

حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی، اور پھر خود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا

ما ھکذا امرک اللہ اخطات السنۃ — خدا نے تمہیں اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا تم نے سنت کے خلاف کیا

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ رجوع کرو، اور پھر طلاق دینا ہو تو دوسرے طہر میں طلاق دینا، ابن عمرؓ نے آپ سے پھر دریافت کیا کہ اگر میں نے ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہوتیں تو کیا اس کے بعد بھی میں رجوع کر سکتا تھا، آپ نے فرمایا۔

کانت تبین ذالک وکانت معصیۃ[3] — تم رجوع نہیں کر سکتے تھے، اس کے بعد وہ تم سے بالکل جدا ہو جاتی، اور تمہارے اوپر گناہ بھی ہوتا،

جس طرح ایک ساتھ تین طلاق دینا مناسب نہیں ہے، اسی طرح حیض کی حالت میں طلاق دینا بھی منع ہے

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۳۰۱ موجودہ دور کی کسی بھی اسلامی ملک کی حکومت کو یہ حق آج بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی سزا مقرر کرے [2] نسائی کتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعۃ وما فیہ من التغلیظ اس روایت کی صحت میں کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ طریقہ قرآن کے منشا کے خلاف ہے [3] طبرانی، بیہقی وغیرہ نے اس روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، مگر اس روایت کے ابتدائی حصہ کو دوسرے ائمہ حدیث بخاری، ابو داؤد، ترمذی وغیرہ نے نقل نہیں کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوپر گذر چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا، کہ خدا نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے۔ آپ کا ارشاد قرآن کی آیت

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو پاکی کی حالت میں دو۔[1]

جس طرح پہلے شخص کے بارے میں آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا، اسی طرح اس کو بھی غلط کار کہا، اور غصہ کا اظہار فرمایا،[2] اس کے باوجود آپ نے اس طلاق کو رد نہیں فرمایا، اس پر بعض لوگوں کو تعجب ہوا، اور انھوں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا، کہ آپ اس طلاق کو طلاق سمجھتے ہیں، انھوں نے کہا خاموش رہو، میری غلطی اور حماقت کی وجہ سے کیا یہ طلاق شمار نہ کیجائیگی۔[3]

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ اگر طلاق صحیح طریقہ پر نہ بھی دی جائے تو وہ طلاق پڑ جاتی ہے، البتہ اس غلطی کی وجہ سے اس فعل کو معصیت کہا جائے گا، پھر اس روایت کے آخری الفاظ پر غور کیا جائے، تو اس سے پہلی روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے، یعنی ابن عمر کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس حالت میں تین طلاقیں دیدیتے تو تمہاری بی بی تم سے علیحدہ بھی کر دی جاتی، اور تم گنہگار بھی ہوتے، یعنی یکبارگی تین طلاق دینے کے بعد بیوی علیحدہ تو ہو جائے گی، مگر چونکہ یہ طریقہ غلط ہے، اس لئے آپ نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا، اس کو خلاف سنت کیا، اور معصیت بتایا، تاکہ لوگ آئندہ اپنے حق کا استعمال صحیح طور پر کریں۔

تیسری روایت اور ملاحظہ ہو، سہیل بن سعد سے روایت ہے، کہ ایک شخص عویمر کو اپنی بیوی پر شبہ ہوا، انھوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا، کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی غیر مرد کو دیکھے تو اس کو قتل کر دے یا کیا کرے، آپ نے فرمایا اس بارے میں خدا کا حکم نازل ہو چکا ہے۔ جاؤ اپنی بیوی کو لے کر آؤ، تو آپ نے ان دونوں کو لعان کا حکم دیا، انھوں نے لعان کیا،[4] اس کے بعد عویمر نے کہا کہ اب میں جھوٹا ٹھہروں گا۔ اگر اس کو بیوی بنائے رکھوں، چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق پہلے ہی تین طلاقیں دیدیں۔[5] اس روایت سے معلوم ہوا کہ عویمر نے آپ کی موجودگی میں تین طلاقیں دیں اور آپ نے ان کو نافذ کر دیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے، کہ لعان میں تفریق حاکم کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہ فرض آپ نے خود انجام دیا، مگر یہ تفریق لعان کی بنا پر نہیں بلکہ تین طلاق کی بنا پر آپ نے کی۔

---

[1] تفصیل تیسیر طبری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [2] دار قطنی میں ہے، فتغیظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [3] بخاری کتاب الطلاق

[4] بخاری کتاب الطلاق، اصل میں الفاظ فان عجز لاتحق آئے ہیں، اس کے دو معنے بیان کئے گئے ہیں، ایک تو اوپر بیان کیا گیا ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے علاوہ بھی کوئی چارہ کار ہے اس وقت یہ جملہ انکاریہ ہوگا (فتح الباری)[5] لعان کا طریقہ سورہ نور میں مذکور ہے [6] ابوداؤد اور نسائی میں انہی الفاظ کے ساتھ یہ روایت آئی ہے امام احمد کی مسند میں کذبت کے بجائے ظلمت کا لفظ ہے، اور تین طلاق کے بجائے تین بار لفظ طلاق دہرایا۔

اس سلسلہ میں ایک روایت اور ملاحظہ ہو، عبادہ بن صامت سے مروی ہے، کہ ان کے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا، محض تین طلاقوں کا ان کو حق تھا، البتہ ۹۹۷ طلاقیں ظلم و زیادتی ہیں، خدا چاہے گا تو معاف کر دے، اور اگر چاہے گا، تو عذاب دے گا۔

* اس روایت پر شوکانی نے یہ اعتراض کیا ہے، کہ اس میں ان کے باپ دادا کے طلاق کا ذکر ہے، اور ان میں سے کسی نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، اس لئے ان کے بارے میں سوال کے کیا معنی، مگر یہی روایت عبادہ بن صامت سے دار قطنی اور مجمع الزوائد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے کہ میرے بعض بزرگوں میں سے کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی، اور ان کے لڑکوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا

بانت منہ بثلاث علی غیر السنۃ — تین طلاق سے عورت اس سے جدا ہو گئی، اگرچہ یہ سنت کے خلاف ہے،

گو دونوں روایتوں پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن اور بہت کی احادیث کی روشنی میں اس کو دیکھا جائے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور روایت حضرت حسن سے مروی ہے، انھوں نے بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، بیوی کو اس کا بڑا رنج ہوا، اس کی اطلاع ان کو ہوئی تو ان کو بھی رنج ہوا۔ اور انھوں نے کہا کہ اگر میں نے قطعی طلاق نہ دے دی ہوتی، تو رجعت کر لیتا، مگر اب مجبوری ہے، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تین طلاقیں طہر میں دے یا تین مہینے میں دے، یا ایک ساتھ تین طلاقیں دے، تو وہ عورت حرام ہو جاتی ہے، اب بغیر نکاح ثانی وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی[1]،

اسی طرح حفص بن عمرو اور عبد الرحمن بن عوف کے بارے میں بھی مذکور ہے، کہ ان لوگوں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی، مگر آپ نے اسے ایک نہیں قرار دیا[2]،

---

[1] یہ روایت دار قطنی میں دو سلسلوں سے مروی ہے دونوں میں ایک ایک راوی کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے، اور ان پر شیعیت کا الزام لگایا ہے، مگر اس کے باوجود ابن معین اور ابوداؤد نے ایک کی روایت کو قبول کیا ہے، اس لئے یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود اپنے متن کے اعتبار سے رد کر دینے کے قابل نہیں ہے۔

[2] یہ دونوں روایتیں دار قطنی میں ہیں، ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے، البتہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ حفص بن عمرو نے تین طلاقیں جدا جدا دی تھیں، اور ابن عوف نے "البتہ" کا لفظ استعمال کیا، یعنی قطعی طلاق یا بالکل طلاق کا لفظ استعمال کیا

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیض میں یا ایک مجلس میں یا ایک طہر میں دی گئی تین طلاقوں کے بارے میں ہمیشہ آپ نے میاں بیوی کے درمیان جدائی کا فیصلہ فرمایا،

ان ارشادات نبوی کے بعد اب ممتاز صحابہ کے آثار و فتاوی پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے،

مدینہ میں ایک پر مذاق آدمی تھا، اس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے ڈالیں، یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا، تو اس نے کہا کہ میں نے مذاقاً یہ طلاقیں دی ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنا کوڑا اسنبھالا اور کہا کہ تمہارے لئے تین طلاقیں کافی ہیں[1]،

حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ ان کے سامنے ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی ہے، آپ نے فرمایا،

بانت منك بثلاث — تین ہی سے تمہاری عورت تم سے جدا ہو گئی۔

حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک ایسا ہی شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دیدی ہے، انھوں نے کہا کہ تین ہی طلاق نے تمہارے اوپر بیوی کو حرام کر دیا، بقیہ طلاقوں کو دوسری بیویوں میں تقسیم کر دو[2]،

حضرت علیؓ کے اس فتوے کے بارے میں ممتاز تابعی اعمش بیان کرتے ہیں، کہ کوفہ میں ایک شیخ سے میں نے سنا کہ وہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بیان کر رہے تھے، کہ میں نے ان سے سنا ہے کہ جو ایک مجلس میں تین طلاق دے، وہ ایک شمار ہو گی، کوفہ میں یہ نیا فتوی تھا، اس لئے لوگ جوق در جوق یہ روایت سننے کے لئے ان کے پاس آنے لگے میں بھی ایک دن ان کے پاس پہنچا، اور ان سے کہا کہ آپ نے کس طرح سنا ہے، کہ حضرت علیؓ ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی سمجھتے تھے، انھوں نے وہ روایت بیان کی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ روایت کیسے پہنچی ہے، انھوں نے کہا کہ میرے پاس یہ روایت لکھی ہوئی موجود ہے، چنانچہ انھوں نے وہ تحریر پیش کی، امام اعمش کہتے ہیں کہ میں نے اس کو پڑھا، تو اس میں یہ تحریر تھا۔

هذا ما سمعت علی بن ابی طالب رضی الله عنه يقول اذا طلق امرأة ثلاثاً فی مجلس واحد فقد بانت ولا تحل له حتی تنكح زوجاً غيره[3]	یہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دیدے تو وہ عورت بائن ہو گی، اور جب تک وہ حلالہ نہ کرے اس وقت تک وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔

---

[1] سنن بیہقی جلد ۷ ص ۳۳۴، ابن حزم جن کا مسلک اس کے خلاف ہے، انھوں نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ [2] بیہقی جلد ۷ ص ۳۳۵۔ [3] سنن بیہقی ج ۷، ص ۳۳۹، ۳۴۰

امام اعمش کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ افسوس ہے یہ تو بالکل اس کے خلاف ہے، جو آپ بیان کر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ تو یہی ہے جو اس میں لکھا ہے، مگر مجھے کچھ لوگوں نے یہ روایت اس طرح بیان کرنے پر آمادہ کیا ہے[۱] حضرت علیؓ کے فتاوے عام طور پر کوفہ میں معروف و مشہور تھے، اس لئے لوگوں کو تعجب ہوا، اور لوگ جوق در جوق یہ نئی روایت سننے کے لئے آنے لگے۔ امام اعمش نے ان لوگوں کا نام تو نہیں بتایا، کہ کن لوگوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا تھا، قیاس یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالفین نے ایسا کرایا ہوگا،

حضرت ابن مسعود کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا کہ میں نے گذشتہ رات اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دیدی ہیں آپ نے پوچھا کہ یکبارگی، اس نے کہا ہاں، آپ نے پھر اس سے سوال کیا کہ تم اس کو اپنے سے جدا بھی کرنا چاہتے ہو اس نے کہا ہاں، آپ نے کہا کہ تمہارا جو ارادہ ہے، وہ پورا ہوگیا، یعنی تمہاری عورت تم پر حرام ہوگئی، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ خدا نے طلاق کے لئے واضح حکم دے دیا ہے تو جو لوگ اپنے اوپر بوجھ لادنا ہی چاہتے ہیں، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان کا بوجھ ہلکا کرتے پھریں، تم لوگ جیسا کچھ کہوگے، ایسا ہی حکم لگایا جائے گا۔[۲]

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے معاذ! جو شخص غیر مسنون طریقہ پر ہو یا تین طلاق دیدے۔ ہم اس کی اس بدعت کو نافذ کردیں گے،[۳]

حضرت ابن عمر کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے پوچھا، کہ اگر میں حیض کی حالت میں تین طلاق دے دیتا تو وہ پڑجاتیں، آپ نے فرمایا" تین طلاق بھی پڑجاتی اور تم گنہ گار بھی ہوتے، اب انکا فتویٰ بھی سنیے۔

نافع بیان کرتے تھے، کہ حضرت ابن عمر اس شخص کے بارے میں جو ایک ساتھ تین طلاق دیدے یہ کہا کرتے تھے، کہ

بانت منہ امرأتہ وعصی بہ تعالیٰ — اس کی عورت تو اس سے جدا ہی ہوگئی اس نے،
وخالف السنۃ[۴] — یہ طریقہ اختیار کرکے خدا کی معصیت اور سنت نبوی کی بھی مخالفت کی۔

حضرت ابن عمر کو آنحضرتؐ نے رجعت کا جو حکم دیا تھا، اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی، کہ جتنی طلاق بھی غلط طریقہ پر دیجائے گی، اس کے بعد بھی رجعت کی جاسکتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں یکبارگی تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا تم نے اپنی بیوی کو جدا کردیا، اس نے کہا کہ

---

[۱] اس روایت پر کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے مگر اس میں دونوں پہلوؤں کا امکان ہے یعنی حضرت علیؓ کی مخالفت کے ساتھ امام اعمش کو مطعون کرنا بھی مقصود ہے، [۲] بیہقی ج ۷، ص ۳۳۵ [۳] دار قطنی ص ۴۳۳، کتاب الطلاق میں اس روایت کے ایک راوی اسماعیل بن امیہ کو محدثین نے ضعیف کہا ہے، مگر دوسری روایات کی متابعت کی وجہ سے اس کا ضعف دور ہوجاتا ہے [۴] دار قطنی

اسی طرح ابن عمرؓ نے بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، مگر آنحضرتؐ نے ان کو رجعت کا حکم دیا، آپ نے فرمایا ہاں انھوں نے رجعت کی گنجائش رکھی تھی، اس لئے آپ نے ایسا حکم دیا تھا، مگر تم نے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے[1]

اسی طرح حضرت عائشہ اور حضرت ابوہریرہ اور حضرت زبیر سب نے متفقہ طور پر مدخول بہا کے بارے میں یہ فیصلہ کیا، کہ اس کو تینوں طلاقیں پڑ جائیں گی، بیہقی اور مؤطا امام مالک میں ان کے فتاوے موجود ہیں، گو یہ فتوے غیر مدخول بہا کے بارے میں ہیں، اور یہاں بحث مدخول بہا کی ہے، مگر اس سے یہ تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے، کہ یکبارگی تین طلاقیں نافذ کردینے کا فتویٰ ان بزرگوں نے دیا ہے،

اسی طرح عمران بن حصین اور حضرت انس اور زید بن ثابت سے بھی ثابت ہے، کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو انھوں نے تین ہی قرار دیا ہے[2]، عمران بن حصین کے فتوے کے الفاظ بیہقی میں یہ ہیں۔

اثم بربہ وحرمت علیہ امرأتہ ـــــ اس نے خدا کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی۔

جس کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا تھا، وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس پہنچا، اور اس نے ان سے کہا کہ ابن حصین تو یہ فتویٰ دیتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے، ابوموسیٰ نے کہا خدا ابن حصین جیسا آدمی کثرت سے پیدا کرے۔

اب اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ (جن کی روایت پر دوسرے لوگوں کے استدلال کی بنیاد ہے) کے ان اقوال اور فتاوے کو دیکھیے، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے تھے۔

مجاہد سے روایت ہے کہ میں ابن عباس کی خدمت میں موجود تھا، کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، یہ سن کر وہ کچھ خاموش رہے، ان کی خاموشی سے مجھے گمان ہوا کہ وہ اس طلاق کو رجعی قرار دیں گے، مگر انھوں نے فرمایا کہ لوگ حماقت کر بیٹھتے ہیں، پھر یہاں آکر اے ابن عباس! اے ابن عباس! پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو اس سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لئے راہ پیدا کر دیتا ہے، تم اس سے ڈرتے نہیں، اس لئے میں تمہارے لئے کوئی راہ نہیں پا رہا ہوں، تم نے خدا کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہو گئی۔

ابوداؤد نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجاہد سے یہ روایت دوسرے سلسلۂ سند سے بھی ثابت ہے، ان کے متعدد شاگردوں کا نام لیا ہے جنھوں نے ان سے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی نافذ کرنے کے فیصلہ کو نقل کیا ہے، مثلاً عکرمہ، سعید بن جبیر، عطا، مالک بن حارث، عمرو بن دینار اس کے بعد لکھا ہے کہ

---

[1] بیہقی ج، ص ۳۳۳ [2] ابن حصین کی روایت بیہقی نے ج، ص ۳۳۲ میں نقل کی ہے، اور حضرت انس کی روایت معانی الآثار میں ہے، ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس کو نقل کیا ہے زید بن ثابت کے بارے میں بھی صاحب فتح القدیر نے نقل کیا ہے کہ وہ اس کے قائل تھے۔

كلهم قالوا في الطلاق الثلاث انه اجازها وقال وهانت منك
(ابوداؤد کتاب الطلاق)

ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا ہے کہ ابن عباس کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا، تو انھوں نے تینوں طلاقیں نافذ کیں، اور سائل کو جواب دیا کہ تمہاری بیوی تم سے الگ ہو گئی

دار قطنی اور بیہقی نے ان میں سے ہر ایک کی روایت کو الگ الگ نقل کر دیا ہے بیہقی کہتے ہیں، کہ حضرت ابن عباس کے دس جلیل القدر شاگرد یعنی ابن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، عکرمہ، عمرو بن دینار، مالک بن حارث، محمد بن ایاس، معاویہ ابن عیاش، ان تمام لوگوں نے ان سے روایت کی ہے کہ

انه اجاز الطلاق الثلاث وامضاهن

ابن عباس ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو جائز رکھا اور نافذ کیا۔

امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے کہ ابن عباس سے ایک شخص نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دی ہیں، انھوں نے کہا تین ہی سے تمہاری بیوی مطلقہ ہو گئی، بقیہ ۹۷ طلاقوں کے ذریعہ تم نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ استہزا کیا ہے[1]، جو تمہارے لئے قیامت میں

حضرت ابن عباس کے شاگرد مالک بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص ابن عباس کے پاس آیا، اور اس نے کہا کہ میرے چچا نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیدی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ تمہارے چچا نے خدا کی نافرمانی کی، اس لئے خدا نے اسے شرمندہ کیا اور اس کے لئے راہ نہیں پیدا کی[2]۔

عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ابن عباس سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس نے آسمان کے تاروں کے بقدر طلاق دے دی تھی، انھوں نے وہی جواب دیا، جو اوپر دے چکے ہیں۔

حضرت ابن عباس کے شاگردوں میں صرف ایک شاگرد طاؤس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین طلاق کو ایک سمجھتے تھے، اور ابن عباس سے بھی روایت کرتے تھے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، مگر طاؤس کے بارے میں علی ابن المدینی امام جرح و تعدیل نے معمر اور ابن طاؤس کے واسطے سے نقل کیا ہے، کہ ابن طاؤس کہتے تھے کہ

"جو شخص یہ بیان کرے کہ طاؤس ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو ایک سمجھتے تھے وہ جھوٹا ہے[3]"

---

[1] دار قطنی نے بھی اس روایت کو الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے آخری جلد دار قطنی ہی کا ہے

[2] یہ روایت ابن ترکمانی نے الجواہر النقی میں مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے [3] علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ یہ روایت حسین بن علی نے القضا میں نقل کیا ہے انیز اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۲۰۵ میں بھی درج ہے۔

اوپر بعض صحابہ کے فتاوے نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک صاحب افتاء فقیہ سمجھا جاتا ہے، اور ان ہی کے فتاوے پر پہلی جماعت صحابہ اور اس کے بعد پوری امت کا تعامل ہے، اور اسلامی فقہ کی بنیاد کتاب وسنت کے نصوص کے بعد ان ہی فتاوے واجتہادات پر ہے،

اب اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ کے فتاوی اور جمہوریت کی رائیں ملاحظہ ہوں،

اوپر متعدد تابعین کی روایتیں گذر چکی ہیں، جنہوں نے اس بارے میں عام صحابہ کے فتوے نقل کئے ہیں، ظاہر ہے وہی رائے ان کی بھی تھی، جو انھوں نے اپنے استاذ صحابی سے نقل کی ہے۔

امام محمد آثار میں نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی اس شخص کے بارے میں جو ایک طلاق دے، اور نیت تین کی کرے یا تین دے اور نیت ایک کی کرے، فرماتے تھے کہ اگر اپنی زبان سے ایک کہا ہے، تو ایک طلاق سمجھی جائے گی، اور اگر تین کہا ہے تو تین شمار ہوگی، اور یہاں نیت کا کوئی سوال نہیں ہے،

قیس بن ابی عاصم جو خود تابعی ہیں، وہ ممتاز صحابی مغیرہ ابن شعبہ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے میری موجودگی میں ان سے پوچھا کہ ایک شخص نے سو طلاقیں دے دی ہیں، اس کے بارے میں کیا خیال ہے، بولے تین ہی طلاق نے اس کی بیوی اس پر حرام کردی، اور بقیہ ۹۷ بیکار ہوئیں[1]

اسی طرح وہ نافع، محمد بن سیرین، مسروق کے بارے میں صراحت ہے کہ وہ یہی فتوی دیتے تھے، ابن رجب جنہوں نے اس مسئلہ پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، وہ صحابہ وتابعین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم في الفتاوى في الحلال والحرام شيء صريح في ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يحسب واحدة اذا سيق۔

جن صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف کے فتاوے حلال وحرام کے سلسلہ میں معتبر سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے ایک شخص سے بھی صراحۃً یہ ثابت نہیں ہے کہ مدخول بہا عورت کو یکبارگی، کوئی تین طلاق دیدے تو اس کو انھوں نے ایک شمار کیا ہو،

شیخ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں،

"مجتہدین صحابہ کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے، ان کے علاوہ بہت تھوڑے ہیں اور تمام صحابہ انھی کے فتاوے پر عمل کرتے تھے، اور انہی سے فتوے لیتے تھے مثلاً خلفائے اربعہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ

---

[1] اعلام، سنن ج ۷ ص ۳۳۵ بحوالہ بیہقی۔

عمرو بن العاص، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، عائشہ، انس بن مالک، ابو ہریرہ وغیرہ، ان میں سے اکثر کے فتاوے ہم نے نقل کر دیئے ہیں، کہ وہ نہایت واضح طور پر ایک مجلس کی تین طلاقوں کو نافذ کرتے تھے، اور صحابہ میں ان کا ایک بھی مخالف نظر نہیں آتا[1]۔

اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے اگر عدد کی تصریح کے ساتھ اس نے تین طلاقیں دی ہیں، تو عورت خواہ مدخولہ یا غیر مدخولہ اس کو تین طلاقیں پڑ جائیں گی، البتہ اگر محض لفظ طلاق کی تکرار کی ہے، تو اس میں ائمہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔

ابن ہبیرہ لکھتے ہیں:

واتفقو (الائمة الاربعة) على ان الطلاق	ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر تین طلاق
الثلاث بكلمة واحدة او بكلمات فى حالة	عدد کی تصریح کے ساتھ یا ایک ہی حالت میں یا ایک
واحدة او فى طهر واحد يقع ولم يختلفوا فى ذالك	طہر میں تین طلاقیں دی جائیں، تو پڑ جائیں گی اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے

البتہ اس بارے میں ائمہ کی رائیں مختلف ہیں کہ طلاق، طلاق سنت کہی جائے یا طلاق بدعت، امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور امام شافعی اور امام احمد اسے بھی طلاق سنت کہتے ہیں، جو ائمہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، ان کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے، جس میں آپ نے اس کو خلاف سنت اور معصیت قرار دیا ہے، اور پھر یہ چیز بھی ان کے پیش نظر ہے کہ اس کے نفاذ سے طلاق کا وہ اصل طریقہ لوگوں کے ذہن سے محو نہ ہونے پائے جس کی صراحت کتاب و سنت میں ہے،

اور جو ائمہ اس کو سنت قرار دیتے ہیں، ان کے پیش نظر غالباً یہ بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نافذ کر دیا، تو اس کو بھی سنت ہی کہنا چاہیئے، البتہ دونوں سنتوں میں فرق کیا جائے گا[2]۔

اسی طرح غیر مدخول بہا کے بارے میں ابن ہبیرہ لکھتے ہیں۔

واتفقوا على انه قال الزوج لغير المدخول	اس بارے میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ اگر شوہر
بها انت طالق ثلاثا طلقت	اپنی غیر مدخولہ بیوی سے یہ کہے کہ تجھ کو تین طلاق ہے
ثلاثا (الافصاح)	تو تینوں طلاق پڑ جائے گی۔

اگر اس نے اپنی غیر مدخول بہا بیوی کے سامنے محض تین طلاق کا لفظ دہرایا ہے، مثلاً یوں کہا کہ طلاق، طلاق، طلاق تو امام مالک یہ کہتے ہیں کہ اس میں اس کی نیت دریافت کی جائے گی، اگر تاکید مقصود تھی، تو ایک ورنہ تین طلاقیں

---

[1] فتح القدیر کتاب الطلاق، [2] الافصاح ص ۳۵۹، [3] امام شعرانی نے اس کا اختلاف دو حالات کے اختلاف پر محمول کیا ہے۔

پڑ جائیں گی اور ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ جس سے اس نے مباشرت نہیں کی ہے، وہ ایک ہی طلاق کے بعد بائن ہو جائے گی۔ اس کے بعد سے طلاق دینے کا اختیار باقی نہیں رہا،

غرض یہ ہے کہ اس بارے میں ان ائمہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک حالت میں دی گئی تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔

حافظ ابن قیم نے اثرم تلمیذ امام احمد کا قول نقل کیا ہے، کہ طلاق ثلاثہ کو ایک سمجھتے تھے، مگر حنبلی مسلک کی مشہور کتابیں خرقی، مقنع، محرر وغیرہ میں تصریح ہے، کہ اثرم نے امام احمد سے پوچھا کہ ابن عباس کی اس روایت کو آپ کس بنا پر چھوڑتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

براویۃ الناس عن ابن عباس انھا ثلاث	لوگوں کی کثرت سے روایتیں کہ ابن عباس تین طلاقوں کو تین سمجھتے تھے۔

قاضی ابو یعلیٰ حنبلی نے امام احمد کا وہ خط طبقات الحنابلہ میں نقل کیا ہے، جو انہوں نے مسدد بن مسرہد کو لکھا تھا اس میں ہے کہ

ومن طلق ثلاثا فی لفظ واحد فقد جھل وحرمت علیہ زوجتہ ولا تحل لہ ابدا حتی تنکح زوجا غیرہ ، (طبقات ۵۲۰)	جس نے ایک مجلس میں ایک لفظ کے ساتھ تین طلاقیں دیں (یعنی یہ کہا کہ میں نے تین طلاق دی) تو اس نے جاہلانہ کام کیا، اور اسکی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی یہاں تک کہ وہ حلالہ کرالے۔

اب ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے، مجتہدین صحابہ کے فتوے تابعین اور ائمۂ اربعہ کے مسالک اور جمہور امت کا ان پر تعامل ہے، دوسری طرف دو روایتیں ہیں، جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ طلاق ثلاثہ کا نفاذ تو حضرت عمر کی بدعت ہے ورنہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تو ایک مجلس میں ایک حالت میں دی گئی تین طلاقوں کو ہمیشہ ایک ہی کہا جاتا تھا۔

(باقی)

بقیہ :- اسلام کا فلسفۂ ہجرت

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ نیت کرے۔ پس جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہے اس کی ہجرت خدا اور رسول کے لئے ہے اور جس کی ہجرت دنیا کمانے کے لئے ہے یا کسی عورت کے ساتھ شادی رچانے کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔"

خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ

(۲)

مجیب اللہ ندوی

ساتویں صدی میں بھی بے شمار خواتین نے علم و فن اور خاص طور سے علم حدیث کی خدمت میں حصہ لیا، اور اس کو ترقی دی لیکن افسوس ہے کہ اس صدی کا کوئی ایسا تذکرہ موجود نہیں ہے، جس سے اس سلسلہ میں کوئی مدد لی جا سکے۔ عام تذکرہ اور تاریخ کی جو کتابیں موجود ہیں۔ ان میں اس صنف کی علمی خدمات کا تذکرہ بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر نوع ابھی کتابوں میں متفرق طور پر موضوع کے متعلق جو معلومات فراہم ہو گئے ہیں، وہ پیش کئے جاتے ہیں،

ام احمد زینب بنت مکی، ساتویں صدی کی مشہور محدثہ ہیں، انھوں نے علم حدیث کا حصول اس وقت کے تمام کبار علماء سے کیا تھا۔ خود ان سے ایک مخلوق نے استفادہ کیا ہے۔ یافعی اور ابن عماد ان کے بارے لکھتے ہیں۔

وازدحم علیھا الطلبة[1] — ان سے استفادہ کرنے کے لیے طلبان پر ٹوٹتے تھے۔

انھوں نے مسند احمد بن حنبل پر خاص طور سے طلبہ کے سامنے متعدد تقریریں کی تھیں[2]۔ علم و فضل کے ساتھ صاحب زہد و تقویٰ بھی تھیں۔

ام المؤید زینب بنت عبد الرحمٰن، ابو القاسم عبد الرحمٰن، شعری ساتویں صدی کے ایک ممتاز محدث بزرگ گذرے ہیں، ام المؤید انہی کی صاحبزادی تھیں، تمام علوم دینیہ میں انہیں دسترس تھی۔ اس وقت کے بعض علماء مثلاً ابوالمظفر، عبدالغافر بن اسماعیل، امام ابوالبرکات، اور مشہور مفسر زمخشری وغیرہ سے انھوں نے استفادہ اور روایت کی تھی، یافعی لکھتے ہیں،

کانت عالمة ادرکت جماعة من العلماء — عالمہ تھیں۔ علماء کی ایک جماعت سے انھوں نے

واخذت عنھم روایة واجاز — روایت اور اجازت کے ذریعے استفادہ کیا تھا،

شذرات الذھب میں ہے،

وانقطع بموتھا اسناد عال[3] — ان کی وفات سے اسناد عالی ختم ہو گئی۔

---

[1] مراۃ الجنان ج ص ۲۰۰ [2] ایضاً [3] شذرات الذہب ص ۴۳۔

تقریباً ایک سو برس زندہ رہیں، یعنی ۳۲۲ھ میں پیدا ہوئیں، اور ۴۲۱ھ میں وفات پائی، امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ حافظ جوزنی چوتھی صدی کے مشہور حافظ حدیث ہیں، ان سے یہ صرف دو واسطوں سے روایت کرتی ہیں[1]،

عفیفہ بنت احمد، یہ فارفانیہ اور اصبہانیہ کی نسبت[2] مشہور ہیں، علم حدیث سے ان کو خاص شغف تھا، چھٹی صدی کے مشہور محدث حافظ عبدالواحد جنہیں شیخ ابونعیم سے سماع حاصل تھا، ان سے عفیفہ اپنے زمانہ میں آخری راویہ تھیں۔ طبرانی کی معجم کبیر اور معجم صغیر انھوں نے فاطمہ جوزانیہ (جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) سے پڑھی تھی۔ ۹۰ برس کی عمر پائی، یعنی ۵۱۶ھ میں پیدا ہوئیں، اور ۶۰۶ھ میں وفات پائی[3]،

عائشہ بنت معمر، یہ بھی اصبہان کی رہنے والی تھیں، فاطمہ جوزانیہ کی مجلس درس میں شریک ہو چکی تھیں، اس زمانہ کے متعدد محدثین سے انھوں نے روایت کی ہے۔ ابن نقطہ جو ساتویں صدی کے ایک معروف محدث ہیں، عائشہ سے انھوں نے مسند ابویعلیٰ خاص طور سے پڑھی تھی، ان کو مسند ابویعلیٰ کا سماع سعید الصیرفی متوفی ۵۳۲ھ سے حاصل تھا، صیرفی مسند کی روایت میں خاص طور سے مشہور تھے۔ ۶۰۷ھ میں عائشہ کا انتقال ہوا۔ ۸۰ برس یا اس سے زیادہ عمر پائی[4]۔

کریمہ بنت عبدالوہاب، انھوں نے اپنے والد عبدالوہاب کے علاوہ بے شمار شیوخ سے سماع حدیث کیا تھا، کریمہ مشہور محدث ابوشامہ کے اولین شیوخ میں ہیں، ان کے علاوہ ان سے استفادہ اور روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، شذرات الذہب میں ہے۔ کہ انھوں نے کثرت سے روایت کی ہے[5]، امام ذہبی نے ان کو مسندۃ الشام لکھا ہے[6]۔ ۶۴۱ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی[7]۔

کریمہ کی ایک بہن صفیہ تھیں، یہ بھی اپنے وقت کی مشہور خواتین میں تھیں۔ ان کو اپنے والد سے تو سماع نہیں تھا لیکن دوسرے کبار محدثین سے سماع حاصل تھا، ابن عماد لکھتے ہیں:

تفردت فی زمانها   اپنے زمانہ میں منفرد تھیں، (ج ۵ ص ۲۲۳)

فاطمہ بنت الحافظ عماد الدین یہ حافظ عساکر کی پوتی تھیں۔ ان کے والد بھی حدیث کے مستند شیوخ میں تھے۔ اپنے والد کے علاوہ خاص طور سے ابن طبرزد سے استفادہ حدیث کیا تھا[8]

صفیہ بنت علی علی بن احمد واسطی کی صاحبزادی ہیں۔ ان کو شیخ موفق صاحب المغنی سے سماع حاصل تھا۔ ابن

---

[1] شذرات الذہب   [2] تذکرہ اور شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۱۲   [3] ایضاً ص ۲۲۱   [4] ص ۲۲۳   [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۲۶   [6] ایضاً ص ۲۵۱   [7] شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۱

ابن رجب ان کے شیوخ میں ہیں۔ ان کی ایک بہن تہذیب تھیں، جن کے متعلق حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ شیخ موفق کی بہت سی مرویات ہم تک انہی کے واسطے سے پہنچی ہیں۔ علم و فن کے علاوہ زہد و تقوی کے زیور سے بھی آراستہ تھیں۔ صفیہ کی وفات [illegible] اور زینب کی [illegible] میں ہوئی۔

امۃ الحق، یہ شام کے اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھیں جس میں علم و فضل کی پشت سے وراثۃً چلا آتا تھا، ان کو اپنے والد، اپنے دادا اور اپنے پردادا تینوں سے سماع حدیث حاصل تھا۔ ان کے علاوہ اس صدی کے دو مشہور شیوخ حدیث حنبل رصافی اور ابن طبرزد سے بھی استفادہ کیا تھا۔ ابن عماد نے لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں حدیث کے متعدد اجزاء کے سماع میں وہ منفرد تھیں۔ [illegible] میں اس دار فانی کو چھوڑا۔

عائشہ بنت عیسیٰ۔ یہ شیخ موفق صاحب المغنی کی جو اپنے وقت کے امام تھے۔ پوتی تھیں، امام ذہبی کے شیوخ میں ہیں، انھوں نے لکھا ہے، کہ شیخ موفق کی مرویات زیادہ تر ہم کو انہی کے ذریعہ پہنچی ہیں۔ ابن عماد ان کے علم و فضل کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"وہ نہایت پاکیزہ اور عبادت گذار اور صالحہ تھیں"[1]

امۃ العزیز خدیجہ بنت یوسف بڑی کاملہ تھیں، ابن عماد اور یافعی نے لکھا ہے،

روت الکثیر عن ابن اللتی ومکرم وعن ابن الزبیدی[2]۔	ابن لتی مکرم اور شیخ ابن زبیدی سے کثرت سے روایت کی ہے،

(شذرات الذہب ج ۵ ص ۴۴۲)

امام ذہبی نے العالمۃ الکاتبۃ اور یافعی نے عالمہ فاضلہ لکھا ہے[3]، [illegible] میں انتقال کیا۔

انہی کی ہم نام ایک اور خدیجہ تھیں، جو مفتی محمد کی صاحبزادی تھیں، ان کا تذکرہ بھی یافعی اور امام ذہبی نے کیا ہے[4]۔ [illegible] میں وفات پائی۔

اسی [illegible] میں متعدد صاحب علم و فضل خواتین نے وفات پائی، ان میں ایک ہدیہ بنت عبدالحمید ہیں، جو صحیح بخاری کی روایت شیخ ابن زبیدی کے واسطہ سے کرتی ہیں، دوسری صفیہ ہیں جو عبدالرحمٰن المنادی کی صاحبزادی ہیں۔ شیخ موفق سے روایت کرنے والوں میں صفیہ کا شمار پانچویں طبقہ میں ہے۔ امام ذہبی، ابن عماد

---

[1] ایضاً [2] شذرات الذہب ج ۵ ص ۴۳۰ [3] مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۲۲۳ [4] ایضاً تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص [illegible]

[5] شذرات الذہب ج ۵ ص ۴۴۲

اور یافعی وغیرہ نے ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

جدہ بنت فخر الدین، یہ اس خاندان کی فرد نظر تھیں، جس میں علم و فضل کا چرچا صدیوں رہا ہے، یعنی یہ امام ابن تیمیہ کی دادی تھیں۔ امام ابن تیمیہ کے دادا شیخ مجد الدین اپنے وقت کے شیخ کل تھے، ان کی کتاب المنتقی سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، جدہ شیخ کی چچا زاد بہن اور ان کی بہن تھیں، ضیا بنت الخزلعت سے یہ خاص طور سے روایت کرتی تھیں[1]،

زینب بنت عمر۔ امام ذہبی نے ان کو "مسندۃ بعلبک" لکھا ہے، اور روایت کے سلسلہ میں متعدد جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کو امام نووی کے طبقہ میں شمار کیا ہے[2]۔

ساتویں صدی میں تاتاریوں کا طوفان اٹھا تھا جس نے مسلمانوں کے تمام شعبہائے زندگی کا شیرازہ درہم برہم کر دیا۔ اس طوفان کا اصلی رخ تو ان کی سیاسی زندگی کی طرف تھا، مگر اسی میں ان کے ذخیرۂ علم و فن کا ایک ایک ورق پریشان ہو گیا، اور ان کی تہذیب و تمدن کا ایک ایک نقش مدھم پڑ گیا، کتنی علمی مجلسیں بے چراغ ہو گئیں اور رشد و ہدایت کی کتنی مسندیں سونی پڑ گئیں۔ علم حدیث جس کا چرچا گھر گھر تھا۔ اخبرنا حدثنا کی جو آواز کوچہ کوچہ سنائی دیتی تھی، اس صدی کے آخر میں یہ آواز بھی دھیمی پڑ گئی۔ اور اس کا چرچا کم ہو گیا۔ امام ذہبی اس صدی کے آخر کے متعلق بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

وقد قل من یعتنی بالآثار ومعرفتها في هذا الوقت في مشارق الارض ومغاربها على راس السبع المائة اما المشرق واقالیمه فغلق الباب وانقطع الخطاب واما المغرب وما بقي من جزيرة الاندلس فیندر من یعتنی بالروایة كما ینبغي فضلا عن الدرایة[3]

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴)

ساتویں صدی کے آخر میں تمام مشرق و مغرب میں حدیث و آثار سے اعتنا اور اس پر نظر رکھنے والے بہت کم ہو گئے ہیں۔ مشرقی ممالک کو اگر لیجیے تو علم حدیث کے لئے گویا ان کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور حدثنا و اخبرنا کہنے والے موجود نہیں ہیں یہی حال مغرب کا بھی ہے حتی کہ جزیرۂ اندلس میں کہیں شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ہوں گے جو روایت حدیث سے کما حقہ دلچسپی لیتے ہوں گے، چہ جائیکہ درایت حدیث سے دلچسپی لینے والے (تو شاید موجود بھی نہ ہوں گے)

لیکن اسی صدی میں امام ذہبی، حافظ ابن کثیر، امام ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن اثیر صاحب نہایہ،

---

[1] شذرات الذہب ج ۵ ص ۴۴، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۸۸، ص ۲۱۲، ۲۷۹ [3] تذکرۃ الحفاظ

امام ذہبی وغیرہ جیسے محدثین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی توجہ زیادہ تر علم حدیث ہی پر مرکوز کردی تھی، اور ذوق حدیث کی عام کمی کو اپنی دینی اور علمی مساعی سے پورا کردیا۔

اس دور میں فن رجال میں مردوں کے ساتھ بہت سی خواتین نے بھی اپنی ساری توجہ اس فن پر مبذول رکھی۔ ان میں سے کچھ خواتین کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور محدثات ہیں جن کا فرداً فرداً تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا اس لئے صرف ان کا نام مع تاریخ وفات نقل کردیا جاتا ہے۔

نعمہ بنت علی متوفاۃ سنہ ۶۰۴ھ، یہ ست الکتبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ بقیہ بنت محمد، زینب بنت ابراہیم متوفاۃ سنہ ۶۱۱ھ، عین الشمس بنت احمد بن الفرج متوفاۃ سنہ ۶۱۰ھ، یاسمین بنت عبداللہ متوفاۃ سنہ ۶۴۰ھ، زہرہ بنت محمد متوفاۃ سنہ ۶۲۳ھ، جمال النساء بنت احمد متوفاۃ سنہ ۶۴۱ھ، سعیدہ بنت عبدالملک متوفاۃ سنہ ۶۱۶ھ، فاطمہ بنت سعید الخیر متوفاۃ سنہ ۶۰۳ھ، ربیعہ خاتون متوفاۃ سنہ ۶۴۳ھ، ست العرب متوفاۃ سنہ ۶۸۴ھ، فاطمہ متوفاۃ سنہ ۶۶۸ھ یہ سلطان صلاح الدین الایوبی کی پوتی تھیں، امۃ الحق بنت الحافظ ابوالحسن البکری متوفاۃ سنہ ۶۸۵ھ[1]

یہ ساتویں صدی کی ان خواتین کی فہرست ہے۔ جن کا شمار مشاہیر میں ہے اور جنہوں نے اس وقت کے کبار علماء و محدثین سے سماع یا روایت کی ہے۔ ورنہ یہ فہرست اور طویل ہوسکتی تھی۔

علم حدیث کی خدمت کے لحاظ سے آٹھویں اور نویں صدی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ روایت حدیث کے علاوہ "فن رجال" جو علم حدیث کی بنیاد ہے۔ اس کا منتشر ذخیرہ انہی صدیوں میں مدون ہوا، حدیث کی متعدد کتابیں اور اس کی شرحیں لکھی گئیں۔ تذکرہ و تراجم کی متعدد اہم کتابیں انہی صدیوں میں تصنیف ہوئیں امام ذہبی، حافظ ابن حجر مکی، زین الدین العراقی، ابوبکر ہیثمی سرآمد روزگار علماء و فضلاء انہی صدیوں میں پیدا ہوئے۔ خواتین نے بھی ان دو صدیوں میں علم و فن کی خدمت میں حصہ لیا، اس کی مثال عہد تابعین کے بعد نہیں ملتی، ان خواتین کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے، زینب بنت کی، زینب بنت شکر، زینب بنت سلیمان، ست الوزراء، ست الفقہاء، عائشہ بنت الہادی، ام ہانی، جویریہ وغیرہ انہی صدیوں کی شذرات الذہب ہیں۔ صرف حافظ ابن حجر نے سو سے زائد محدثات کا ذکر کیا ہے، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں ۱۰۷۵ خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں نصف سے زیادہ علم حدیث سے ذوق رکھنے والی خواتین ہیں۔ اوپر جن بزرگوں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ہر ایک کے شیوخ و تلامذہ میں مردوں کے ساتھ بے شمار عورتوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ صرف ابن فہد نے ۱۳۰ محدثات سے اکتساب حدیث کیا تھا[2]، اسی طرح حافظ ابن حجر، امام سخاوی، زین الدین العراقی وغیرہ کے شیوخ و تلامذہ میں

---

[1] ان خواتین کے زیادہ تر نام شذرات الذہب جلد ۵ سے لئے گئے ہیں۔ [2] دررکامنہ ج ۲ ص ۱۲۸ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۸

[illegible] میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئے گا۔

ان تمام خواتین کا تذکرہ دشوار ہے، اس لئے صرف مشاہیر محدثات کی خدمت حدیث کی تفصیل بیان کی جاتی ہے،

آٹھویں صدی کی مشہور محدثات یہ ہیں،

ست الوزراء اس صدی کی سب سے مشہور خاتون ہیں، انھوں نے علم حدیث میں اپنے والد قاضی شمس الدین اور اس صدی کے بیشتر مشاہیر سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس میں مہارت بہم پہنچائی۔ ان کے درس حدیث کا اس قدر چرچا تھا، کہ لوگ ابو العباس بن شحنۃ، ابن الفخر، اور الحجار وغیرہ کے ساتھ ساتھ *ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس صدی کے پچاس سے زائد مشاہیر علماء نے ان سے روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر کے شیوخ میں متعدد اصحاب ہیں۔ جنھوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان سے حدیث کی اجازت لینے کو لوگ فخر سمجھتے تھے صحیح بخاری اور مسند الشافعی کا درس وہ خاص طور سے دیتی تھیں۔ انھوں نے دمشق اور مصر میں متعدد بار ان کتابوں کا درس دیا تھا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ سماع کے ذریعہ مسند کی آخری روایہ تھیں[1]، امام سخاوی نے ایک جگہ ضمناً لکھا ہے کہ ست الوزراء ابو عبد اللہ الزبیدی سے اپنے زمانہ میں آخری روایہ تھیں[2]۔

* ان سے بھی استفادہ کرنے والے لوگ آتے ہیں۔

علم و فضل کے ساتھ نہایت صالح بھی تھیں، دو بار حج کیا تھا، ۶۲۴ھ میں غالباً دمشق میں پیدا ہوئیں۔ اور ۷۱۶ھ میں وفات پائی۔

اسی نام کی ایک اور خاتون بھی ہیں، ان کو بھی فن حدیث سے قدرے لگاؤ تھا، مگر ان کا اصلی رجحان علم و فن سے زیادہ زہد و تقویٰ کی طرف تھا، لہٰذا اسی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں[3]۔

زینب بنت کمال، اس صدی کی دوسری مشہور محدثہ ہیں، بغداد، قاہرہ، اسکندریہ، حران اور شام کے مشہور محدثین سے انھوں نے اکتساب فیض کیا تھا جن میں احمد بن عبد الدائم، محمد بن عیسیٰ بن سلامہ، ابو علی الکبری، زکی المنذری وغیرہ شامل ہیں۔ امام ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر احادیث کی روایت و اجازت میں منفرد تھیں، ان کے درس کا اس قدر شہرہ تھا، کہ طلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، درر کامنہ میں ہے۔

تزاحم علیھا الطلبۃ وقرأوا علیھا الکتب الکبار (ج ۲)	ان پر طلبہ ٹوٹتے تھے، اور ان سے وہ بڑی اہم کتابیں پڑھتے تھے۔

بسا اوقات دن کے بیشتر حصہ میں لوگ ان سے روایت و سماع کرتے رہتے تھے، اور وہ نہایت صبر و تحمل سے

---

[1] الضوء اللامع ج ۱ ص ۱۷۳ [2] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۲۸ [3] ایضاً۔

ان کی تشنگی علم بجھاتی رہتی تھیں۔

درر کامنہ میں ہے، کہ ان کی موت سے ایک اونٹ کے بوجھ برابر حدیث سے لوگ محروم ہوگئے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ سبط السلفی اور ان کے معاصرین سے یہ آخری راویہ تھیں[1]،

وہ ۷۲۳ھ میں پیدا ہوئی تھیں، بچپن ہی سے آشوب چشم کی شکایت تھی، ۸۱۶ھ میں وفات پائی، یعنی ۹۴ برس کی عمر میں، زندگی بھر ناکتخدا رہیں، اخلاق و عادات اور زہد و تقویٰ میں اپنے زمانہ کی رابعہ بصریہ تھیں، امام ذہبی کا بیان ہے'

کانت دینة خیرة ... وکانت لطیفة	نہایت دیندار، نیک کردار، خوش اخلاق،
الاخلاق طویلة الروح وکانت قانعة	اور زندہ دل، قانع، عفیف، پاک نفس اور پاکیزہ
متعففة کریمة النفس طیبة الاخلاق[2]	اخلاق تھیں،

ان کی ایک چچازاد بہن اسماء تھیں، انھوں نے بھی حدیث کی روایت اور سماع میں حصہ لیا ہے[3]،

اسماء بنت مہری، یہ قاضی نجم الدین ابن مہری کی بہن تھیں، انھوں نے اپنے نانا کی بن علان سے بغیة المستفید کے بعض حصے اور اسحاق بن راہویہ کی احادیث کا سماع[4] کیا تھا۔ برزالی کا خیال ہے کہ محدثین کو ان کی مرویات ان کے علاوہ کسی اور کے ذریعہ نہیں پہنچیں، حافظ ابن حجر برزالی کے اس خیال پر استدراک کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ شیخ، برہان الدین اور ابو بکر بن العز الفرضی وغیرہ نے بھی ہم کو ان کی روایتیں سماع کرائی ہیں۔ وہ تقریباً پچاس برس تک حدیث کا درس دیتی رہیں۔ اور موت سے چار روز پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ابن عماد لکھتے ہیں۔

کانت مسندة	یہ قابل اعتماد خاتون تھیں۔

علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھیں، درر کامنہ میں ہے۔ کہ وہ صالحہ تھیں اور قرآن کی تلاوت سے انہیں خاص شغف تھا۔ (ج ۱ ص ۳۶۱)

شذرات الذہب میں ہے

ذات صدقات وفضل وحجت مراراً	صاحب فضل تھیں، اور کثرت سے صدقہ
(ج ۶ ص ۱۰۵)	کرتی رہتی تھیں، کئی بار حج کیا تھا۔

۷۳۵ھ میں پیدا ہوئیں، اور ۹۵ برس کی عمر میں ۸۳۰ھ میں وفات پائی۔

ابو المحاسن حسینی نے ذیل طبقات الحفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے[5]۔

---

[1] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ج ۱ ص ۳۶۱ [4] اسحاق بن راہویہ کی احادیث کا ایک مجموعہ چھپا تھا، جو اسی وقت تک پہنچا اس کا بیان سے معلوم ہوا کہ یہ آٹھویں صدی تک پڑھایا جاتا تھا۔ [5] ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۰

اسماء بنت یعقوب، ان کا شمار بھی اس صدی کے محدثات میں ہے، ان کے والد شرف الدین یعقوب ممتاز محدثین میں تھے اسماء نے ان ہی سے حدیث پڑھی تھی، انھوں نے فخرالفرضی سے بھی روایت وسماع کیا ہے[1]،

ان کے علاوہ اس نام کی کئی اور خاتون ہیں، جنہوں نے خدمت حدیث میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے مثلاً اسماء بنت حافظ صلاح الدین متوفاة ۸۹۵ھ اسماء بنت احمد متوفاة ۸۰۰ھ اسماء بنت الخلیل العلائی متوفاة ۸۹۹ھ، وغیرہ۔

امۃ العزیز، یہ حافظ ابوالحسن علی کی صاحبزادی تھیں۔ عام طور پر یہ "الشیخہ" کے لقب سے معروف تھیں شیخ شمس الدین ابن علان اور نصراللہ بن حوامی وغیرہ سے ان کو سماع حاصل تھا، اس نام کی دو ایک اور محدثات بھی ہیں۔

امۃ الرحمٰن اور امۃ السلام، یہ دو خاتون بھی ساتویں صدی کی محدثات میں ہیں، امۃ الرحمٰن نے مشہور محدث شیخ حجار سے بخاری شریف پڑھی تھی، اور خود اس کی روایت بھی کرتی تھیں، شیخ ابوحامد نے ان سے سماع کیا تھا، انھوں نے اپنے معجم الشیوخ میں امۃ الرحمٰن کا تذکرہ بھی کیا ہے[2]، ۷۶۰ھ کے بعد انتقال کیا۔

امۃ السلام، یہ مشہور محدثہ ست الاہل کی پوتی تھیں، اور انہی سے حدیث پڑھی تھی، خود بھی روایت کرتی تھیں ۷۴۴ھ میں اس دارفانی کو چھوڑا،

امۃ الرحیم اور آمنۃ نام کی بھی متعدد خواتین ہیں۔ جو اسی سلسلۃ الذہب کی چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں،

جویریہ بنت احمد، جویریہ اپنی شہرت کے لحاظ سے ست الوزراء اور زینب بنت کمال کے ہم پایہ تھیں، گو ست الوزراء ان کے شیوخ میں ہیں انہوں نے ابن شحنہ اُست الوزراء سے صحیح بخاری اور شریف موسیٰ سے صحیح مسلم اور ابوالحسن بن صواف سے سنن نسائی اور مسند حمیدی اور علی بن عیسیٰ سے مستخرج اسمٰعیلی اور جزء سفیان اور حسین بن عمر سے مسند دارمی وغیرہ کا سماع کیا تھا۔ ان سے سماع اور روایت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ابوجعفر کوبک ان کے تلامذہ میں ہیں۔ ان کی حدیث دانی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

سمع منھا بعض مشائخنا وکثیر من اقرانا۔	ہمارے بعض شیوخ حدیث اور بہت سے معاصرین نے ان سے سماع کیا ہے۔

۷۲۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ اور ۸۰۳ھ میں وفات پائی

حبیبہ نام کی ایک محدثہ کا تذکرہ حسینی نے ذیل طبقات الحفاظ میں کیا ہے، ان کو ابن الدائم سے سماع اور محمد بن البارک سے اجازت حاصل تھی۔

---

[1] درر کامنہ ج ۱ ص ۳۴۵ [2] ذیل ص ۲۸

دنیا بنت حسن، مشہور محدث امام ہمدانی کی اہلیہ تھیں۔ انھوں نے یوسف بن خلیل سے سماع حدیث کیا تھا، شیخ زین الدین العراقی اور ابن رافع ان کے تلامذہ میں ہیں۔ [illegible] میں پیدا ہوئیں اور [illegible] میں وفات پائی[1]۔

رقیہ بنت عبد الغفار، عبد الغفار ساتویں صدی کے مشہور محدث ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے محمد بن الحسن سے سماع کیا تھا، شیخ زین الدین العراقی ان کے تلامذہ میں ہیں۔

رقیہ نام کی ایک دوسری مشہور خاتون تھیں۔ یہ شیخ تقی الدین ابن دقیق العید کی صاحبزادی تھیں۔ انھوں نے عز الحرانی ابوبکر انماطی، ابن خطیب وغیرہ سے سماع حدیث کیا تھا، قاہرہ میں یہ خود درس دیتی تھیں۔ [illegible] میں وفات پائی[2]۔

زینب بنت اسماعیل، یہ امۃ العزیز کے لقب سے مشہور ہیں، ابتداء میں انھوں نے اپنے والد اسماعیل سے استفادہ کیا اور اس کے بعد انتخاب طبرانی، اربعین للآجری، جزء بن عرفہ اور امام بغوی اور ابن صاعد کی مرویات کا دوسرے مشائخ سے سماع کیا۔ علی بن احمد سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی پڑھی، اس کے علاوہ اور فنون کی بھی تکمیل کی، حسن بن حسین، عبد الرحمٰن بن معالی عبد اللہ المقدسی وغیرہ ان کے شیوخ میں ہیں[3]۔

زینب بنت شکر، یہ بھی اس صدی کی مشہور خاتون ہیں، ابن اللتی اور ہمدانی جیسے شیوخ حدیث سے حدیث پڑھی تھی، بڑے بڑے محدثین ان کے تلامذہ میں ہیں، ان سے سماع کرنے کے لئے لوگ سفر کرکے آتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں۔

دارتحلت الیہا الطلبۃ ان کے پاس طلبہ سفر کرکے آتے تھے۔

اپنے زمانہ میں حدیث کی بعض کتابوں کی تحدیث و روایت میں منفرد تھیں۔ مثلاً مسند دارمی اور ثلاثیات دارمی وغیرہ صلاح الدین بن الامیر فخر الدین اور شیخ جمال الدین بن ظہیرہ جو اپنے وقت کے مشہور محدث تھے۔ ان سے سماع کیا تھا، اور خاص طور سے ثلاثیات دارمی پڑھی تھی[4]۔

بیت المقدس کی رہنے والی تھیں، مگر ان کا حلقۂ درس مدینہ منورہ، دمشق، اور مصر تک پھیلا ہوا تھا، علم و فضل کے ساتھ نہایت عبادت گزار اور نیک کردار تھیں، ۷۰ برس کی عمر میں [illegible] میں وفات پائی[5]۔

زینب بنت سلیمان، یہ بھی معروف محدثات میں ہیں، ان کو ابن زبیدی اور احمد بن عبد اللہ ابن صباح،

---

[1] یہ اپنے وقت کے امام حدیث تھے شیخ موفق کے تلامذہ اور امام ذہبی کے شیوخ میں ہیں، [illegible] میں وفات پائی غسول دمشق میں ایک گاؤں ہے، وہیں کے رہنے والے تھے [2] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۱۱۰ [4] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۱۹ [5] ایضاً جلد ۲ ص ۱۱۳ [6] ایضاً ج ۲ ص [illegible] وشذرات الذہب ج ۶ ص [illegible] [7] تاریخ وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر عمر کے بارے میں ابن عماد نے لکھا ہے کہ ان کی وفات [illegible] برس کی عمر میں ہوئی واللہ اعلم [illegible]

اور ابن حجاج وغیرہ محدثین سے سماع حاصل تھا، بعض اجزائے حدیث کی روایت میں وہ منفرد تھیں [illegible] میں وفات پائی،[1]

زینب بنت یحییٰ یہ شیخ عزیز الدین بن عبد السلام کی پوتی تھیں، شیخ بلدانی اور ابراہیم بن خلیل وغیرہ سے روایت کرتی ہیں، ابن عماد نے لکھا ہے کہ وہ کثرت سے روایت کرتی تھیں[2] حافظ ابن حجر سماع متصل کے ساتھ طبرانی کی معجم صغیر کی روایت و تحدیث میں یہ منفرد تھیں،

امام ذہبی کا بیان ہے کہ ان کو روایت حدیث سے اس قدر شغف تھا کہ

قری علیها یوم موتها عدة اجزا — جس دن ان کی وفات ہوئی اس دن بھی متعدد اجزائے حدیث ان سے پڑھے گئے۔

[illegible] میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

زینب بنت عبد اللہ، یہ امام ابن تیمیہ کی بھتیجی تھیں انھوں نے حجار وغیرہ سے سماع کیا تھا، حافظ ابن حجر کے شیوخ میں ہیں[3]

اس نام کی اور کئی خاتون ہیں، جو اس فہرست میں داخل ہو سکتی ہیں مگر طوالت کے خیال سے صرف ان کے نام مع مختصر تعارف درج کئے جاتے ہیں۔

زینب بنت محمد مشہور محدث احمد بن الدائم کی پرپوتی تھیں، [illegible] میں وفات پائی۔

زینب بنت علی، یہ امام ذہبی کی پھوپھی تھیں۔

زینب بنت احمد بنت المغربی کے نام سے معروف ہیں مکہ میں درس دیتی تھیں۔ [illegible] میں وفات پائی

زینب بنت قاسم، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ہمارے شیوخ میں متعدد اصحاب نے ان سے روایت کی ہے [illegible] میں وفات پائی،[4]

زاہدہ اور زینہ نام کی بھی متعدد خواتین ہیں، جو اس سلسلہ میں داخل ہیں۔ زاہدہ نے ست الوزرا سے صحیح بخاری پڑھی تھی،[5] اور زینہ کے متعلق ابن عماد نے لکھا ہے کہ روت الکثیر انھوں نے کثرت سے روایت کی ہے۔

اسی طرح سارہ نام کی بھی متعدد خواتین کا تذکرہ حافظ ابن حجر نے کیا ہے۔ جن میں سارہ بنت عبد الرحمٰن امام برزالی کے شیوخ میں اور سارا بنت محمد محدث برہان الدین اور ابو حامد بن ظہیرہ کے شیوخ میں ہیں۔

---

[1] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۱۸ [2] شذرات ج ۶ ص ۱۱۰ [3] ایضاً اور درر کامنہ ج ۲ ص ۳۵۸ [4] شذرات ج ۶ ص ۳۵۰ [5] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۲۰ تا ص ۱۲۱۔

ست العرب محمد بن الفخر البخاری ساتویں صدی کے مشہور معروف محدث گذرے ہیں[1] یہ انہی کی پوتی تھیں، اپنے دادا سے حدیث پڑھی تھی، ابو بکر ہیثمی، حافظ زین الدین العراقی، امام مقریزی جیسے سرآمد روزگار محدثین ان کے تلمیذ ہیں، ان کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ عراقی خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور تیمناً اپنے صاحبزادے کو بھی ساتھ لے جاتے تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، کہ ان کے دادا کی مرویات کثرت سے ان کے پاس تھیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

الکتب الطوال والاجزاء وشیٔ من کثیر[2]	ان کے پاس اپنے دادا ابن الفخر کی مرویات کے بڑے بڑے مجموعے اور اجزا کثرت سے موجود تھے۔

ابن عماد ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

المسندۃ المکثرۃ .... حدثت وانتشر عنها حدیث کثیر[3]	یہ مسندہ محدثہ تھیں، ان کو بہت کثرت سے حدیثیں یاد تھیں، درس دیتی تھیں، ان کے ذریعہ کثرت سے حدیثیں پھیلیں۔

اس علم وفضل کے ساتھ نہایت صالحہ اور پاکیزہ اخلاق تھیں، ۷۶۷ھ میں وفات پائی، ان معنوی یادگاروں کے علاوہ ایک عالم صاحبزادہ شمس الدین کو یادگار چھوڑا[4]۔

ست الفقہاء اور ست القضاۃ۔ یہ دونوں خاتون امیر دمشق علاء الدین کی بہن تھیں، ان بھائی اور بہنوں کو حدیث کا خاص ذوق تھا، مشہور محدثہ شامیہ بنت البکری سے انھوں نے سماع حدیث کیا تھا، یہ خانوادہ قلعہ شیزر[5] میں رہتا تھا، یہیں پر ان دونوں بہنوں نے محمد بن الخزری کی امالی[6] کے تیسرے چوتھے، چھٹے، ساتویں، اور گیارہویں حصہ کا سماع کیا تھا، اس قلعہ میں ان کا درس حدیث بھی ہوتا تھا، ست الفقہاء زین العراقی کے شیوخ میں ہیں۔ [illegible]ھ میں وفات پائی[7]،

ست البنین۔ انھوں نے ابن شحنہ[8] سے بخاری پڑھی تھی۔ امام دمیاطی نے ان کو روایت حدیث کی اجازت دی تھی، ابو حامد ابن ظہیرہ ان سے سماع کے ذریعہ روایت کرتے ہیں[9]۔

---

[1] ان کا تذکرہ بار بار آتا ہے، اس لئے ان کا مختصر حال لکھ دینا ہے، ابن البخاری کے نام سے اس لئے معروف ہیں، کہ ان کے والد بہت دنوں تک بخارا میں قیام پذیر رہے، یہ ۵۹۵ھ میں پیدا ہوئے، اور ۶۹۰ھ میں وفات پائی، اپنے زمانہ میں یہ علو سند میں ممتاز تھے، ان کے درس میں اس قدر مجمع ہوتا تھا، کہ ایک ایک بار بارہ بارہ سو آدمی ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ [2] الدرر الکامنہ ج ۲ ص [illegible]، [3] شذرات الذہب ج ۶ ص [illegible] [4] الدرر الکامنہ ج ۲ ص [illegible]، [5] شیزر قلعہ نہیں تھا، بلکہ ایک چھوٹی سی ریاست کا مرکز تھا۔ اسامہ بن منقذ اور بہت سے علما اور امراء اسی سے وابستہ رہے ہیں۔ [6] یہ امالی حدیث سے متعلق تھی [7] ایضاً [8] ایضاً ص ۱۲۸ [9] ایضاً۔

ست الخطباء، قاہرہ کے قاضی تقی الدین کی صاحبزادی تھیں، علی بن صواف اور علی بن عیسیٰ وغیرہ سے سماع کیا تھا، مصر اور دمشق دونوں جگہ ان کا فیض تحدیث جاری تھا[1]، ان کی ایک بہن سارہ کا تذکرہ آچکا ہے ۷۳۴ھ میں وفات پائی۔

ان کے علاوہ اس نام کی متعدد اور خواتین مثلاً ست الاہل، ست الشام، ست العجم، ست العیال وغیرہ ہیں انھوں نے حدیث کی روایت و سماع میں حصہ لیا ہے، حافظ ابن حجر نے درر کامنہ میں ان تمام کا تذکرہ کیا ہے (ج ۲ ص ۱۲۱ تا ۱۳۰)

سیتہ بنت محمد، ان کے والد شمس الدین عمر بڑے پایہ کے عالم تھے۔ انہوں نے ان ہی سے سماع حدیث کیا تھا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان سے ایک جماعت نے سماع کیا ہے، مثلاً ابو حامد ابن ظہیرہ نے جو ہمارے اقران میں ان کے ایک صاحبزادہ بدر الدین تھے۔ جن کا شمار محدثین میں ہوتا ہے[2]،

سفری بنت یعقوب، سفری کے خاندان میں علم و فضل کئی پشت سے وراثۃً چلا آرہا تھا، ان کے پردادا عبد اللہ یمن اور عسقلان کے قاضی رہ چکے تھے، ان کے دادا اسماعیل کا شمار محدثین میں تھا، سفری نے اپنے دادا اور اپنے بھائی اسحاق سے حدیث کا سماع کیا تھا، ۶۶۰ھ میں پیدا ہوئیں، اور ۷۴۵ھ میں وفات پائی[3]۔

شہدہ بنت کمال الدین، یہ حافظ وقت شیخ ابن العدیم کی پوتی تھیں، انھوں نے متعدد محدثین سے سماع کیا تھا، شیخ عمر بن بدر الموصلی سے سماع و روایت میں انہیں تفرد حاصل تھا۔ امام ذہبی نے ان سے سماع کیا تھا، ابن عماد ان کے بارے میں لکھتے ہیں،

کانت تکتب وتحفظ وتتزھد وتعبد[4] لکھنا جانتی تھیں، بہت سی چیزوں کی حافظہ تھیں نہایت عابدانہ اور زاہدانہ زندگی گذارتی تھیں۔

۷۰۰ھ میں وفات پائی[5]۔

صفیہ بنت احمد، مشہور محدث شیخ کرمانی سے انھوں نے اربعین الشہامیہ اور مشہور حافظ حدیث احمد بن عبد الدائم سے صحیح مسلم پڑھی تھی، ان کے حدیث کی دوسری کتابوں کا سماع بھی کیا تھا، خود بھی صحیح مسلم اور بعض دوسری کتب حدیث کی تحدیث کرتی تھیں ۷۱۲ھ میں انتقال کیا[6]۔

ضیفہ محدث شمس الدین کی صاحبزادی تھیں۔ حدیث کا ذوق تھا، متعدد اصحاب حدیث سے سماع کیا تھا، لیکن ان

---

[1] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۲۹ [2] درر کامنہ ج ۲ ص ۱۳۰ [3] ایضاً ۱۳۸

[4] اس زمانہ میں پڑھنے کا رواج تو بہت تھا، مگر لکھنا بہت کم لوگ جانتے تھے، اس لیے اکثر مصنف کا تذکرہ ارباب رجال خصوصیت سے کرتے ہیں [5] درر کامنہ ج ۲ ص ۲۰۰ [6] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۸

کا خاص شغل پند و موعظت تھا، اور اسی حیثیت سے وہ مشہور ہیں، عورتوں کے سامنے عموماً ان کا وعظ بھی ہوتا تھا۔[1]

عائشہ بنت ابراہیم۔ یہ امام مزی کی اہلیہ تھیں۔ حافظ ابن کثیر ان کے داماد تھے، ان کو بھی حدیث سے کسی قدر لگاؤ تھا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کی روایت کی ہے لیکن ان کا اصلی ذوق اور شغف قرآن سے تھا۔ قرآن کی حافظ تھیں۔ عورتوں کو ترتیل کے ساتھ اس کا درس دیتی تھیں۔ حافظ ابن کثیر نے بڑے اچھے الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

كانت عديمة النظير في نساء زمانها لكثرة عبادتها وتلاوتها واقرائها القرآن لفصاحة وبلاغة واداء صحيح يعجز كثير من الرجال۔[2]

اپنے زمانہ کی عورتوں میں اپنی کثرت عبادت، تلاوت، اور نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ قرآن کی تدریس میں وہ عدیم النظیر تھیں قرآن اس قدر صحت مخارج کے ساتھ پڑھتی تھیں کہ بہت سے مرد بھی اس طرح نہیں پڑھ سکتے تھے۔

عائشہ بنت محمد۔ انھوں نے متعدد محدثین مثلاً ابن العراقی، شیخ میدانی، محمد عبد الہادی وغیرہ سے سماع کیا تھا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔

حدثت بالكثير وتفردت باجزاء بہت کثرت سے روایت کرتی ہیں اور بہت سے اجزاء حدیث کی روایت میں منفرد تھیں
امام ذہبی نے ان کو خیرہ اور فاضلہ لکھا ہے، ان کا ذریعہ معاش سلائی تھا، ۸۳۶ھ میں وفات پائی۔

عائشہ بنت اسماعیل۔ زینب بنت اسماعیل جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، یہ انہی کی بہن تھیں، یہ بھی حدیث کی روایت میں معروف تھیں۔ حافظ زین الدین العراقی ان کے شیوخ میں ہیں۔[3]

حافظ ابن حجر نے عائشہ نام کی تقریباً پندرہ خواتین کا تذکرہ کیا ہے جن میں بیشتر ایسی ہیں، جنہوں نے حدیث کی روایت و سماع میں حصہ لیا ہے۔

فاطمہ بنت ابراہیم۔ ان کے والد اور دادا کا شمار علماء میں تھا۔ فاطمہ نے ابتداء میں انہی سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے علاوہ ابو مسہر کے مجموعہ حدیث کو ابراہیم بن خلیل سے اور ابن الفرات کی احادیث کو خود انہی سے پڑھا تھا، اس کے علاوہ علی بن الدائم سے انتخاب طبرانی، اربعین آجری، جزء ایوب، جزء ابن عرفہ وغیرہ کا سماع کیا تھا، ان کو متعدد محدثین سے سماع و روایت میں تفرد حاصل تھا سنہ … ھ میں وفات پائی۔[4]

فاطمہ بنت ابراہیم۔ انھوں نے صحیح بخاری حافظ ابن الزبیدی سے پڑھی تھی۔ اور خود بھی اس کی تحدیث کرتی تھیں، حافظ ابن الزبیدی

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۱۸۹ [2] درر کامنہ ج ۲ ص ۲۳۸۔

[3] درر کامنہ ج ۲ ص ۲۳۶ [4] ایضاً ج ۳ ص ۲۲۰۔

سے پڑھی تھی، اور خود بھی اس کی تحدیث کرتی تھیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، کہ

حدثت قديماً من زمان ابن الدائم — یہ بہت دنوں سے یعنی حافظ ابن الدائم کے زمانے سے منصب تحدیث پر فائز تھیں۔

امام سبکی جیسے علامۂ روزگار نے ان سے اکتساب فیض کیا تھا۔ ان کے ایک صاحبزادے ابراہیم کا شمار علماء میں تھا، ان کے علاوہ ایک اور فاطمہ بنت ابراہیم ہیں، جو امام ذہبی اور ابن رافع کے شیوخ میں ہیں۔ ان اماموں نے اپنے معجم الشیوخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے[1]، زینب بنت کمال جن کا تذکرہ ساتویں صدی کی محدثات میں ہو چکا ہے۔ ان سے فاطمہ کو سماع حاصل تھا۔

فاطمہ بنت سلیمان، انھوں نے آٹھویں صدی کے بیشتر مشاہیر سے روایت کی ہے، امام برزالی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ہم سے متعدد کبار محدثین کی مرویات کی روایت کی ہے، اجازت جن شیوخ سے انھوں نے روایت کی ہے، ان کی تعداد ۱۰۰ سے متجاوز ہے، عز بن جماعہ ان کے تلامذہ میں ہیں، ابن سعاد نے لکھا ہے کہ انھوں نے کثرت سے روایت کی ہے، شادی نہیں کی تھی، سنہ ۷۰۸ھ میں اس دار فانی کو چھوڑا[3]۔

فاطمہ بنت عبدالرحمٰن، آٹھویں صدی کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے نانا التقی الواسطی کا شمار علماء محدثین میں تھا، ان کی والدہ ست الفقہاء جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے، محدثات میں تھیں۔ انہی کے آغوش فیض میں ان کی تربیت ہوئی۔ اور اس علمی ماحول میں وہ پروان چڑھیں، پہلے اپنے نانا اور اپنی والدہ سے تحصیل کی، اس کے بعد احمد بن عبدالدائم سے انتخاب طبرانی جزء ایوب، اور ابراہیم بن خلیل اور دوسرے شیوخ سے حدیث کے متعدد اجزاء کا سماع کیا[4]۔

فاطمہ بنت احمد، انھوں نے صحیح بخاری محدثہ وقت ست الوزراء سے پڑھی تھی، سنہ ۷۶۶ھ میں وفات پائی، فاطمہ بنت ابی بکر، یہ امام ذہبی اور امام برزالی کے شیوخ میں ہیں سنہ ۷۲۶ھ میں وفات پائی۔ فاطمہ بنت ابن الدائم مشہور محدث احمد بن عبدالدائم کی پوتی تھیں۔ حدیث کے متعدد اجزاء اپنے دادا سے پڑھے تھے۔ امام برزالی کے شیوخ میں ہیں[5]۔

فاطمہ بنت عبداللہ، حافظ ابن الدائم سے صحیح مسلم اور جزء ابن عرفہ کا سماع کیا تھا، دوسرے شیوخ حدیث سے بھی سماع حاصل تھا۔ حافظ عز بن جماعہ اور امام برزالی کے شیوخ میں ہیں سنہ ۷۳۳ھ میں وفات پائی[6]۔

فاطمہ بنت علی، امام سبکی کی بہن تھیں، ان کے والد خود محدث تھے۔ انہی سے سنن نسائی پڑھی تھی عز بن جماعہ ان سے روایت کرتے ہیں[7]۔

---

[1] درر کامنہ ج ۳ ص ۲۲۰ [2] زینب ان محدثات میں ہیں جن سے روایت اور سماع کرنا قابل فخر تھا۔ [3] درر کامنہ ج ۳ ص ۲۲۲ [4] ایضاً ص ۲۲۳ [5] ایضاً۔ [6] درر کامنہ ج ۳ ص ۲۲۵ [7] ایضاً ص ۲۲۲ [8] ایضاً۔

ان کے علاوہ ایک اور فاطمہ بنت علی ہیں۔ انھوں نے صحیح بخاری حافظ وقت شیخ حجار اور محدثہ وزیرہ سے پڑھی تھی، ان سے ابوحامد بن ظہرہ نے سماع کیا تھا۔ اور حافظ ابن حجر کے شیخ تقی الدین نے روایت حدیث کی اجازت لی تھی۔

فاطمہ بنت عیاش۔ بظاہر علم حدیث کی روایت و سماع کے سلسلہ میں ان کی کوئی خدمت نہیں معلوم ہوئی مگر علم دین اور خاص طور سے علم فقہ سے انہیں خاص ذوق تھا۔ اسی لیے ان کو اس فہرست میں لے لیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ فقہ بہت اچھی جانتی تھیں، امام ابن تیمیہ ان کی ذکاوت اور علمی شغف کے بڑے مداح تھے، ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

كانت تدري الفقه جيداً وكانت تفقهت عند المقادسة وقل من انجب من النساء مثلها	فقہ بہت اچھی جانتی تھیں اور فقہ کی تحصیل انھوں نے علمائے بیت المقدس سے کی تھی۔ بہت کم عورتیں ان کی طرح ممتاز ہوئی ہیں۔

ابن عماد نے ان کے علم و فضل زہد و تقویٰ، اور امر بالمعروف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ان کے بعض فقرے یہ ہیں۔

العالمة الفقيهة سيدة زمانها وانتفع بها خلق من النساء وكانت وافرة العقل والعلم ذات اخلاص وخشية وامر بالمعروف وانصلح بها نساء دمشق ثم نساء مصر وكان لها قبول زائد[۲]	عالمہ، فقیہہ، اپنے زمانہ میں سیدۃ النساء تھیں ان سے بے شمار عورتوں نے اکتساب فیض کیا، نہایت عاقل، اور صاحب علم تھیں اسی کے ساتھ اخلاص، خشیت الٰہی اور امر بالمعروف کے زیور سے بھی آراستہ تھیں، ان کے ذریعہ دمشق اور مصر کی عورتوں میں صلاح و تقویٰ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔

فاطمہ بنت علم الدین۔ یہ امام برزالی کی صاحبزادی ہیں قرآن کی حافظ تھیں، ابن عماد نے لکھا ہے کہ محدثین کی ایک جماعت سے انھوں نے سماع حدیث کیا تھا۔ بخاری شریف کا انھوں نے صرف سماع ہی نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے پاس ان کا لکھا ہوا اس کا نسخہ بھی موجود تھا، حدیث کے متعدد اجزاء اور مجد الدین ابن تیمیہ کی کتاب الاحکام بھی ان کے پاس خود انہی کی لکھی ہوئی موجود تھی[۳]۔

ان کے علاوہ اس نام کی کئی اور خاتون ہیں۔ جو اسی زمرہ میں داخل ہیں، مگر قصداً ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے

موفقیہ بنت احمد، یہ بہت سے اجزائے حدیث کے سماع میں منفرد تھیں، ابن سید الناس، امام سبکی، عز بن جماعہ، ابن الفخر وغیرہ بہت سے ممتاز محدثین ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہیں[۴]،

---

[۲] شذرات الذہب ج ۶ ص ۴۰ [۳] شذرات الذہب ج ۶ ص ۹۷ [۴] درر کامنہ ج ۴ ص [illegible]

مریم بنت شہاب الدین ان کو حسینی نے مسندہ مصر لکھا ہے یہ قاضی القضاۃ شمس الدین کی پوتی تھیں۔
تاریخ بنت عبداللہ۔ ابن الدائم سے صحیح مسلم اور منتقی کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا، عز بن جماعہ اور ابن رافع کے شیوخ میں ہیں۔

نخوہ بنت زین الدین حافظ ابو نعیم نے مستخرج بخاری کئی جلدوں میں لکھی ہے، اس کے متعدد اجزاء کا سماع نخوہ نے یوسف بن خلیل سے کیا تھا، ان اجزاء کی روایت میں وہ منفرد تھیں، امام ذہبی کے شیوخ میں ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ میرے خیال میں ان کے علاوہ کسی دوسری عورت نے یوسف بن خلیل سے سماع نہیں کیا ہے ۷۰۹ھ میں وفات پائی[1]

نفیسہ بنت ابراہیم، ابن الدائم، عبدالوہاب بن الناصح اسماعیل بن عسقلانی وغیرہ ان کے شیوخ میں ہیں۔ اور امام مزی، امام ذہبی۔ ابوشامہ، ابن رافع وغیرہ نے ان سے سماع کیا تھا، اور اپنے معجم الشیوخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انھوں نے بہت کثرت سے روایت کی ہے، حسینی نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے ۷۰۹ھ میں وفات پائی[2]

صدیہ بنت علی، انھوں نے ابن الزبیدی۔ ابن اللتی، اور ہمدانی وغیرہ سے سماع کیا تھا علم وفضل کے ساتھ صاحب زہد و تقویٰ بھی تھیں[3]،

اس صدی کے آخر میں ایک خاتون وزیرہ گذری ہیں۔ ان سے بڑے بڑے محدثین نے حدیث کا سماع کیا ہے بخصوصیت سے صحیح بخاری اور مسند الشافعی کی تحدیث میں وہ ممتاز تھیں۔ ابن عماد اور حافظ ابن حجر نے متعدد جگہ ان کا ذکر کیا ہے[4]
طوالت کے خیال سے اس صدی کا تذکرہ ہم ان ہی پر ختم کرتے ہیں۔ ورنہ اس صدی کی محدثات کی فہرست کافی طویل ہے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۶ ص ۹۷ [2] درر کامنہ ج ۴ ص ۳۸۳ [3] ایضاً [4] ایضاً

اسلام کا فلسفۂ ہجرت

جناب حمید نسیم صاحب رفیع آبادی

ایم اے۔ ایم۔ فل۔ ایچ علیگ متعلم شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہجرت انسان کے عقائد و نظریہ کے تحفظ اور آزادی رائے کی فضا کو پروان چڑھانے کے عمل میں ہمیشہ ایک موثر ذریعہ رہی ہے۔ آزادی کی حفاظت اور عقیدے کی سلامتی ہر دور میں قوموں کے لئے بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاد کے احکام اور مسائل بیان کرنے کے بعد ہجرت کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کی اہمیت اور افادیت کو شرعی نصوص سے مؤکد کر دیا ہے کیوں کہ ہجرت انسان کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی نموپذیری اور تشکیل و اظہار کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے فلسفۂ ہجرت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہجرت کے مختلف معنی و مفاہیم کا ادراک بھی حاصل کر لیا جائے، اسی طرح ہجرت کے مختلف مراحل کا تعین بھی کیا جائے۔ زیر نظر مقالے میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہجرت کے موضوع پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

ہجرت کے مختلف معنی

عربی میں جب ہَجَرَ فلانٌ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی نے کسی چیز یا کسی جگہ کو چھوڑ دیا اسی سے مصدر ہجرًا ہجرانًا و ہجرۃً حسنۃً استعمال کرتے ہیں تو اس کے دو معنی ہیں ایک ترک کر دینا دوسرے ہجرتِ حسنہ اختیار کر لینا۔ ہجرت کا یہ مفہوم لحیانی نے بیان کیا ہے اَلْمُہٰجَرَۃُ و الہجرۃ کا مطلب ہے۔ الخروج من ارض الیٰ ارض یعنی ایک سرزمین سے دوسری سرزمین تک نکل جانا اسی بنا پر آپ کے ساتھ مکے سے مدینہ جانے والے صحابہ کو مہاجرین کہا جاتا ہے۔ اسی لفظ ہجرت سے مہاجرین مشتق ہے اس کے ساتھ کہتے ہیں تَہَجَّرَ فلاں کہ فلاں شخص نے مہاجرین کے ساتھ مشابہت اختیار کر لی ہے۔ عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے ھاجروا ولا تھجروا۔ ہجرت اختیار کرو۔ نہ کہ مہاجرین کے ساتھ مشابہت۔ ابو عبید کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ہجرت کو خدا کے لئے خالصتاً اختیار کر لیا جائے اور اخلاص کی عدم موجودگی میں صرف مہاجرین کے ساتھ مشابہت اختیار کر لینے کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔

ازہری کا قول ہے کہ مہاجرت کی اصلیت عرب لوگوں کے نزدیک بدوی کا اپنے دیہات سے شہر کی طرف نکل جانا ہے اس طرح مہاجر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مسکن کو خالی کرکے دوسری قوم یا وطن کو اختیار کرلے۔ "مہاجرین" کا یہ نام اس لئے پڑا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے وطنوں اور گھروں کو صرف خدا کی منشا کو پورا کرنے کی غرض سے چھوڑ دیا۔ اور ایک ایسے مقام پر آکر آباد ہوگئے جہاں نہ ان کے اہل وعیال موجود تھے اور نہ ہی مال ومنال۔ جب وہ مدینے کی طرف ہجرت کرکے چلے گئے تھے۔

اس لئے ہر وہ شخص جو چاہے دیہاتی ہو یا شہری۔ جب اپنے وطن سے ہجرت کرکے دوسرا وطن اختیار کرلے تو وہ مہاجر کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ومن یہاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعة" اس کے برعکس ہر وہ شخص چاہے دیہاتی ہو یا شہری، اگر وہ اپنے وطن میں ہی قیام کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لینے کے لئے آپ کے پاس حاضر نہ ہوا ہو یا اس نے اسلامی حکومت کے زیر نگیں شہروں کا رخ نہ کیا ہو، ایسا شخص مسلمان ہونے کے باوجود مہاجر نہیں کہلائے گا۔ ایسے شخص کو مال فئی میں سے بھی حصہ نہیں ملے گا۔ ایسے شخص کو اعرابی کہا جائے گا۔

جوھری کا قول ہے کہ ہجرتیں دو واقع ہوئیں ہیں۔ ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ۔ ابن اثیر کا کہنا ہے کہ دو قسم کی ہجرتیں ہیں۔ ان میں سے پہلی ہجرت ایسی ہے کہ جس پر خدا نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

دوسری قسم ہجرت کی وہ تھی کہ بدوی لوگ مسلمانوں کے ساتھ جہاد اور قتال میں شمولیت کے لئے مدینے کی طرف ہجرت کرکے آتے تھے۔ مگر ان کا عمل اس درجے کا نہیں تھا جیسا کہ پہلی قسم کے مہاجرین کا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی مہاجرین کہلائے جاتے ہیں، مگر ان کی فضیلت پہلے گروہ مہاجرین جیسی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک لا تنقطع الہجرة حتی تنقطع التوبة سے بھی دراصل یہی مراد ہے اور ان دونوں حدیثوں کے جمع کرنے کی صورت بھی یہی ہے کہ لا ھجرة بعد الفتح اور لا تنقطع الہجرة حتی تنقطع التوبة۔

جب دو ہجرتوں کو علی الاطلاق ذکر کیا جائے تو ان سے مراد ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ سیکون ھجرة بعد ھجرة ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت واقع ہوگی۔ ابن اثیر کے مطابق یہ دو ہجرتیں ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ ہیں۔ ہجرت کے ان تمام لغوی و اصطلاحی معنوں پر غور کرنے سے ہمارے سامنے ہجرت کا یہ مفہوم آجاتا ہے۔

۱۔ کسی کے ساتھ ترک تعلق کرنا۔ مثلاً اہل شرک، اہل نفاق اور اہل معاصی سے دین کی حفاظت کی غرض سے تعلقات توڑ لئے جائیں۔ اس وقت تک کہ وہ توبہ نہ کرلے۔ یا حق کی طرف مراجعت نہ کریں۔ جیسے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ غزوہ تبوک میں ان کی عدم شرکت کو نفاق پر محمول کے

ان سے ترک تعلق کیا تھا۔ قرآن نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں کے ساتھ ترک تعلق پر ابھارا اور آپ سے فرمایا "واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا"۔ اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔

۲۔ اخلاص اور دل کی رغبت کے بغیر کام کرنا۔ قول اور عمل میں تضاد ہونا اور کسی معاملے میں غفلت اور اعراض کا رویہ اختیار کرنا بھی ہجرت کا ایک مفہوم ہے چنانچہ قرآن کی اس آیت میں ہجرت کا یہ مفہوم ادا ہوا ہے لا یسمعون القرآن الا ھجرا۔ کہ یہ لوگ (کافر) قرآن تو سنتے ہیں مگر غفلت اور اعراض کے ساتھ۔ اسی طرح ہجرت کے اس مفہوم پر یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ ومن الناس لا یذکر اللہ الا ھجرا کہ لوگوں میں سے کچھ لوگ بے ادبی کے ساتھ خدا کا ذکر کرتے ہیں ان کے دل اور زبان ایک نہیں ہوتے ہیں۔

۳۔ کسی مقام کو دوسری جگہ کے لئے چھوڑ دینا۔ اس مفہوم میں ہجرت کا اکثر استعمال یہ ہوتا ہے کہ ایک سرزمین سے دوسری سرزمین کی طرف نکلا جائے۔ چنانچہ مہاجرین ان لوگوں کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینے کی طرف نکل کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے ترک وطن کیا تھا، اسی طرح کام کو چھوڑ دینے اور اس سے دور رہنے کے مفہوم میں بھی ہجرت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے ان دونوں معنوں کو بیان کیا ہے۔ پہلے معنی کا اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اِنَّ الَّذِینَ آمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والَّذِینَ اٰووا وَّنَصَرُوا اولٰئِکَ بعضھُم اَولیاءُ بعض۔ اِنَّ الَّذِینَ آمنُوا والَّذِینَ ھَاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولٰئِکَ یرجون رحمت اللہ ط واللہ غفور رحیم۔ اور دوسرے معنی میں اس آیت میں "والرجز فاھجر" یعنی "اور ناپاکی چاہے اعتقادی ہو یا عملی ہو۔ اس سے الگ اور دور رہو"۔

۴۔ ہجرت کا چوتھا مفہوم بدوی کا اپنے دیہات سے نکل کر شہر کی طرف چلا جانا ہے۔ یا کسی آدمی کا اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی وطن کو اختیار کر لینا بھی ہجرت کہلاتا ہے۔ مہاجرین کو اس لئے مہاجرین کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے وطنوں اور گھروں کو صرف خدا کی رضا کے لئے ترک کیا تھا اور ایک ایسی جگہ چلے آئے جہاں ان کا گھر بار اور مال و جائداد بھی نہ تھی۔ قرآن میں بھی ہجرت کا یہ استعمال آیا ہے۔ والذین آمنوا من بعد وھاجروا معکم فاولٰئک منکم ط

ہجرت کے مندرجہ بالا مفہوم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہجرت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور ہجرت کے دائرے میں اسلام میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ترک و اختیار کا ایک پورا اور ہمہ گیر پروگرام آتا ہے۔

ہجرت کے مختلف مرحلے اس اجمال کی تفصیل میں تھوڑی وسعت اور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک

داعی جب لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ان تمام اعتقادات، اعمال، رسم و رواج سے خود بھی ہجرت کر چکا ہو۔ جو اس کی مدعو قوم یا سماج میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہٹ کر پروان چڑھے ہوں۔ اور جو خدا تعالیٰ کی ہدایت کے علی الرغم واقع ہوئے ہوں، چاہے وہ بت پرستی ہو، جاہلیت ہو، نفاق ہو، کفر ہو، توہم پرستی ہو، لہو و لعب ہو، شراب خوری اور بدکاری ہو، غرض ان تمام اعتقادی اور عملی ناپاکیوں سے داعی کا خود پاک صاف ہونا از حد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر جب لوگوں کے سامنے اپنی دعوت رکھتے تھے تو پہلے ان کے تمام غلط عقائد و اعمال سے برائت ظاہر کرتے تھے، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی بت پرستی اور شرک سے بیزاری کا اعلان کیا اور ایک الگ جبہ حق پرستوں اور ان برائیوں سے بچنے رہنے والوں غریب لوگوں (اراذل بادی الرائی) کا بنایا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کی مشرکانہ عادات اور اعمال و عقائد سے برات کا اظہار کیا اور قوم کے طریق زندگی سے باغی بھی ہوئے اور کہا کہ "انی مہاجر الی ربی" یعنی کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت اختیار کر رہا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے غیر اسلامی عقائد اور غیر دینی اعمال اور طور طریقوں پر تنقید کی اور خود اس پورے طرز عمل سے دوری اختیار کر لی اور صاف لفظوں میں اپنی قوم سے مخاطب ہوئے۔ مَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَا اَنْھٰکُمْ عَنْہُ ؎

اسی طرح جتنے بھی پیغمبر دنیا میں مبعوث ہوئے۔ ان سب نے اپنی قوم کے غیر اسلامی عقائد و اعمال اور مشرکانہ افعال و رسوم سے پہلے خود ہجرت اختیار کر لی تھی، اور اس کے بعد ہی لوگوں کو خدا کی طرف بلانا شروع کیا تھا۔ آخر میں حضرت خاتم الانبیاءؐ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال بد کے دنیاوی و آخروی انجام سے خبردار کرنے کے بعد حکم دیا اور فرمایا۔

"والرجز فاھجر" کہ آپ (اعتقادی اور عملی) ناپاکی سے ہجرت اختیار کریں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیں پیغمبران علیہم السلام کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حضرات اپنی اپنی قوموں کے ساتھ دعوت کے تعلق کے علاوہ باقی سب تعلقات منقطع کر لیتے تھے اور اس کے ساتھ وقت کے لیڈروں اور سرداروں کی قیادت کو ماننے سے انکار کرتے تھے اور لوگوں سے خدا کی بندگی اور اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔

فاتقوا اللہ واطیعون ۔

وہ ان کے ساتھ دوستی و محبت کے تمام رشتے توڑ دیتے تھے وہ نہ صرف وقت کے غلط اور باطل اقتدار سے بغاوت اختیار کر لیتے تھے بلکہ وقت کے حکمرانوں اور سرداروں کو بھی خدا کی غلامی اختیار کر لینے کی دعوت دیا کرتے تھے اگرچہ انبیائے کرامؑ اپنی قوموں کے درمیان رہتے بستے بھی تھے مگر وہ ایک طرح سے ہر معاملے میں اپنی قوموں سے الگ اور منفرد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حالت صرف انبیاء کرامؑ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ ان کے پیروکاروں کا حال بھی یہی تھا کہ وہ ایمان لانے

کے بعد قوم میں رہتے ہوئے بھی اجنبی اور مہاجر معلوم ہوتے تھے۔ اس کی بہترین مثال اصحاب کہف کی ہے یہ چند ایسے مسلمان نوجوان تھے۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لایا تھا اور اپنی قوم کی مشرکانہ اور باغیانہ روش سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ قرآن نے ان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب وہ نوجوان اپنی قوم سے الگ ہو جانے کے بعد ایک غار کا رخ کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ؎

"اور جب تم ان لوگوں سے اور ان کے معبودوں سے الگ ہو گئے ہو۔ مگر اللہ سے نہیں، تو تم (فلاں) غار میں چل کر پناہ لو۔ تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلائے گا، اور تمہارے لئے اس کام میں کامیابی کا سامان کر دے گا۔"

پھر اس کئی سال کی گہری نیند سے بیدار ہونے کے بعد جس چیز سے وہ لوگ سب سے زیادہ متفکر ہوتے ہیں وہ یہی ہے کہ ان کو دوبارہ اپنے سابقہ طریقے پر نہ واپس لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کو بازار سے کچھ غذا خریدنے کے لئے بھیجتے ہوئے کہتے ہیں۔

"إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ؎

"یعنی اگر وہ لوگ کہیں تمہاری خبر پا لیں گے تو تم کو پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تم کو جبراً اپنے طریقہ میں پھیر لیں گے اور ایسا ہوا تو کبھی تمہاری فلاح نہ ہو گی۔

اس آیت شریفہ سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ کہ جس غلط ماحول کے عقائد، اعمال اور افراد سے ان نوجوانوں نے ہجرت اختیار کر لی تھی، ان کے دلوں میں اس کے لئے کتنی شدید نفرت پوشیدہ تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایمان لانے کے ساتھ ہی جب ایک مومن اپنے قوم کے جاہلی عقائد و رسوم سے ہجرت اختیار کر لیتا ہے تو یہی ہجرت اس کو آہستہ آہستہ کفار و مشرکین اور فساق و فجار سے موالات کے تمام تعلقات چھوڑ دینے پر تیار کر لیتی ہے۔ اور بالآخر اگر ایسے شخص کو اس ماحول میں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع نہ مل سکے تو وہ آخری چارہ کار کے طور پر اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ایسا شخص اسلام پر ایمان کا دعوی بھی رکھے اور دوسری طرف غیر اسلامی عقائد اور مشرکانہ اعمال میں لت پت بھی ہو، ایک طرف وہ کفار کے خداؤں کا منکر ہو اور دوسری طرف وہ کفار کا دوست اور ولی بھی ہو، ایک طرف وہ منکرات اور فحاشی سے متنفر بھی ہو اور دوسری طرف وہ فحاشی اور منکرات کو فروغ دینے والوں کے ساتھ تعاون کرے یا ان کی سرداری

استبداد کو کھلے سینے سے برداشت بھی کرے۔

چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ جب کفار اور ان پاکبازوں کے درمیان کشمکش اس آخری مرحلے پر پہنچ جاتی تھی تو اس وقت کفار ان سے جل کر کہا کرتے تھے

"وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ اَرْضِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا۔"

"اور کافروں نے اپنے وقت کے رسولوں سے کہا کہ تم کو ضرور اپنی زمینوں سے نکال باہر کردیں گے یا تمہیں اپنے طریقے پر پھیر لیں گے۔

کیونکہ یہ ہرگز اور کبھی نہیں ممکن ہے کہ انبیاء کرام اور ان کے پیرو کار کسی بھی زمانے میں کفار و مشرکین کے طور طریقوں اور عقائد کو چھوڑ دینے کے بعد اس بات کے لیے آزاد ہوں کہ وہ ان کے ساتھ دوستی اور حوالات کے تعلقات بھی قائم رکھ سکیں اسلام تو صرف ایک رشتے کا قائل ہے اور وہ ہے دین اور ایمان کا رشتہ۔ جب کسی فرد یا جماعت نے بار بار مسلمانوں کی دعوت کو رد کر دیا ہو۔ تو وہ پھر اس کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں رکھ سکتے ہیں۔ مسلمان جس طرح ایسے لوگوں کے مذہب سے الگ ہو گئے اسی طرح ان کو ان سے بھی الگ ہونا چاہیئے چنانچہ قرآن نے اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

آپ ہرگز ان لوگوں کو نہیں پائیں گے جو خدا اور رسولؐ کے ساتھ دشمنی کرنے والے ہیں۔ کہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے والے لوگ ان کے ساتھ محبت کرتے ہوں، اسی طرح قرآن نے دوسری جگہ بتایا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ اے ایمان لانے والو! اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ پیارا رکھتے ہوں۔ اور جو کوئی تم سے ان کے ساتھ دوستی رکھے گا۔ وہ لوگ فاسق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یعنی کفار نہ صرف خود ہی ایمان سے محروم رہیں گے۔ بلکہ کوشش کریں گے کہ تم بھی کسی نہ کسی طرح راہِ راست سے ہٹ جاؤ۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر ایک داعی قوم کے سامنے اسلام کی دعوت رکھ دیا ہو اور قوم کی طرف سے ان کا جواب انکار اور بغاوت کی صورت میں دیا جاتا ہو تو ایسے داعی کو اپنی قوم سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ اور ان سے صرف دعوت کا تعلق رکھ کر عام دوسرے تعلقات سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔ اس کو کسی بھی صورت میں ان لوگوں کے ساتھ گھل مل نہیں جانا چاہیئے اور ہرگز ان کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ نہیں بننا چاہیئے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے خرابی یوں آئی کہ ایک شخص دوسرے سے ملتا اور اسے کہتا: خدا سے ڈر اور جو کچھ تو برا کام کر رہا ہے

اسے چھوڑ دے کیونکہ یہ تیرے لئے جائز نہیں ہے۔ پھر وہ دوسرے دن اسے ملتا۔ تو وہ اگرچہ اسی حالت میں ہوتا مگر یہ حالت اسے اسکا ہم پیالہ و ہم نوالہ اور ہم مجلس ہونے سے نہ روکتی۔ پس جب انہوں نے ایسا کیا تو خدا نے سب کو ایک جیسا کر دیا۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

لعن الذین کفروا۔ الیٰ فاسقون (جس میں بنی اسرائیل پر لعنت کی گئی ہے)

پھر آپؐ نے فرمایا: قسم ہے خدا کی یا تو تم نیک کام کا حکم دو۔ اور برائی سے روکو۔ اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اسے حق پر مائل کرو۔ اور سیدھے راستے پر قائم رکھو، ورنہ خدا تم سب کو ایک جیسا کر دے گا۔ اور پھر تم پر بھی لعنت بھیجے گا۔ جیسے بنی اسرائیل پر لعنت بھیجی۔ دوسری حدیث میں ہے (جس کی روایت ابو سعید خدریؓ کی ہے) کہ فرمایا رسول اللہؐ نے، اپنا مصاحب اور دوست نہ بناؤ۔ مگر مسلمان کو (یعنی کافر اور منافق یا فاسق کو اپنا دوست نہ بناؤ) اور اپنا کھانا نہ کھلاؤ۔ مگر پرہیزگار کو۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان لانے کے ساتھ ہی جس طرح غلط عقائد و اعمال سے ہجرت کرنا ضروری ہے اسی طرح دعوت دین کا ابتدا کرنے کے ساتھ ہی کفار و مشرکین اور منافقین و فاسقین کے ساتھ موالات کا تعلق قطع کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی مجلس اور صحبت میں رہنے سے احتراز کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مومن اور ایک داعی الی اللہ جب اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو سب سے کٹ جاتا ہے اور ایسا شخص صرف ان لوگوں کے ساتھ جڑ جاتا ہے جو تعلق باللہ کے عمل میں مفید ہوں۔

مگر جب کفار مسلمانوں کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزارنے نہیں دیتے۔ اور ان کے خلاف سازشوں کے جال پھیلا دیتے ہیں کہ مسلمان کے لئے اپنے وطن میں ترک دین (جس کو عربی میں فتنہ میں ڈالنا کہتے ہیں) کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ کھلا نہ رہے۔ تو وہ بجائے اس کے کہ ترک دین کرے، ترک وطن کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اگر کوئی چیز اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے تو وہ اس کا دین ہے۔ اسی طرز عمل کا نام ہجرت یعنی ترک وطن ہے۔ یہ ہجرت کا سب سے اعلیٰ اور آخری درجہ ہے۔

ہجرت کے اس اعلیٰ عمل میں اگر دین اور خدا کی رضا کے علاوہ اور کوئی دوسرا مقصد شامل ہو تو خدا کے یہاں ایسی ہجرت قبول نہیں کی جاتی ہے۔ چنانچہ رسولؐ نے فرمایا۔

اِنَّمَا الاعمال بالنیات وانَّمَا الامری ما نویٰ فمَن کانتْ ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومَنْ کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبہا او امراۃ ینزوجہا فھجرتہ الی ما ھاجَرَ الیہ

(بقیہ، صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

احتکار

یعنی ذخیرہ اندوزی

(مجیب اللہ ندوی)

ہر زمانہ میں کچھ ایسے خودغرض لوگ موجود رہے ہیں۔ جو دوسروں کی تکلیفوں اور زحمتوں کا خیال کئے بغیر اپنے فائدے کے لئے ضروری چیزوں کا ذخیرہ کر لیتے ہیں اور پھر جب بازار میں اس چیز کی کمی ہوتی ہے اور اس کی مانگ زیادہ ہوتی ہے تو پھر من مانے دام پر اسے بیچتے ہیں، اسی کو شریعت میں احتکار کہتے ہیں۔

جب تک آمد و رفت اور سامان کے حمل و نقل اور دوسری جگہوں کی چیز منگانے کے ذرائع و وسائل وسیع نہ تھے۔ تو اس وقت بھی خودغرض تاجروں کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے گرانی ہوتی تھی، اور عام انسانوں کو اس سے تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ مگر ایک محدود حلقہ میں اس کا اثر ہوتا تھا، لیکن جب سے آمد و رفت کی آسانی حمل و نقل کی سہولت، تار، ٹیلی فون، وائرلیس، ریڈیو کی ایجاد ہوئی ہے، اس وقت اگر چند خودغرض تاجر جب ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں تو پورے ملک کو تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، کہ ہندوستان میں دو سال یعنی ۱۹۶۲، ۱۹۶۳ء کے اندر غلہ کا بھاؤ اسی لئے ۲۵ ـ ۳۰ روپیہ من سے بڑھ کر ۶۰ ـ ۶۵ روپے من ہو گیا تھا[1] بڑے بڑے تاجروں نے یہ اندازہ کر لیا کہ ہندوستان میں سیلاب اور دوسری ارضی و سماوی آفتوں کی وجہ سے غلہ کی پیداوار گھٹ گئی ہے اور حکومت نے باہر سے بھی غلہ کم منگایا ہے۔ اس لئے انھوں نے غلہ کا اسٹاک کرنا شروع کر دیا اور گرانی بڑھنے لگی یہاں تک کہ جب حکومت نے اپنا تمام ذخیرہ کیا ہوا غلہ باہر نکالا اور سخت کنٹرول کیا تو پھر غلہ کے بھاؤ میں کچھ اعتدال پیدا ہوا مگر اس کے باوجود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت کون سا مال بازار سے غائب ہو جائے اور گرانی کا دورہ پڑنے لگے، اسی طرح دوسری اشیاء کی گرانی بھی اسی احتکار کا نتیجہ ہے

---

[1] ۱۹۶۴ء میں اس وقت گیہوں کا بھاؤ ۱۳ ـ ۱۴ روپے من تھا اور ایک بیک بڑھ کر بیس پچیس روپے من ہو گیا تھا۔ اس کے بعد حکومت کی سختی کی وجہ سے کچھ اعتدال آیا۔

اس وقت [illegible] میں بھی ملک کے اندر یہی صورت حال قائم ہے، روز بروز گرانی بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ حکومت خود تاجر بن گئی ہے۔ اس لئے اس کو اس کی فکر نہیں ہے کہ عوام کتنی مصیبت جھیل رہے ہیں۔ موجودہ قانون میں ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کو پسند نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس پر کوئی پابندی بھی نہیں لگائی ہے۔ لیکن اسلامی شریعت نے ذخیرہ اندوزی کو انتہائی ناپسند کیا ہے اور اس پر پابندی بھی عائد کی ہے اور ایسے تمام طریقوں کو ممنوع قرار دیا ہے، جس سے ذخیرہ اندوزی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً سٹہ بازی، مستقبل کے سودے وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں سخت الفاظ فرمائے ہیں، آپ نے فرمایا ذخیرہ اندوز ملعون ہے، آپ نے فرمایا جو شخص بھاؤ میں گرانی پیدا کرنے کا سبب ہو، وہ ایک مہیب آگ میں ڈالا جائے گا۔ ان ہی ارشادات نبوی کی بنا پر چاروں امام اس کی کراہت پر متفق ہیں

وَاتَّفَقُوْا عَلَى كَرَاهَةِ الِاحْتِكَارِ   ذخیرہ اندوزی کے ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں۔

احتکار کے سلسلہ میں فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

یکرہ الاحتکار فی قوت الادمیین والبھائم اذا کان ذلک فی بلد یضرہ الاحتکار باھلہ... والاصل فیہ قولہ علیہ السلام الجالب مرزوق والمحتکر ملعون ولانہ تعلق بہ حق العامۃ وفی الامتناع عن البیع ابطال حقھم وتضییق الامر علیھم فیکرہ اذا کان یضربھم ذلک .... وتخصیص الاحتکار بالاقوات کالحنطۃ والشعیر والتبن والقت قول ابی حنیفۃ ؒ وقال ابو یوسف کل ما اضر بالعامۃ حبسہ فھو احتکار وان کان ذھبا او فضۃ او ثوبا۔ (ھدایہ اخیرین ص۴۲۷ کتاب الکراھۃ)

انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے والی چیزوں کو ذخیرہ کر کے گرانی کا انتظار کرنا مکروہ تحریمی ہے جب یہ ذخیرہ اندوزی ایسی جگہ ہو جہاں کے باشندوں کو اس سے تکلیف پہنچ رہی ہو۔ یہ کراہت اس حدیث نبوی کی بنا پر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مناسب طور پر فائدہ اٹھانے والا رزق یافتہ ہوتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے، اور اس کراہت کی عقلی دلیل یہ ہے کہ کھانے پینے والی اشیاء میں سارے بندوں کا حق ہے اور جو شخص غلہ وغیرہ روک کر انسانوں یا جانوروں کو پریشان کرتا ہے تو گویا وہ سب کی حق تلفی کرتا ہے اسلئے مکروہ ہے۔ امام ابو حنیفہ کھانے پینے کی چیزیں مثلاً گیہوں، جو، بھوسا چارہ میں احتکار کو مکروہ کہتے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے کہ جس چیز کے روکنے سے عوام کو تکلیف ہو اس کی ذخیرہ اندوزی کرنا ممنوع ہے سونا، چاندی یا کپڑا وغیرہ جو چیز بھی ہو۔

امام صاحب اور امام ابو یوسف کے اس اختلاف کی توجیہ آگے آ رہی ہے۔

پھر فقہائے احناف نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ احتکار کی مدت کیا ہو۔ یعنی کتنے دن وہ اپنا سامان روک

ہے تو وہ محتکر کہلائے گا ایک حدیث میں چالیس دن سے زیادہ روک رکھنے کے بارے میں وعید آئی ہے (احمد، ابن ابی شیبہ) لیکن اس حدیث کا مقصد عوام کو تکلیف و ضرر سے بچانا ہے اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس سے کم مدت میں بھی اگر ضرر و تکلیف کا امکان ہو تو اسے احتکار سمجھا جائے گا ۔ چنانچہ شیخ عینی لکھتے ہیں ۔

ان التقييد بالاربعين غير مراد به التحديد - (نيل الاوطار ص ۲۵۱ ج ۵)	چالیس دن کی قید سے اس کی تحدید مراد نہیں ہے

احتکار کرنے والا صرف آخرت کے اعتبار ہی سے گنہ گار نہیں ہو گا بلکہ یہ فوجداری جرم قرار دے کر اسے سزا دی بھی جائے گی ۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں ۔

اذا رفع الى القاضى هذا الامر يامر المحتكر ببيع ما فضل عن قوته وقوت اهله على اعتبار السعة فى ذلك وينهاه عن الاحتكار فان رفع اليه مرة آخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له ودفعا للضرر عن الناس ۔ (هدايه ص ۴۵۶)	اگر احتکار کا مسئلہ قاضی کے پاس یعنی فوجداری کورٹ میں لے جایا جائے تو محتکر سے کہا جائے گا کہ اپنے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے بقدر غلہ رکھ کر زائد مال بازار میں فروخت کر دے اور پھر اسے ذخیرہ اندوزی سے روک دیا جائے گا ۔ اور اگر دوبارہ اس نے ذخیرہ اندوزی کی تو اس کو قید و بند کی سزا کے ساتھ اور مناسب سزا بھی حاکم دے گا تاکہ وہ اس سے باز آجائے اور لوگ زحمت و تکلیف سے بچ جائیں ۔

دوسرے ائمہ بھی احتکار کی حرمت یا کراہت کے قائل ہیں ۔ البتہ جو کچھ اختلاف ہے وہ یہ کہ کن چیزوں میں اور کتنی مقدار میں احتکار جائز یا ناجائز ہے ۔ حنبلی فقہا کے نزدیک اگر تین شرطیں پائی جائیں تو احتکار حرام ہے ۔ ورنہ نہیں ۔ والاحتكار المحرم ما اجتمع فيه ثلاث شروط پہلی شرط یہ ہے کہ احتکار کرنے والے نے وہ چیز خرید کر رکھی ہو ۔ یعنی اگر اس نے محنت سے خود پیدا کیا ہو اور اس کی ضروریات سے زیادہ ہو اور اس نے اس خیال سے روک لیا ہو کہ ضرورت کے وقت بیچ دے گا ۔ تو وہ محتکر نہیں سمجھا جائے گا ۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یہ کھانے پینے کی بنیادی چیز ہو ۔

(حاشیہ صفحہ ۴۹) ابن ماجہ ، دارمی بحوالہ مشکوٰۃ ، اس سلسلہ میں متعدد احادیث صحاح میں بھی موجود ہیں مثلاً من احتكر فهو خاطئ (مسلم ، ابوداؤد) ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص گرانی پیدا کرنے کی کوشش کرے اللہ تعالیٰ پر ضروری ہے کہ اسے دوزخ کی ہولناک آگ میں ڈال دے ۔ (مسند احمد)

تیسری یہ ہے کہ اس کی خریداری کی وجہ سے بھاؤ چڑھ جائے اور لوگوں کو ضروریات پوری کرنے میں دقت محسوس ہونے لگے۔ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ غلہ وغیرہ ایسی جگہ روکا جائے جہاں لوگوں کو تکلیف کا اندیشہ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ پیسے والے اتنی زبردست خریداری کر کے ضروری چیزوں کا اسٹاک کر لیں کہ عام لوگوں کو آسانی سے وہ دستیاب نہ ہو سکے۔ (المغنی، ج ۴ ص ۲۴۲)

امام ابوحنیفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی چھوٹی بستی یا شہر میں احتکار کیا جائے تو اس کا اثر چونکہ پوری بستی پر پڑے گا اس لئے یہ ناجائز ہے لیکن اگر کسی بڑی جگہ پر دو ایک تاجروں نے ایسا کیا تو چونکہ اس میں عام ضرر کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں ہے، مگر دوسرے ائمہ اس کو مطلقاً ناجائز قرار دیتے ہیں، خواہ بڑی جگہ ہو یا چھوٹی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھاؤ بڑھانے کا سبب ہو اس کو بازار میں اپنا مال بیچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، امام صاحب نے چھوٹی جگہ کی قید صرف اس لئے لگائی ہے کہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے، اور بڑی جگہ میں یہ اندیشہ نہیں ہے، امام صاحب کے زمانہ میں رسل و رسائل اتنے وسیع نہیں تھے اس لئے انھوں نے مضرت کو ایک بستی پر محدود کر دیا، لیکن موجودہ دور میں اب ساری دنیا ایک محلہ بن گئی ہے، اور ایک ملک کی گرانی و ارزانی کا اثر دوسرے ملک پر اسی طرح پڑتا ہے، جس طرح پہلے زمانہ میں ایک محلہ کا اثر دوسرے محلہ پر پڑتا تھا، یا ایک بستی کا دوسری بستی پر، مثال کے لئے امریکہ میں اگر روئی گراں ہوتی ہے تو اس کا اثر فوراً اور پاکستان کی روئی کی منڈی پر پڑتا ہے، چنانچہ روزنامہ اخبارات میں اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں، اس لئے امام صاحب نے مضرت کی جو قید لگائی ہے اس کے تحت پوری دنیا کو اس کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے، یعنی چھوٹی بڑی جس جگہ بھی ذخیرہ اندوزی کی جائے گی وہ ضرر پہنچائے گی، اس لئے اس کو ممنوع قرار دیا جائے گا، البتہ اگر ذخیرہ اندوزی سے کوئی مضرت نہ ہو تو پھر یہ ممنوع نہیں ہے، خواہ چھوٹی جگہ ہو یا بڑی جگہ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں عام طور پر خوردنی چیزوں میں ذخیرہ اندوزی ہوتی تھی اس لئے انھوں نے قوت یعنی کھانے والی چیزوں میں احتکار کو ممنوع قرار دیا اور حدیث کا مصداق انہی اشیاء کو سمجھا ہے۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں طعام کا لفظ آیا ہے، مگر امام ابو یوسفؒ قاضی رہ چکے ہیں اور ان کو عملاً ان وقتوں کا تجربہ رہا ہوگا اس لئے انھوں نے ضروریات زندگی کی تمام چیزوں میں احتکار کو مکروہ قرار دیا ہے حدیث میں چونکہ مطلق احتکار کی ممانعت آئی ہے اس لئے انھوں نے اس کے مفہوم کو عمومیت دے دی غرض یہ کہ احتکار کے بنیادی تصور میں ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اس کی تعیین اور تحدید میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

امام ابن قیمؒ نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

فَإِنَّ الْمُحْتَكِرَ الَّذِیْ یَعْمَدُ إِلَی شِرَاءِ مَا یَحْتَاجُ إِلَیْهِ النَّاسُ مِنَ الطَّعَامِ یَحْبِسُهُ عَنْهُمْ یُرِیْدُ إِغْلَاءَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِعُمُوْمِ النَّاسِ وَحِیْنَئِذٍ لِوَلِیِّ الْأَمْرِ أَنْ یُکْرِهَ الْمُحْتَکِرِیْنَ عَلٰی بَیْعِ مَا عِنْدَهُمْ بِقِیْمَةِ الْمِثْلِ عِنْدَ ضَرُوْرَةِ النَّاسِ إِلَیْهِ

جو ذخیرہ اندوز ضرورت کی چیزیں خرید کر ان کا اسٹاک کرتا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو گراں بیچ کر فائدہ اٹھائے تو عوام کے لئے وہ ظالم ہے اس لئے حکومت کو چاہئے کہ اس کو زبردستی مجبور کر دے کہ اس مال کی جو مناسب قیمت ہو اس پر فروخت کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان ہی وجوہ کی بنا پر بازار کی خود نگرانی کرتے تھے اور عجمی تاجروں کو بازار میں اپنا غلہ بیچنے کی اجازت نہیں دیتے تھے غالباً اس کی دو وجہ تھی ایک یہ کہ وہ ان اخلاقی قدروں کا لحاظ نہ کریں گے جو اسلامی قانون تجارت کا جزو ہیں۔ دوسرے ان کی ذہنیت کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا

ہدایت | اپنی پیداوار کو اپنی ضرورت کے لئے روک رکھنا احتکار نہیں ہے بلکہ اس نیت سے روکنا کہ جب گرانی ہوگی تو بیچوں گا یا بازار میں قلت ہے اور مزید گرانی کے انتظار میں اپنی چیز روکے رکھنا یہ احتکار ہے اور یہ ناجائز ہے، حکومت اس کو بازار بھاؤ یعنی اپنے مقررہ بھاؤ پر بیچنے پر مجبور کر سکتی ہے۔[1]

[1] در المختار

(بقیہ رشحات)

کیونکہ گورنمنٹ کسی قوم کی مدد ایک محدود پیمانے پر ہی کر سکتی ہے۔ وہ تو صرف مسلم کالجوں اور اسکولوں کو کچھ منظوریاں ہی عطا کر سکتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ سرکاری امداد یافتہ اسکولوں کی تعلیم بالکلیہ غیر فرقہ پرستانہ ہونی چاہئے تاکہ مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کے رجحانات کا خاتمہ ہو یہ بھی ٹھیک ہے کہ نصابی کتابوں سے بھی مسلم دشمن پروپیگنڈے کی صفائی ہونی چاہئے۔ سکریٹری صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ ایک ایسا فورم قائم کیا جائے جہاں حکومت کے افراد، رضاکار تنظیمیں اور مسلم علماء مسلمانوں کی معاشی اور سماجی حالت پر تبادلہ خیال کر سکیں۔

(یو۔ این۔ آئی)

الرشاد کی ڈاک

آج سے پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ لار روڈ جاتے ہوئے چند گھنٹے کے لئے دارالعلوم مئو میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے ذمہ داروں نے راقم کو طلبہ کے سامنے کچھ کہنے کا موقع دیا۔ راقم الحروف نے بہت سی باتوں کے ساتھ امام ابویوسف کا یہ واقعہ بھی طلبہ کو سنایا کہ امام ابویوسف نے امام ابوحنیفہؒ کی اجازت کے بغیر جب اپنا الگ حلقۂ درس قائم کر لیا تو امام صاحب کو اس سے رنج ہوا انہوں نے ایک دن ایک شاگرد کے ذریعہ ان سے چار پانچ سوالات کرائے۔ وہ ان کا جواب نہ دے سکے۔ اس پر ان کو شرمندگی ہوئی اور امام صاحب کی خدمت میں پہنچ کر معذرت کی تو امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ "تزببت قبل أن تحصرم" یعنی تم انگور بننے سے پہلے منقی بن گئے۔ مئو سے جب لار پہونچا تو وہاں مولانا فتحپوری کے ایک مجاز صحبت مولانا افتخار الحق صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں ان پانچ سوالوں کا ذکر آگیا جو امام صاحب نے امام ابویوسف سے کرائے تھے انہوں نے اپنے والد مولانا عبدالغفار صاحب مرحوم متوفی سنہ ۱۳۳۱ھ جو ایک جید عالم تھے، کی کتاب غرائب البیان فی مناقب النعمان دکھائی۔ اس میں علامہ ابن نجیم کی کتاب "الاشباہ والنظائر" کے حوالے سے انہوں نے ان پانچوں سوالوں کا ذکر کیا تھا۔ میں نے وہ عبارت نقل کر لی۔ مگر اتفاق سے وہ تحریر کہیں ضائع ہو گئی۔ میں نے الاشباہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر عبارت نہ مل سکی۔ ادھر ایک سلسلہ میں ان سوالوں کی پھر ضرورت ہوئی تو جامعۃ الرشاد کے ایک سعادت مند سابق طالبعلم عزیزی محی الدین کے ذریعہ میں نے مولانا سے ان سوالوں کی دوبارہ تفصیل دریافت کی تو انہوں نے کرم فرما کر اپنے مشفقانہ مکتوب کے ساتھ وہ سوالات بھی نقل کر کے بھیج دئے۔ جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

محب مخلص، ذوالفہم والبصیرۃ اسعدکم اللہ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بندہ بفضلہ تعالیٰ مع الخیر ہے۔ خدا کرے آپ اور جملہ حضرات ہمیشہ عافیت سے رہیں۔ آپ کے محبت نامہ نے اس حدیث پاک کو مستحضر کر دیا جو کہ بندہ نے مسلم یونیورسٹی کی دیوار پہ کندہ دیکھا تھا جس کو تقریباً پندرہ بیس سال ہو رہے ہیں۔ جس کے الفاظ قلیل اور معانی کثیر ہیں اطلبوا العلم من المهد الی اللحد

سبحان اللہ، ماشاء اللہ، جزاک اللہ کہ چشم باز کردی بندہ کے والد ماجد صاحب جو ایک عجیب غریب مجمع البحرین مرجع العلماء، استاذ الاساتذہ - قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تلمیذ رشید تھے۔ آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیرت میں ایک طویل کتاب لکھی ہے اسمیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

اور یہ بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ لما جلس ابو یوسفؒ للتدریس من غیر اعلام ابی حنیفةؒ فارسل الیہ ابو حنیفةؒ رجلا فسألہ عن خمس مسائل۔ الاولیٰ - قصار جحد الثوب - وجاء بہ مقصورة هل یستحق الاجر ام لا - فاجاب ابو یوسفؒ یستحق الاجر - فقال لہ الرجل اخطأت - فقال لا یستحق فقال اخطأت ثم قال لہ الرجل ان کانت القصارة قبل الجحود استحق والا لا - الثانیة - هل الدخول فی الصلوٰة بالفرض ام بالسنة - فقال بالفرض فقال اخطأت - فقال بالسنة - فقال اخطأت - فتحیر ابو یوسفؒ - فقال الرجل بهما - لان التکبیر فرض - ورفع الیدین سنة - الثالثة طیر سقط فی قدر علی النار فیہ لحم ومرق - هل یؤکلان ام لا - فقال یؤکل فخطأه - فقال لا یؤکل فخطأه - ثم قال ان کان اللحم مطبوخا قبل سقوط الطیر - یغسل ثلاثا ویؤکل ویرمی المرقة - والا یرمی الکل - الرابعة مسلم لہ زوجة ذمیة ماتت وهی حامل منہ تدفن فی ای المقابر - فقال ابو یوسفؒ فی مقابر المسلمین فخطأه - فقال فی مقابر اهل الذمة فخطأه - فتحیر فقال تدفن فی مقابر الیهود لکن یحول وجهها عن القبلة حتی یکون وجہ الولد الی القبلة - لان الولد فی البطن یکون وجهہ الی ظهر امہ - الخامسة ام ولد الرجل تزوجت بغیر اذن مولاها فمات المولیٰ هل تجب العدة من المولیٰ فقال تجب فخطأه - فقال لا تجب فخطأه - ثم قال الرجل ان کان الزوج . . دخل بها لا تجب - والا وجبت - فعلم ابو یوسفؒ تقصیره فعاد الی ابی حنیفةؒ فقال تزببت قبل ان تحصرم کذا فی احیاء ات الفیض۔ (غرائب البیان فی مناقب النعمان صـ ۳۲-۳۳ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ)

بندہ آپ کا بیحد شکر گذار ہے کہ آپ نے اپنی علمی طلب پیاس میں سے ایک حصہ اس کو بھی عطا فرمایا۔

اعلی اللہ درجتکم وجعلکم من المقبولین ۔ فقط والسلام مع الاکرام

(مولانا) افتخار الحق عاجز اعجب جعفرا بازار گورکھپور

۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ

۵ اردسمبر پنجشنبہ

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ دامت فیوضکم

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ ماہنامہ جامعۃ الرشاد میں آپ کے قلم سے لکھا ہوا اداریہ پڑھکر آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا آپ کو مزید جرأت اور قوت بیان عطا کرے (آمین) ملکی اور غیر ملکی سیاست میں آپ کا بے لاگ تبصرہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے اور ہمارے ملی رہنماؤں کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔ اِدھر دو ماہ سے الرشاد کی کتابت و طباعت معیاری نہیں ہے آج کی دنیا میں کسی پرچے کی مقبولیت میں کتابت و طباعت کا خاص دخل ہے۔ خدا کرے الرشاد کو روز افزوں مقبولیت حاصل ہو۔ الرشاد کے سلسلے میں احقر کا مشورہ ہے کہ آپ ہر شمارے میں اسلامی معاشیات سے متعلق کوئی مضمون ضرور قلمبند کریں۔ خدا کا فضل ہے کہ اسلامی معاشیات پر آپ کا وسیع مطالعہ ہے اور آپ کے معاشیات سے متعلق مضامین کافی پسند کیے جاتے ہیں۔

۲۶؍ دسمبر سے جامعہ میں موسم سرما کی تعطیل ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ دسمبر کے اخیر میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔ فقط والسلام طالب خیر

ارشد سراج الدین خاں جامعہ سلفیہ بنارس

رام پور محترمی و مکرمی ۲۶؍۱۲؍۸۳

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

آپ کا گرامی نامہ ملا تھا اور فوراً میں نے مینجر صاحب زندگی کو دہلی خط لکھ دیا تھا کہ آپ کو وہ ۱۹۸۳ء کے تمام شمارے بھیج دیں۔ مولانا! میں آپ کے رسالے کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ ندامت ہے کہ ماہنامہ زندگی آپ کو نہیں ملا۔ اِدھر تو میرے الرشاد مجھے نہیں ملا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زندگی نہ جانے کی وجہ سے اس کو میرے نام بند کر دیا گیا ہو! مہربانی کر کے بھجوا دیجئے تبادلے میں انشاء اللہ زندگی رسالہ آپ کو ملتا رہے گا۔ فقط

والسلام

(مولانا) عروج قادری (صاحب مدظلہٗ)

نئی کتابیں

تبصرہ:۔ اختر حسین نیپالی

تحفۃ اہل الفکر فی مصطلح اہل الأثر

از مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری ۔ صفحات ۴۰ ۔ کتابت و طباعت معیاری ٹائپ میں۔ قیمت للعہ، پتہ:۔ مکتبہ رحمانیہ ثانی پورہ مبارکپور۔ ضلع اعظم گڈھ ۔ (یوپی)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ اور محترم مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی شارح مشکوۃ کے صاحبزادے ہیں۔ جو فراغت کے بعد ہی سے اپنے والد محترم کی زیر ترتیب شرح مشکوۃ کے شریک کار بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اصول حدیث پر یہ مختصر رسالہ عربی زبان میں مرتب کر دیا ہے۔ جس میں اصول حدیث سے متعلق جتنی ضروری معلومات ہیں اختصار کے ساتھ وہ سب جمع کر دی ہیں۔ جن اصطلاحات میں قدرے اختلاف ہے اس میں انہوں نے جمہور کا مسلک اختیار کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا رسالہ عجالہ نافعہ اور بستان المحدثین کے ساتھ یہ رسالہ نخبۃ الفکر اور مقدمہ ابن صلاح سے پہلے پڑھا دیا جائے تو اس فن کی اونچی کتابوں کے مباحث سمجھنے میں طلبہ کو بڑی آسانی ہو جائے گی۔ امید ہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں یہ مفید رسالہ ضرور قبول کر لیا جائے گا۔

ردِّ ایصالِ ثواب

از عبدالخالق اعظمی صاحب۔ صفحات ۱۶۰ ۔ سائز ۱/۲ کتابت و طباعت معیاری قیمت ۲/- ملنے کا پتہ: قاسمیہ لائبریری ۔ مبارکپور۔ اعظم گڈھ (یوپی)

عبدالخالق اعظمی صاحب جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مگر اردو کے واسطے سے اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کا انہوں نے وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اردو زبان کے لکھنے پر بھی انہیں پوری قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ جو قابل ستائش ہے۔ اس کتاب میں مروجہ ایصال ثواب کے طریقہ پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ بدنی عبادات کا ثواب مردوں تک پہونچانا کتاب و سنت یا صحابہ کے عمل سے ثابت نہیں ہے اس ضمن میں انہوں نے مردہ کی طرف سے حج بدل اور قربانی کو بھی کتاب و سنت کے خلاف بتایا ہے۔

عبدالخالق صاحب نے ان مسائل کے بارے میں ایک استفتا حنفی اور اہل حدیث علماء کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مولوی صفی الرحمٰن صاحب نے جو خط مرتب کتاب کو لکھا ہے اسے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اگر اہلحدیث حضرات نے اپنے علم و فضل کی مسند ایسے ہی سطحی اور زبان و قلم کے غیر ذمہ دار آدمی کے سپرد کی ہے تو اس مسند سے فتنہ ہی پرورش پائے گا۔ دوسرا جواب مولوی جمیل احمد صاحب نذیری نے دیا ہے جس کے جواب میں یہ پوری کتاب لکھی گئی ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب ایک مناظرانہ کتاب بن گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف اپنی انتہا پسندی میں اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ ایصال ثواب کی حیثیت مردہ کے لئے استغفار ہی کی ہوتی ہے جس کے وہ خود بھی قائل

ہیں۔ اور قرآن و حدیث سے استغفار زندہ اور مردہ دونوں کیلئے ثابت ہے! اور یہ استغفار ایک بڑی عبادت ہے۔ اس لئے مردہ کیلئے نفس ایصال ثواب کا انکار سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی طرح حج بدل اور قربانی کا ثواب اگر وصیت اور مندکے ایفاء سے پہنچتا ہے تو تبرعاً کرنے میں کون سا شرعی مانع کھڑا ہو جاتا ہے جس پر آپ اس شد و مد سے انکار کرتے ہیں۔ البتہ جو ایصال ثواب کے مروجہ طریقے رائج ہو گئے ہیں* وہ قابل گرفت ضرور ہیں۔ مگر سرے سے اس کا انکار کرنا ان کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے عام طور پر خود رو مصنفین جب دینی مباحث پر لکھتے ہیں تو اسی طرح کی اپچ سے کام لیتے ہیں اور بہت سی بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق دینے کی صلاحیت سے وہ محروم ہوتے ہیں اسی لئے غلام جیلانی برق وغیرہ کی طرح شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور احادیث کا انکار شروع کر دیتے ہیں جیسا کہ مرتب کتاب نے بھی اپنے بارے میں لکھا ہے۔ بہرحال ہم اس مناظرے سے

* اور الٹنگ سے غیر عبادات تصورات وابستہ ہو گئے ہیں

۲ مثل ...

کریمی پبلیکیشن ۴۲۶۔ شاہ گنج کی شائع کردہ کتابیں

۱۔ اخلاقی مسائل اور ہم عوام۔ — ۲۔ غصہ اور اس کا علاج

〃 مولفہ سید معروف حسین صاحب — 〃 حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

۳۔ معراج الرسول — ۴۔ گناہ بے لذت

〃 سید جلال الدین احمد جعفری — 〃 مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

۵۔ رسول اکرمؐ — ۶۔ سیرت اصحاب

〃 مولانا عمار احمد صاحب — 〃 سید جلال الدین احمد جعفری

دوسری کتابوں کے ساتھ مولانا تھانویؒ کی کتابوں کو جس اہتمام سے کریمی پبلیکیشنز نے شائع کیا ہے اس سے پہلے کسی نے نہیں شائع کیا۔

۷۔ آداب زندگی مولفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ — ۸۔ جزاء الاعمال مولفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ

۹۔ تعلیم الدین 〃 — ۱۰۔ فروع الایمان 〃 〃

۱۱۔ تسہیل قصد السبیل 〃 — ۱۲۔ اصلاحی نصاب 〃 〃

یہ مولانا تھانوی کی نو کتابوں پر مشتمل ہے، مثلاً جزاء الاعمال، حیات المسلمین، حقوق اسلام، آداب المعاشرت، تعلیم الدین اور اغلاط العوام وغیرہ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ایمان میں تازگی، آخرت کا خوف اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی اہمیت دل میں ابھرتی ہے، یہ کتابیں عام لوگوں کو اہتمام سے پڑھ کر سنانا چاہئے یہ مجموعہ شائع کر کے ؟ کریمی صاحب نے ایک مفید کام کیا ہے۔
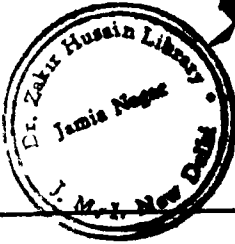
Regd. No. R. N. 38937/81 Phone:-461

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب جونیئر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجامعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ڈیڑھ درجن سے زیادہ لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ دو لاکھ روپیے سے زیادہ ہے،

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں، اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہوں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵/ جون کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔

۸۱۰ • مارچ و اپریل سنہ ۹۸۴

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمۃ جامعۃ الرشاد اعظمگڑھ

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

فارم چہارم، قاعدہ نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت	رشاد نگر اعظم گڈھ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہانہ
(۳) طابع کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی
قومیت	ہندوستانی
(۴) ناشر کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی
سکونت	رشاد نگر اعظم گڈھ
(۵) ایڈیٹر کا نام	مولانا مجیب اللہ ندوی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	رشاد نگر اعظم گڈھ
(۶) ملکیت	جامعۃ الرشاد ایجوکیشنل سوسائٹی رشاد نگر اعظم گڈھ

میں مجیب اللہ ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع وناشر

مجیب ندوی

(مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر وپبلشر وایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپا کر دفتر جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر اعظم گڈھ سے شائع کیا۔)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 24/=
چندہ ششماہی = 12
قیمت فی پرچہ 2-50

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد
جامعۃ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/=

جلد ۷ | مارچ واپریل ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الاخریٰ و رجب ۱۴۰۴ھ | شمارہ ۳۴

فہرست مضامین

مجلس ادارت

خدا کا شکر ہے کہ ماہنامہ جامعۃ الرشاد اپنی عمر کے چوتھے سال میں داخل ہوگیا۔ اس تین برس کی مدت میں متعدد پرچے ہمیں دو ماہ کے ایک ساتھ شائع کرنے پڑے، اس کے باقاعدگی سے نہ شائع ہونے میں مالی دقت کے ساتھ کتابت وطباعت کی دقتیں برابر پریشان کن بنی رہیں ہم اس کے لئے خدا تعالےٰ کے سامنے سراپا سپاس ہیں کہ اسکی تعداد اشاعت برابر بڑھ رہی ہے اور جدید وقدیم دونوں طرح کے تعلیم یافتہ حضرات اس کی قدر دانی سے ہماری عزت افزائی کر رہے ہیں، مگر اب بھی ادارہ کو دو تین سو روپئے ماہوار کا خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، ہم اپنے ہمدردوں اور قدردانوں سے یہ دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اگر کم سے کم ایک خریدار اپنی طرف سے کوشش کرکے پیدا کردیں تو نہ صرف ادارہ خسارہ سے بچ جائے گا بلکہ ہم پرچے کو اور زیادہ معیاری بنا سکیں گے۔

بعض اکابر کے نام پرچہ اعزازی طور پر جاتا ہے ان میں ایک بڑی تعداد کو ہم نے پرچہ بھیجنا بند کردیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ کچھ حضرات چھوٹوں کیطرف سے نیازمندی کی عزت افزائی کو اپنا ایسا حق سمجھتے ہیں جس کے ساتھ وہ کسی تشکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے،

راقم الحروف نے ایران وعراق کے جنگ کے سلسلہ میں اب تک جو کچھ لکھا تھا اسمیں یہ پہلو پیش نظر تھا کہ اس سے مسلمانوں کی طاقت بلاوجہ برباد ہو رہی ہے یہ طاقت اگر اسرائیل کے مقابلہ میں خرچ ہوتی تو مشرق وسطی کا مسئلہ حل ہوجاتا،

مگر ادھر عراق نے جو کیمیاوی اسلحے استعمال کئے ہیں اور یو۔ این۔ او کی طرف سے اس کی تحقیق کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے یہ تصدیق کردی کہ واقعی عراق نے یہ شنیع حرکت کی ہے، مگر اس کے باوجود سلامتی کونسل اس لئے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاسکی کہ امریکہ [illegible]س اور فرانس تینوں عراق کے ہمنوا ہیں اور اسمیں رکاوٹ بن رہے ہیں،

اب قابل غور بات یہ ہے کہ روس امریکہ اور فرانس تینوں نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کے مخالف ہیں مگر اسرائیل کے سلسلہ میں اور ایران و عراق کے جنگ کے سلسلے میں کیوں سب متفق الرائے ہو گئے ہیں۔

علامہ خمینی جو ایران میں موجودہ انقلاب کے سربراہ ہیں، ان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک مذہبی دوسری سیاسی، مذہبی حیثیت سے ہمیں ان کے عقائد اور خیالات سے اتفاق نہیں ہے مگر ان کی سیاسی قوت سے کوئی آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر اس نے انتہائی پائدار حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اور اس نے نہ تو ہمیں روس سے مدد لی اور نہ امریکہ سے۔ دنیا کی ان بڑی حکومتوں نے ایران کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کر رکھا ہے آخر اس میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک صرف اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سیاسی انقلاب کو ایک اسلامی انقلاب سمجھتے ہیں۔ روس کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اگر اس کے پڑوس میں کوئی اسلامی بیداری پیدا ہوئی تو اس سے مسلمانوں کی ان متعدد جمہوریتوں میں جن پر روس نے اپنے جبر کا پنجہ گڑا رکھا ہے، کوئی بیداری نہ پیدا ہو جائے، اسی لئے اس نے افغانستان کو دبوچ رکھا ہے اور پاکستان کو کمزور کرنے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے شاہ کی حکومت اسی کے سہارے قائم تھی اور اس انقلاب کے بعد مشرق وسطیٰ میں اپنی ساکھ کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عراق کا ساتھ دے فرانس کا معاملہ بھی بین بین کا ہے یہ حکومتیں ایران سے اس لئے خار کھائے بیٹھی ہیں کہ ظاہری طور وہ اسلام کا علمبردار ہے اور ان تمام حکومتوں کی اسرائیل سے اس لئے دوستی ہے کہ وہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

جو حضرات خمینی کی مخالفت اس کی شیعیت کی وجہ سے کرتے ہیں ان سے عرض ہے کہ عراق کی ملحد حکومت جو صدام حسین کی سربراہی میں چل رہی ہے وہ اسلام کی بنیادی قدروں کو بھی اکھاڑ دینے کی فکر میں ہے الکفر ملۃ واحدۃ کے تحت اسی لئے ساری غیر اسلامی حکومتیں اس کی ہم نوائی کر رہی ہیں۔ اور ایران کی موجودہ حکومت کا ظاہری ڈھانچہ بہرحال ہمارے لئے نہ سہی دنیا اسے ایک اسلامی حکومت سمجھتی ہے۔ اس لئے یہ حکومتیں اس کی

مخالفت کر رہی ہیں۔ کاش ایران کی طرح عربوں کی حکومتیں بھی روس اور امریکہ دونوں سے
اپنے کو بے نیاز کرلیتیں تو وہ خود ان کی نیازمندی پر مجبور ہوجاتے[۲] گو ہماری موافقت اور
مخالفت کا ان پر کیا اثر پڑ سکتا ہے مگر ہندوستان کے مسلمان جو اسلامی ممالک کے معاملہ میں ہمیشہ
سے حساس رہے ہیں اسلئے ان سے عرض ہے کہ وہ اپنی اخلاقی ہمدردی یا عام ہمدردی کو عدل کے
ترازو میں تولنے کی کوشش کریں۔

اس جنگ کے ختم نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ بڑی حکومتیں ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح
ہے کہ خمینی کی ضد نے اسے اتنا طویل کر دیا ہے۔ ورنہ عراق کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا
اور وہ صلح پر آمادہ تھا مگر اب ان حکومتوں کی پشت پناہی کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تباہی
کہاں تک پہونچے گی کاش یہ حکومتیں بڑی طاقتوں کی سازش اور فریب کاری کو پورے طور پر
محسوس کرلیتیں تو نہ صرف ان کی بچی کچی فوجی طاقت محفوظ ہو جاتی بلکہ مالی تباہی کے
ساتھ ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ان کا دامن مزید داغدار نہ ہوتا۔

[۲] ..... لیکن یہ اپنی سیاسی مصلحت کی وجہ سے کسی نہ کسی بڑی طاقت کی ہاں رسی میں لگی ہوئی ہیں

اس سے یہ بالکل نہ سمجھا جائے کہ ہم خمینی صاحب کے ہمنوا ہیں بلکہ اس کا مقصود
یہ ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اپنی اسلام دشمنی میں صدام حسین کا ساتھ دے رہی ہیں
اور ایران کو اس کی ظاہری اسلام پسندی کی وجہ سے کمزور کرنا چاہتی ہیں۔
اوپر ہم عرض کر چکے ہیں خمینی کی سیاسی قوت اور بڑی طاقتوں سے عدم مرعوبیت کے
ہم مداح ہیں۔ نہ ان کی مذہبی حیثیت سے ہمیں شدید اختلاف ہے ابھی عربی میں ایک کتاب
"سراب فی ایران" آئی ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ائمہ معصومین
کو انبیاء اور ملائکہ سے بھی افضل سمجھتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک اس کتاب کو پڑھنے
کے بعد تو ان کو دائرہ اسلام میں رکھنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے مگر یہ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے اسلام
دشمن طاقتوں کے مقابلہ میں ہمیں ایران کو سیاسی حیثیت سے کمزور نہ کرنا چاہئے اس سے نہ
صرف ہماری ساکھ گر جائے گی بلکہ سب سے بڑے دشمن اسرائیل کو ہم طاقت پہنچائیں گے جیسا کہ لبنان
کے سلسلے میں اس سے پہلے عربوں نے غلطی کی تھی۔ بقیہ صفحہ ۴۵ پر

از محمد مجیب اللہ ندوی

عربی زبان میں حدیث کے لفظی معنی بات چیت کے ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ لفظ ایک خاص اسلامی اصطلاح بن گیا ہے اور اس کے معنی میں بہت وسعت بھی آگئی ہے۔ اور وہ ایک خاص معنی میں محدود بھی ہوگیا ہے اسلامی اصطلاح میں جب بھی حدیث نبوی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا اطلاق عام طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، احوال اور اخلاق و سیرت سب پر ہوتا ہے، مگر دوسری تیسری صدی میں سنت نبوی، حدیث نبوی اور سیرت نبوی کی الگ الگ اصطلاحیں بن گئیں۔ سنت[1] نبوی اور حدیث نبوی سے عام طور پر وہ احادیث مراد لی جاتی ہیں جن کا تعلق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپکی مبارک عملی زندگی سے ہے۔ اور سیرت[2] نبوی سے مراد وہ احادیث ہوتی ہیں جو آپ کے شخصی اور ذاتی حالات سے متعلق ہیں۔ اسی سیرت کا ایک شعبہ شمائل نبوی ہے۔ جس میں آپ کے عادات مبارکہ فضائل کریمہ اور جسم اطہر کے ایک ایک حصہ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ حدیث نبوی کے موضوع پر جو کتابیں اس وقت موجود ہیں ان میں آپ کے وہ ارشادات بھی ملیں گے جو آپ نے قرآن پاک کے کسی حکم کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمائے ہیں، یا اس کی روشنی میں کوئی نیا حکم فرمایا ہے۔ اور ان میں آپکی عملی زندگی کا خاکہ

---

[1] حدیث و سنت کی اصطلاح مترادف بھی استعمال ہوتی ہے اور اس میں کبھی کبھی فرق بھی کیا جاتا ہے سنت کے مفہوم میں خلفاء راشدین کے تعامل کو بھی شامل سمجھا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین [2] اب سیرت نبوی ایک مستقل فن ہوگیا ہے، اسی کو ایک حصہ کتاب السیر والمغازی کہلاتا ہے۔ مگر ابتدا میں یہ حدیث نبوی کے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھی۔

بھی ملے گا جو ہمارے لئے اسوہ بھی ہے اور قانون بھی، اور پھر ان میں آپ کی حیات طیبہ کے ذاتی اور انفرادی حالات، عادات و اخلاق اور سیرت و شمائل، دعوت و تبلیغ اور غزوات کی تفصیل بھی ملے گی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ عہد صحابہ تک حدیث نبوی کی حیثیت ایک فن کی نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ صحابہ آپ سے جو چیز بھی نقل کرتے تھے اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر بعد کی صدیوں میں روایت حدیث میں یہ احتیاط باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ اس کو ایک اعزاز سمجھ کر بہت سے نا اہل بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اس لئے ائمہ حدیث کو اس کے لئے روایت و درایت کے کچھ قاعدے اور ضابطے بھی مقرر کرنے پڑے اور کچھ اصطلاحیں وضع کرنی پڑیں اور حدیث نبوی کے مختلف گوشوں پر الگ الگ بحث ہونے لگی۔ اس طرح اب اس فن کے مختلف شعبے ہو گئے اور ہر شعبہ نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ مثلاً فن اسماء الرجال، فن اصول حدیث، فن سیر و مغازی اور شمائل نبوی وغیرہ نے علیحدہ علیحدہ فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث نبوی کے سلسلہ میں عربی فارسی، اردو یا کسی اور زبان میں جو کام ہوا ہے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہندوستان میں علم حدیث کے موضوع پر عربی فارسی یا اردو میں ان کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی فہرست تیار کرنی ہو تو یہ کام قدرے آسان ہے مگر حدیث کے مختلف گوشوں پر ان زبانوں میں وسیع پیمانہ پر جو کام ہوا ہے اس کا احاطہ کرنا اور تحقیقی طور پر اس پر لکھنا ذرا مشکل کام ہے اور اس کے لئے وقت درکار ہے۔

مگر مختصر طور پر اس موضوع کا جتنا احاطہ ممکن تھا، وہ اس مقالہ میں پیش خدمت ہے مگر موضوع کی تفصیل سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج و ترقی کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے،

ہندوستان میں علم حدیث

مسلمان اپنے وطن سے نکل کر خواہ تاجر کی حیثیت سے یا فاتح کی حیثیت سے جس ملک میں گئے وہ اپنے ساتھ قرآن و حدیث اور اپنی مذہبیات و تہذیب بھی لے گئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ پہلی صدی ہجری سے شروع ہو گیا تھا موجودہ تاریخوں سے یہ سراغ تو نہیں ملتا کہ پہلی صدی ہجری میں یہاں حدیث نبوی کا کتنا چرچا رہا اور اس کے کون سے مراکز تھے حتیٰ کہ جو علمائے حدیث ابتدائی صدیوں میں ہندوستان آئے یا انہوں نے یہاں رہ کر علم حدیث میں کوئی نمایاں مقام حاصل کیا ان کے حالات سے بھی اس سلسلہ میں کچھ زیادہ تفصیلات تو نہیں ملتیں مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ یہاں اس فن کا رواج ضرور ہوا ہوگا مثلاً ربیع بن صبیح السعدی متوفی ۱۶۰ھ

ابو معشر نجیح سندھی متوفی ۱۷۰ھ رجاء سندھی متوفی ۲۲۱ھ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے اور ربیع بن صبیح سعدی بصری تابعی بزرگ ہیں جو ۱۶۰ھ میں ایک اسلامی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ عام طور پر تذکروں میں ان کا ذکر ایک محدث کی حیثیت سے آتا ہے، ان کے بارے میں تذکرہ نویس یہاں تک لکھتے ہیں کہ یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے عہد اسلامی میں تدوین حدیث کے کام کی ابتدا کی۔

هو اول من صنف وبوب فی الاسلام (کشف الظنون) — وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلے تصنیف اور تدوین کا کام شروع کیا۔

گو ابو معشر نجیح سندھی الاصل تھے اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے اور حدیث میں کمال حاصل کیا خاص طور پر سیر و مغازی پر اپنی تحریری یادگار بھی چھوڑی[1]۔ اسی طرح رجاء سندھی نے فن حدیث میں کمال پیدا کیا ان کے بارے میں مشہور امام حدیث حاکم لکھتے ہیں۔

رکن من ارکان الحدیث — یہ حدیث کے ارکان میں سے ایک رکن تھے۔

(تہذیب التہذیب)

پہلی صدی سے چوتھی صدی ہجری تک حجاز، مصر، شام، عراق، ایران، خراسان اور ماوراء النہر کے قریہ قریہ میں حدثنا و اخبرنا کی آواز سنائی دیتی نظر آئے گی۔ مگر ہندوستان میں چوتھی صدی تک علوم دینیہ اور خاص طور علم حدیث کا کوئی ایسا رواج عام نظر نہیں آتا جس کا ذکر تفصیل سے تاریخوں میں مل سکے پانچویں صدی کے شروع میں شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ (جن کے ہاتھ بے شمار آدمی مسلمان ہوئے تھے) کا نام تذکروں میں ملتا ہے کہ وہ عہد غزنوی میں لاہور تشریف لائے اور حدیث و تفسیر کو یہاں رواج دیا۔ تذکرہ علمائے ہند میں ہے

اول کسے کہ علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آورد — پہلے شخص ہیں جو لاہور (پنجاب) میں علم حدیث و تفسیر اپنے ساتھ لائے

مگر یہ تفصیل نہیں ملتی کہ وہ اپنے ساتھ حدیث کی کون کون سی کتابیں لائے اور پھر اس کا دائرہ کتنا وسیع ہوا ان کے بعد ایک مدت تک علم حدیث کے سلسلے میں تاریخوں اور تذکروں میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ اس علم سے کتنا اعتنا کیا گیا، ڈیڑھ صدی کے بعد پھر امام حسن بن محمد صغانی متوفی ۶۵۰ھ صاحب مشارق الانوار

---

[1] ابن سعد ج ۵، ق ۲ ص ۳۰

کا نام آتا ہے جن کی کتاب مشارق الانوار حدیث کی پہلی کتاب ہے جو ہندوستان کے مدارس دینیہ کے نصاب میں داخل کی گئی اور عہد تیموری سے پہلے یہ تنہا حدیث کی کتاب تھی جو ہندوستانی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھی، مصنف مصنف مشارق الانوار نے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قولی حدیثوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کیا تھا، آگے ذکر آئے گا کہ بعد میں فقہی ابواب کے مطابق اس کی ترتیب کردی گئی اور یہ کام ہندوستان ہی میں ہوا۔ مشارق الانوار کے ساتھ کہیں کہیں امام بغوی متوفی ۵۱۶ھ کی کتاب المصابیح کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کتاب المصابیح گو امام صنعانی کی مشارق الانوار سے پہلے لکھی گئی مگر چونکہ امام صنعانی ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اپنی کتاب بغداد میں مکمل کی اس لئے ابتدا میں اس کی شہرت عرب و ہند دونوں جگہ کتاب المصابیح سے زیادہ ہوئی، اسی مشارق الانوار کا درس حضرت نظام الدین اولیاء نے شیخ کمال الدین سے لیا تھا۔

مغلوں کی حکومت سے پہلے جتنا رواج فقہ، اصول فقہ، منطق و فلسفہ اور صرف و نحو کا تھا اس کے مقابلہ میں علم حدیث کا رواج برائے نام نظر آتا ہے خاص طور پر صرف و نحو کے بعد سب سے زیادہ زور فقہ جسے عام طور پر علم دانائی کہا جاتا تھا پر دیا جاتا تھا، چنانچہ یہ شعر ہر طالب علم کی زبان پر ہوتا تھا۔

کافیہ با شافیہ تلخیص با حسامی
ایں چار کتب یاد کنی ملا شوئی

ہندوستان میں علم حدیث کا عام رواج

ہندوستان میں علم حدیث کا عام رواج حقیقت میں نویں اور دسویں صدی سے شروع ہوا، ایک طرف امام سخاوی متوفی ۹۰۲ھ کے کئی شاگردوں نے ہندوستان میں اس فن کو رواج دیا تو دوسری طرف ابن حجر مکی متوفی ۹۷۳ھ کے متعدد شاگردوں نے ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا کیا اور پھر اسی عہد میں ہندوستان کے نامور محدث شیخ علی متقی پیدا ہوئے، شیخ علی متقی متوفی ۹۷۵ھ اور ان کے کئی لائق شاگرد مثلاً شیخ عبدالوہاب متقی متوفی ۱۰۰۱ھ، شیخ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ صاحب مجمع بحار الانوار، اور شیخ عبداللہ بن سعد الدین کی وجہ سے درس حدیث کا یہاں عام رواج ہوا اور ہندوستان میں سب سے پہلے صحیحین وغیرہ کا درس انفرادی طور پر انہی بزرگوں نے شروع کیا، انہی علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ تھے جن کے بارے میں اہل تذکرہ لکھتے ہیں۔

اول کسے کہ تخم حدیث در ہند
کشت او بود

پہلے شخص جنہوں نے ہندوستان میں حدیث کا
بیج بویا وہ یہی تھے۔

گو ان کے بارے میں یہ مقولہ بالکلیہ صحیح نہیں ہے مگر اس میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ دوسرے بزرگوں

کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان سے باہر گذرا اور شیخ دہلوی کی پوری زندگی ہندوستان میں علم حدیث کے پھیلانے میں صرف ہوئی شیخ علی متقی کی کنز العمال جو حدیث نبوی کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور شیخ طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار لغات حدیث پر مجدالدین ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ کی کتاب نہایہ فی غریب حدیث والآیۃ کے بعد دوسری جامع کتاب ہی نہیں بلکہ حدیث کے الفاظ کی بہترین شرح بھی ہے مگر شیخ عبدالحق دہلوی اور ان کے صاحبزادگان نے اس سلسلہ میں درس و تدریس کے ساتھ جو تصنیفی یادگاریں چھوڑی ہیں وہ بھی کم قیمتی نہیں ہیں اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پہلے یہاں صرف حدیث کی کتابوں میں مشارق الانوار کے پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا اور کہیں کہیں امام بغوی کی کتاب مصابیح کا بھی ذکر مل جاتا ہے، احمد بن حلق کے بارے میں یہ ذکر تاریخوں میں ملتا ہے کہ اس نے خلافت عباسی سے اپنا حلق قائم رکھا تھا اور جب وہ لوگوں سے بیعت لیتا تو خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ بھی سامنے رکھتا تھا، شیخ عبدالحق دہلوی پہلے شخص ہیں جو عرب سے مشکوٰۃ شریف موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم حدیث کی بعض اور دوسری کتابوں کے نسخے اپنے ساتھ لائے۔ اور باقاعدہ درس میں داخل کیا ان سے پہلے کہیں کہیں صحاح ستہ اور بخاری شریف اور مشکوٰۃ اور کہیں بعض دوسری کتابوں کے انفرادی طور پر پڑھنے پڑھانے کا ذکر ملتا ہے مگر ان کتابوں کے باقاعدہ درس و تدریس کا رواج نہیں ہوا تھا، یہ رواج عام شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذات سے ہوا، شیخ محدث دہلوی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ شاید سب سے پہلے انہوں نے عربی کے ساتھ فارسی میں جو اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان تھی مشکوٰۃ شریف کی شرح شعۃ اللمعات لکھی اور سیرت میں مدارج النبوۃ تصنیف کی اور علامہ مجدالدین فیروزآبادی کی کتاب سفر السعادۃ کی فارسی شرح کی جس کی وجہ سے حدیث کا علم ہندوستانی مسلمانوں کے عام تعلیم یافتہ افراد تک پہنچا، پھر ان کے صاحبزادے مولانا نورالحق محدث دہلوی نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور انہوں نے بھی فارسی زبان میں بخاری شریف کی شرح تیسیر الباری لکھی شیخ محدث دہلوی نے حدیث نبوی اور سیرت نبوی کے ترویج کا جو کام شروع کیا تھا حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ نے سے اختتام تک پہنچایا نہ صرف اس خانوادہ کی وجہ سے صحاح ستہ اور امام مالک کی موطا بلکہ حدیث کی بے شمار کتابیں یہاں رواج پذیر ہوئیں،

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علماء کی درس و تدریس کی مجلسوں کے ذریعہ علمی حیثیت سے جس طرح حدیث نبوی اور سیرت نبوی کی خواص میں ترویج ہوئی اسی طرح متبع سنت[1] صوفیہ کی مجلسوں اور ان کی عملی زندگی سے حدیث نبوی اور سیرت نبوی کی کافی اشاعت ہوئی خاص طور پر حضرت زکریا ملتانی نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین

---

[1] یہ قید اسلئے لگا دی گئی ہے کہ غیر متبع سنت صوفیا کی وجہ سے بے شمار بدعت بلکہ شرکیہ باتیں ہندوستان میں رواج پذیر ہوئیں۔

یحییٰ منیریؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ملفوظات اور مکتوبات میں ہزاروں احادیث نبوی کا حوالہ ملتا ہے۔

غیاث الدین تغلق کے عہد میں حضرت نظام الدین اولیاء سے سماع کے سلسلہ میں علماء سے جو مناظرہ منسوب ہے اس کی تفصیل میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ حضرت شیخ جب کوئی حدیث نبوی پیش کرتے تھے تو علماء ان سے فقہ حنفی کا جزیہ طلب کرتے تھے علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں مولانا شمس الدین ترک ایک مصری محدث ملتان تک آکر واپس چلے گئے اور ایک رسالہ لکھ کر بادشاہ کو بھیج دیا جس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ہندوستان میں علم حدیث کی طرف اعتنا نہیں ملتا ہے۔ ان واقعات سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ان کوششوں کی اہمیت کا کچھ اندازہ ضرور ہوگا جو انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج کے سلسلہ میں کی تھیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نظام الدین سہالویؒ نے جو نصاب تعلیم مرتب کیا تھا اور جو آج تک درس نظامیہ کے نام سے مدرسوں میں جاری ہے اس میں مشکوٰۃ کے علاوہ حدیث کی کوئی دوسری کتاب نظر نہیں آتی البتہ ان کے بعد ملا بحر العلوم نے علم حدیث کو کافی فروغ دیا ہندوستان میں اس وقت علوم دینیہ خاص طور پر حدیث نبوی اور سیرت نبوی سے جو شغف اور قال اللہ اور قال الرسول کی جو آواز سنائی دیتی ہے اس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے صاحبزادگان اور پھر اس خانوادہ کے تلامذہ کا سب سے بڑا حصہ ہے، ان کی بیش قیمت تصانیف، ان کے درس و تدریس کی مجلسوں کے ذریعہ یہ روشنی شہر شہر اور قصبہ قصبہ پہنچی اور پھر اسی خانوادہ کے علماء نے سب سے پہلے اردو زبان کو اپنے اظہار بیان کا ذریعہ بنایا اس لئے حدیث و سیرت کا ذخیرہ اردو زبان میں منتقل ہونے لگا، حدیث کی مشہور چھ کتابیں جسے صحاح ستہ کہا جاتا ہے اس کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی اسی خانوادہ کے ذریعہ ہوا، شاہ صاحب نے صحاح ستہ میں، موطا امام مالکؒ کی جو حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہے ابن ماجہ کی جگہ داخل کیا تھا مگر بعد میں غالباً میاں نذیر حسین صاحب نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو داخل کر دیا اور وہ آج تک داخل ہے اس خانوادہ کے چشم و چراغ مولانا اسمٰعیل شہید ۱۲۴۶ھ تقویۃ الایمان تصنیف کی، تقویۃ الایمان گو عقیدہ کی کتاب مگر غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں بے شمار احادیث نبوی کا آسان اردو زبان جسے اس وقت ہندی کہا جاتا تھا میں ترجمہ کیا گیا ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شاید اردو زبان میں [1] موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ تقویۃ الایمان کے ساتھ مولانا خرم علی بلہوری متوفی ۱۲۷۳ھ کی نصیحۃ المسلمین بھی ایک زمانہ میں مقبول عام کتاب تھی جس میں تقویۃ الایمان ہی کے طرز پر بے شمار حدیثوں کی روشنی میں

---

[1] ہندوستانی مسلمانوں میں شرک و بدعات کے عام رواج کے جو دوسرے اسباب ہیں اس میں ایک بڑا سبب حدیث نبوی کی طرف سے اعتنائی بھی ہے۔

شرک بدعت کی تردید کی گئی ہے ایک زمانہ میں ان کی نظم تو بچے بچے کی زبان پر تھی جس کا ایک ایک شعر یہ ہے۔

خدا فرما چکا قرآن کے اندر ٭ میرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

راقم بچپن میں اپنے گھر میں بھی اس نظم کا بہت چرچا سنا تھا،

تیرھویں صدی کے شروع تک علماء یا تو عربی زبان میں تالیف، تصنیف اور تحلیقات، حواشی لکھتے تھے یا پھر فارسی زبان میں تیرھویں صدی سے پہلے اردو ئے معلی کو شاعری کی حد تک عوام اور خواص سب نے قبول کر لیا تھا مگر اردو نثر میں ابھی کوئی علمی کتاب لکھنے کو کمتر درجہ کی بات سمجھی جاتی تھی، چنانچہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ کے ترجمے قرآن کو بھی ایک مدت تک اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا مگر آہستہ آہستہ دینی حلقوں میں اسے جگہ ملنے لگی اور اس کے ذریعہ اردو زبان ایک علمی زبان بننے لگی اور علم و فن کی کتابیں اس میں لکھی جانے لگیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد و احفاد اور شاہ ولی اللہ صاحب کے پورے خانوادہ نے سب سے زیادہ حصہ لیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اب تک حدیث نبوی کی ترویج، عربی اور فارسی تصانیف یا مدرسوں کے ذریعہ ہو رہی تھی، مدرسوں سے باہر حدیث نبوی کی آواز کو عوام الناس تک پہنچانے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقائے کرام اور ان کی تحریک نے لیا ان کی کوششوں سے حدیث نبوی کا چرچا شہروں اور قصبوں سے نکل کر گاؤں گاؤں اور گھر گھر ہونے لگا تھا خاص طور پر مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان اور مولانا خرم علی بلہوری کی نصیحۃ المسلمین موافق یا مخالفت میں تو گھر گھر پڑھی گئی۔

راقم الحروف کے علم میں تقویۃ الایمان کے بعد مشارق الانوار اور شمائل ترمذی کے ترجموں کا نمبر آتا ہے۔ مشارق الانوار کا اردو ترجمہ مولانا خرم علی بلہوری متوفی ۱۲۷۱ھ نے اور شمائل ترمذی کا ترجمہ انوار محمدی مولانا کرامت علی جونپوری متوفی ۱۲۹۰ھ نے کیا تھا، یہ دونوں بزرگ حضرت سید صاحب کے فیض یافتہ تھے، مشارق الانوار کا ترجمہ مع متن سب سے پہلے ۱۲۵۲ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا، مولانا خرم علی بلہوری نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بہت سے مفید حواشی بھی لکھے اور بہت سی حل طلب باتیں انہوں نے بالکل واضح کر دی ہیں اس ترجمے کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں۔

" یہ کتاب اہل اسلام کے لیے عجیب تحفہ ہے اور اکثر مطالب دینی پر مشتمل ہے حضرت عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر موضح القرآن اور ترجمہ مشارق الانوار خدا کے واسطے

کافی ہیں طالب دین کے حق میں یہ دونوں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں۔ جن سے دین و دنیا کی بصیرت
حاصل ہو سکتی ہے

شمائل ترمذی کا ترجمہ بھی ۱۲۶۵ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے [1] چھپ کر شائع ہوا مولانا کرامت علی نے
انوار محمدی کے علاوہ مشکوٰۃ کے ایک حصہ کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ انوار محمدی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"خاکسار علی جونپوری مشہور کرامت علی نے دیکھا کہ اکثر لوگ سب علم تو پڑھتے ہیں مگر حدیث کا ذکر
نہیں کرتے اور پیغمبر صاحب کی حدیث اور ان کی صورت شکل، رہن چلن، کھانے پینے، اوڑھنے
پہننے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے، سننے بولنے، وضو، روزے، نماز وغیرہ اخلاق وعادات کا احوال
لوگوں کے نزدیک خواب خیال ہو گیا۔ بلکہ خواب بھی بھول گیا۔ اور اس شیرینی کی لذت لوگ
بھول گئے، اور عشق دنیاوی کے قصے کہانی میں مشغول ہو رہے ہیں، بموجب حدیث نبوی الدین النصیحۃ
کے یعنی دین کیا ہے خیر خواہ مسلمان بھائی کی ارادہ کیا کہ کچھ حدیث کی لذت بھائیوں
کو چکھا دیں اور ہندی زبان کے پیالے میں اس آب حیات کو بھر کے پلا دیں تب بعد غور فکر کے یہی
مناسب دیکھا کہ شمائل ترمذی جو مشہور اور صحیح کتاب حدیث کی ہے اس کا ترجمہ کریں اور اس
ترجمہ کو اپنی طاقت اور سمجھ کے مطابق بہت سیدھی اور آسان ہندی زبان میں کیا اور لغت
کی تحقیق بڑی محنت کے ساتھ کر کے ترجمہ ٹھیک ٹھیک کر دیا، اور بعض مقام میں ہندی کا محاورہ
درست ہونے کے لئے معنی میں تقدیم وتاخیر کرنا ضرور پڑا

اس کے بعد چوتھی قدیم کتاب مولانا سخاوت علی جونپوری متوفی ۱۲۷۱ھ کی تقویم فی احادیث نبی الکریم ہے
اس میں مولانا نے فقہی ابواب کے مطابق حنفی مسلک کی حدیثیں جمع کر دی تھیں۔ اس کا اردو ترجمہ ہو گیا جس کی ضخامت
۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہے مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ اردو ترجمہ کس نے اور کب کیا اور یہ کتاب کب طبع ہوئی راقم
الحروف کو اس کا نسخہ نہ مل سکا۔ ان کتابوں کی تالیف کے کچھ ہی دن بعد نواب قطب الدین صاحب متوفی ۱۲۸۹ھ نے
مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ مظاہر حق کے نام سے کیا یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا انہوں نے حصن حصین کا بھی اردو میں ترجمہ
کیا تھا اور طب نبوی پر بھی ایک رسالہ اردو میں لکھا تھا، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس عہد میں اردو کی دوسری
کتابیں جو حدیث کے موضوع پر لکھی گئیں ان کے مقابلہ میں نواب صاحب کی زبان بہت گنجلک معلوم ہوتی ہے

---

[1] انوار محمدی

جیساکہ اوپر تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اور انوار محمدی کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے کہ ان کی زبان کتنی صاف اور شستہ ہے، مگر اب تک حدیث کی جتنی کتابیں اردو میں لکھی گئیں تقویۃ الایمان کے علاوہ سب ترجمے تھیں مگر ان ترجموں سے یہ فائدہ ہوا کہ علمی و دینی موضوعات پر فارسی کے بجائے اردو میں لکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا اور اردو زبان شاعری کے ساتھ نثر کی علمی کتابوں سے بھی مالا مال ہونے لگی۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ حدیث نبوی کا اطلاق صرف آپ کی قولی حدیثوں ہی پر نہیں بلکہ سنت نبوی اور سیرت نبوی پر بھی ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں مگر قاضی سلیمان منصور پوری اور اور علامہ شبلیؒ سے پہلے سیرت پر جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع روایات کا مجموعہ تھیں اور زیادہ تر میلاد کی مجلسوں میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں مگر علامہ شبلی نے سب سے پہلے اس کا ایک بلند معیار اور محقق امہ حدیث اور ائمہ سیرت کے اقوال کی روشنی سیرت نبوی کے روایتوں کو قبول کرنے اور رد کرنے کے کچھ بنیادی اصول مقرر کئے، علامہ شبلی کی سیرت النبی جس کی تکمیل استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کی جو اردو زبان میں سیرت نبوی اور حدیث نبوی کی انسائیکلو پیڈیا ہے اور شاید اردو زبان کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضور انور صلی اللہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اس سے زیادہ مفصل کتاب کسی دوسری زبان میں نہیں لکھی گئی۔

اردو زبان میں حدیث نبوی اور سیرت نبوی کا ابتدائی سرمایہ علامہ شبلیؒ اور حضرت سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی کو چھوڑ کر زیادہ تر حدیث کی مختلف کتابوں کے ترجمے تک محدود تھا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، اس وقت حدیث کی کوئی کتاب مشکل سے ہوگی جس کا ترجمہ اردو زبان میں نہ ہو گیا ہو۔ حدیث نبوی پر جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ حدیث کے ترجموں کی فہرست تو ہم بعد میں دیں گے پہلے ہم ان کتابوں کی نشاندہی کریں گے جو مستقلاً اس موضوع پر اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک اردو زبان میں تقویۃ الایمان اور نصیحۃ المسلمین کے بعد حدیث نبوی کی ایک جامع کتاب ڈپٹی نذیر احمد کی الحقوق والفرائض ہے یہ اسلام کے ہر گوشہ پر صحیح حدیثوں کا بہترین مجموعہ ہے، صحیح احادیث نبوی کے انتخاب کے ساتھ انہوں نے ہر حدیث کا اردو میں فصیح ترجمہ بھی کیا ہے اور قیمتی تشریحیں بھی کی ہیں اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اردو کتاب حیات المسلمین ہے جس میں حدیث نبوی کا بہترین انتخاب ہے، حدیث نبوی کے جتنے مجموعے اب تک مرتب ہوتے ہیں ان میں سب سے مقبول مجموعے فنی تحقیق سے قطع نظر مولانا زکریا صاحب کے فضائل نماز، فضائل صدقات، فضائل رمضان اور فضائل درود شریف

اور تبلیغی نصاب وغیرہ ہیں ان مجموعوں کے بعد ایک تحقیقی مجموعہ مولانا بدر عالم میرٹھی نے ترجمان السنة کے نام
سے کئی جلدوں میں مرتب کرنا شروع کیا تھا مگر ان کے ابتدائی حصے اتنے علمی اور کلامی مسائل پر مشتمل ہیں کہ
ان سے خواص ہی زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں عام پڑھے لکھے لوگ اس سے کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ راقم الحروف
کے نزدیک عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں مفید اور جامع مجموعۂ حدیث اس وقت تک مولانا محمد منظور نعمانی صاحب
کی معارف الحدیث سے زیادہ دوسرا مرتب نہیں ہو سکا ہے۔ یہ عقاید، عبادات، اخلاق و معاملات سب
ہی پر مشتمل ہے، اب تک اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان ضخیم کتابوں کے علاوہ حدیث کے کئی
مختصر مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں اسی طرح سیرت نبوی پر بے شمار کتابیں اب شائع ہو چکی ہیں مثلاً مولانا
جلیل احسن صاحب ندوی نے راہ عمل کے نام سے ایک مجموعہ تیار کیا ہے جس کے کئی ایڈیشن اب تک
نکل چکے ہیں۔ مولانا جعفر پھلواری ندوی نے ریاض الحدیث کے نام سے ایک اچھا مجموعہ تیار کیا ہے، اسی طرح
ندوة المصنفین اور جامعہ ملیہ سے بھی سیرت نبوی پر کئی مختصر اور ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں مولانا عبدالرؤف
داناپوری کی اصح السیر بھی اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

حدیث کے کتابوں کی شرح اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بھی اردو زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئی
ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کی زجر الشبان والشیبہ عن ارتکاب الغیبة، نواب صدیق کی غنیة القاری شرح ثلاثیات
بخاری شیخ فضل احمد انصاری کی شرح بخاری فیض الباری مولانا وحید الزماں اور مولانا بدیع الزماں کی جائزة الشوذی
شرح ترمذی مولانا فضل احمد انصاری کی ترمذی اور مولانا وحید الزماں کی روض الربا من ترجمة سنن المجتبیٰ شرح نسائی
شریف سید بابا قادری بن یوسف حیدرآبادی کی اسرار النبوة شرح شمائل ترمذی مولانا کفایت اللہ مراد آبادی کی
بہار خلد شرح شمائل ترمذی منظوم مولانا وحید الزماں کی رفع العجاجہ شرح ابن ماجہ، مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی کے
صاحبزادے مولانا مفتی عبدالقیوم کا ترجمہ اربعین ملا علی قاری

مولانا قطب الدین خاں دہلوی کی الظفر الجلیل شرح حصن حصین شیخ عبدالعزیز عثمانی ہزاروی بن عبدالسلام
کی استجلاء البصر شرح نخبة الفکر اور مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی شرح شمائل ترمذی مفتی عنایت احمد
کاکوری کی زمان الفردوس جس میں انہوں نے ترغیب و ترہیب کی احادیث جمع کی ہیں اور ان کا اردو ترجمہ کر
دیا ہے شیخ محی الدین خاں دہلوی کی تلخیص الصحاح ترجمہ تیسیر الاصول وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں
فن اسماء الرجال، اصول حدیث اور تذکرہ محدثین کے سلسلے میں اردو زبان میں بہت کم کتابیں لکھی گئی

ہیں مگر پھر بھی جو ہیں وہ قابل قدر ہیں اس سلسلہ میں جن کتابوں کے نام مل سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

حافظ ابن حجر کی نخبۃ الفکر اصول حدیث کی مشہور کتاب ہے اس کی شرح اردو میں مولانا شیخ عبدالعزیز ہزاروی بن عبدالسلام نے کی ہے یہ ۱۳۲۲ھ میں مرتب ہوئی، اعزۃ الخطابہ صحابہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے جسے مولانا ابونعیم عبدالعظیم حیدرآبادی نے مرتب کی ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے تدوین حدیث کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی جو بہت ہی بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے مولانا تقی الدین صاحب ندوی نے محدثین عظام اور فن اسماء الرجال پر دو مفید کتابیں مرتب کی ہیں مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے تذکرۃ المحدثین کے نام سے تین جلدوں میں جو کتاب مرتب کی ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی اصول حدیث کی فارسی کتاب بستان المحدثین کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے جسے نور محمد کارخانہ تجارت کراچی نے شائع کی ہے شاہ صاحب کا اصول حدیث پر دوسرا فارسی رسالہ عجالہ نافعہ ہے اس ۲۰ - ۲۵ صفحہ کے رسالے کی مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی نے چار پانچ سو صفحے پر مشتمل قیمتی اردو شرح کی ہے

لغات حدیث پر بھی اردو میں ایک بڑا قیمتی کام مولانا وحیدالزماں صاحب کا ہے انہوں نے حدیث کے الفاظ کی ایسی آسان اور عام فہم تشریح کی ہے کہ حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کو اس سے بڑی مدد ملتی ہے ان کی کتاب "لغات الحدیث" کے نام سے اٹھائیس ضخیم جلدوں میں کراچی سے چھپ گئی ہے جس کی مجموعی ضخامت ۲۶۹۰ صفحات ہے اس کتاب کو حدیث نبوی کا بہترین ذخیرہ سمجھنا چاہیئے۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ حدیث کے جتنے مشہور مجموعے ہیں قریب قریب ان سب کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ان میں بیشتر ترجمہ مولانا وحیدالزماں صاحب لکھنوی کا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں تنہا ایک جماعت کا کام کیا ہے ان کے ترجموں کے بعد حدیث کی انہیں کتابوں کے ترجمے دوسرے علماء نے بھی کئے مگر اولیت سب سے پہلے انہی کو حاصل ہے۔ اس لئے ہم ان کے ترجموں کی خصوصیات پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ یہ ترجمے محض ترجمے ہی نہیں ہیں بلکہ ہر کتاب کی مختصر سی شرح ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یوں تو مولانا کو حدیث کی کتابوں کے ترجمے کا خود بھی ذوق تھا مگر اس میں ان کے والد شیخ مسیح الزماں اور نواب صدیق حسن

خاں مرحوم کی ترغیب کو بڑا دخل ہے۔ نواب صاحب نے اس کے لئے ان کو اپنی طرف سے پچاس روپئے ماہوار عطیہ دینے کی پیش کش بھی کی وحید الزماں صاحب اپنے والد کے ساتھ اسی زمانہ میں حجاز چلے گئے اور زیادہ ترجمہ وہیں مکمل کئے۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مولانا وحید الزماں کے والد مسیح الزماں صاحب سے دیرینہ تعلقات تھے ان کے بھائی مولانا بدیع الزماں کی بھی نواب صاحب کے یہاں آمد و رفت تھی ان کے ذریعہ مولانا وحید الزماں کی تصانیف اور ان کے اردو ترجمہ کی صلاحیت کا جب نواب صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا وحید الزماں صاحب صحاح ستہ کا اردو ترجمہ کردیں چنانچہ وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔

کشف المغطا عن الموطاء | شاہ ولی اللہ صاحب اور بعض محقق علماء ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو اس کی اولیت اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں اسی لئے مولانا وحید الزماں صاحب نے سب سے پہلے مؤطا امام مالک کا ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کا نام کشف المغطا عن الموطاء رکھا مولانا اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

> نواب صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ ترجمہ صحاح اس طرح سے ہو کہ اسانید و ذکر رواۃ بالکل حذف کر دیئے جائیں کیونکہ عوام کو اس سے کچھ فائدہ مقصود نہیں اور خواص کو ممکن ہے کہ اگر ضرورت کسی سند کے دیکھنے کی واقع ہو تو اصل کتاب ملاحظہ کرلیں اور لفظ حدیث پورا ذکر کر کے ترجمہ عام فہم کیا جائے .... الحمد للہ احقر نے حسب ارشاد ترجمہ اس کتاب کا شروع کیا پہلے عبارت حدیث کی بحذف اسناد لکھتا ہوں پھر اس کا ترجمہ اہل لسان کے موافق عام فہم کر دیتا ہوں[1]

(حیات وحید الزماں صفحہ ۱۲۸)

اس ترجمہ میں انہوں نے کہیں کہیں بڑے قیمتی فوائد لکھے ہیں اور اس میں موطا کی دوسری شروں مثلاً زرقانی، مصفی، محلی، منتقی اور تنویر الحوالک وغیرہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

تیسیر الباری اردو ترجمہ صحیح البخاری | مولانا وحید الزماں صاحب نے بخاری شریف کی اردو میں ایک شرح تسہیل القاری کے نام سے لکھنا شروع کی تھی مگر وہ کام ابھی چوتھائی سے آگے نہ بڑھ سکا تھا

[illegible]

---

[1] پہلا ترجمہ منشی نول کشور صاحب نے اپنے مطبع سے شائع کیا اور اب نور محمد اصح المطابع نے شائع کیا ہے

اس کے بعد انہوں نے مختصر شرح کے ساتھ مکمل بخاری کا ترجمہ تیسیر الباری کے نام سے کیا۔ تسہیل القاری کے مکمل نہ ہونے کا انھیں بڑا افسوس رہا تیسیر الباری کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

اس سے پہلے جو شرح میں نے صحیح بخاری کی لکھی تھی اس کا نام تسہیل القاری تھا، وہ صرف چار پاروں تک لکھی گئی تھی اور ہر پارہ ایک جلد ضخیم تھا اس کے بعد کئی سال دنیوی مشاغل میں پھنس گیا اس کے پورا کرنے کی نوبت نہ آئی ۱۳۲۰ھ میں حق تعالیٰ نے ان بیہودہ مشاغل سے نجات دلائی ایک سال ایک ماہ میں تفسیر قرآن پوری ہوئی اب یہ ترجمہ (تیسیر الباری۔ ترجمہ صحیح بخاری) لکھتا ہوں اللہ کے کرم سے امید ہے کہ وہ اس کے بعد تسہیل القاری کو بھی پورا کر دے۔

اس ترجمے کو سامنے رکھ کر مختلف مطابع نے بخاری شریف کے ترجمے شائع کئے ہیں، تسہیل القاری کس اہتمام سے لکھ رہے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پہلے پارہ کی جو شرح ۱۳۰۷ھ میں مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہوئی اس کی ضخامت ۸۳۲ صفحات تھی، مولانا نے مسلم شریف کے ترجمہ میں جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے ان کے اس ترجمہ سے پہلے بخاری شریف کا کوئی ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

چونکہ بخاری کی شرحیں اور ترجمے عربی اور فارسی زبان میں بہت ہو چکے ہیں بلکہ حال میں ایک ترجمہ اردو زبان میں مدراس میں چھپنا شروع ہو گیا تھا

(حیات وحید الزماں ص ۱۲۲)

مگر تلاش کے باوجود راقم الحروف کو اس ترجمہ کا کوئی سراغ نہ لگ سکا یہاں بخاری شریف کے دو تین اور ترجموں کا ذکر بھی ضروری ہے بخاری شریف کا ایک ترجمہ مرزا حیرت دہلوی نے ۱۹۰۶ء میں کیا تھا۔ اسی طرح مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے فضل الباری کے نام سے ۱۹۲۶ء میں ایک ترجمہ بخاری شریف میں کیا تھا جو چھپ گیا ہے۔ مرزا حیرت کے ترجمہ کی طباعت بھی ہو چکی ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی ایک اور شرح شیخ احمد انصاری نے فیض الباری کے نام سے کیا تھا اس کا ذکر مولانا عبد الحئی صاحب نے "الثقافۃ الاسلامیہ" میں کیا ہے مگر اس کی طباعت کا کوئی علم نہ ہو سکا اور نہ مصنف کے حالات سے واقفیت ہو سکی۔

المعلم ترجمہ صحیح مسلم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ صحیح مسلم کا ترجمہ اور مختصر شرح ہے یہ ترجمہ و شرح متوسط تقطیع کی چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸۷۲ ہے مولانا نے صحیح مسلم کے ترجمے سے پہلے بخاری شریف کے ترجمہ اور شرح کا ارادہ کیا تھا مگر بخاری شریف کی سب اہم شرح فتح الباری ان کے پاس نہیں تھی اس لئے انہوں نے مسلم کا ترجمہ شروع کر دیا اور اس کی تکمیل کے بعد فتح الباری مل گئی تو بخاری شریف کا کام شروع کر دیا۔

مولانا نے جو صحیح مسلم کے ترجمہ پر دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ سے پہلے وہ ترمذی ابوداؤد اور نسائی کا ترجمہ بھی کر چکے تھے اور پھر دیباچہ میں انھوں نے امام مسلم کے حالات اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا موازنہ امام مسلم کے شرائط حدیث وغیرہ پر بحث کی ہے۔ جس سے یہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہ گیا بلکہ مختصر شرح ہو گئی ہے۔

الہدی المحمود شرح ابوداؤد یہ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد کا ترجمہ ہے جو ۱۲۹۷ھ کو مکمل ہوا۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں ۱۳۰۱ھ میں مطبع صدیقی لاہور سے شائع ہوا پہلی جلد کی ضخامت ۶۲۸ صفحات اور دوسری جلد کی ضخامت ۶۹۶ صفحات ہے، حسب سابق اس پر بھی ایک مقدمہ لکھا ہے مگر دوسرے ترجموں میں جس طرح انھوں نے کافی فوائد اور حواشی لکھے ہیں اس ترجمہ میں تشریحی فوائد کم ہیں، یہ ترجمہ تقریباً ڈیڑھ سال میں مکمل ہوا۔ مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں

۱۲۹۶ھ کے اوائل میں موطا اور ترمذی سے فراغت حاصل ہو گئی اس کے بعد دل چاہتا تھا کہ پہلے صحیح بخاری کا ترجمہ کیا جاتا مگر کتب ضروری ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے بخاری کے ترجمے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہ ترجمہ شروع کر دیا، اور ۴ر ربیع الاخری ۱۲۹۷ھ بروز دوشنبہ کو فراغت حاصل ہوئی۔

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں کسی مسئلہ یا حدیث کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کے لئے قال ابوداؤد کے الفاظ استعمال کئے ہیں، چنانچہ حدیث کے درس میں قال ابوداؤد پر ہمیشہ بحث ہوتی ہے۔

اس موضوع پر مولانا حنیف گنگوہی نے فلاح و بہبود شرح اردو قال ابوداؤد مرتب کر دیا ہے جو چھپ گئی ہے۔

روض الربی من ترجمۃ سنن المجتبیٰ | یہ امام نسائی کی سنن المجتبیٰ کا اردو ترجمہ ہے یہ ترجمہ بھی دو ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوا یہ ترجمہ بھی محض ترجمہ نہیں بلکہ مولانا نے اس پر بے شمار فوائد وحواشی بھی لکھے ہیں اس پر انھوں نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں مصنف کے حالات اور کتاب کی خصوصیات پر بحث کی ہے یہ ترجمہ انہوں نے ابوداؤد کے بعد لکھنا شروع کیا اور دو سال میں مکمل کر لیا۔ خود لکھتے ہیں۔

> وحید الزماں .... عزّ شانہٗ کے فضل سے اوائل ۱۲۹۶ھ میں ابوداؤد کے ترجمہ سے فراغت حاصل ہوئی اب منجملہ صحاح ستہ کے تین کتابوں کا ترجمہ باقی رہا صحیحین اور نسائی شریف ہر چند کہ اکثر احباب کی خواہش اور میری تمنا بھی تھی کہ اب صحیحین کا ترجمہ شروع کیا جائے اور سنن نسائی صحیحین کے فراغت کے بعد رکھا جائے مگر بوجہ پریشانی سفر اور قلت سامان کے بنا بر مناسب یہی معلوم ہوا کہ پہلے سنن نسائی کا ترجمہ کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ چاروں کتابیں یعنی موطا امام مالک اور سنن ابوداؤد جامع ترمذی اور سنن نسائی علاوہ مختصر ہونے کے چنداں شروح وحواشی کی احتیاج نہیں رکھتیں۔

رفع العجاجہ عن ترجمۃ سنن ابن ماجہ | یہ سنن ابن ماجہ کا ترجمہ ہے اور تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ اصلاً ان کے بھائی مولانا بدیع الزماں صاحب نے شروع کیا تھا مگر درمیان میں ان کا انتقال ہو گیا جسے مولانا وحید الزماں صاحب مکمل کیا آغاز کتاب میں خود لکھتے ہیں

> وحید الزماں ...... عرض کرتا ہے کہ ۱۳۰۵ھ کے اواخر میں حدیث کی بڑی بڑی پانچ کتابوں کے ترجمہ سے فراغت ہوئی اور ماہ ذی قعدہ سنہ مذکورہ سے صحیح بخاری علیہ الرحمۃ کا ترجمہ بہ بسط اتمام شروع کیا گیا اللہ جل جلالہٗ کے فضل سے امید ہے کہ وہ ترجمہ چند سال کے عرصہ میں پورا ہو جائے گا، چونکہ صحاح ستہ میں بقول راجح، موطا امام مالکؒ کی داخل تھی اس لئے سب سے پہلے موطا شریف کا ترجمہ کیا گیا اور اللہ جل جلالہٗ کے فضل سے وہ ترجمہ نہایت مطبوع اور مقبول ہوا اور سنن ابن ماجہ کا ترجمہ بشرط موقع اور فرصت اور نیز اس خیال سے کہ وہ صحاح ستہ

میں بقول راجح نہیں ہے ملتوی رکھا گیا ہے پر اکثر صاحبوں نے اس فقیر سراسر تقصیر سے یہ سوال کیا کہ اگر سنن ابن ماجہ کا بھی ترجمہ ہو جائے تو مناسب ہے کیونکہ متعدد علماء کے نزدیک یہ کتاب صحاح ستہ میں داخل ہے اور اکثر مقامات میں داخل درس ہے اور سوا اس کے اس کتاب کی ترتیب اور طرز تالیف خوب ہے اور مؤلف نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ احادیث کو جمع کیا ہے اور فقیر کو ان کا سوال لائق اجابت معلوم ہوا۔ مگر کیا کروں قلت فرصت، کثرت شغل، ضعف اعضاء رئیسہ، ترجمہ صحیح بخاری یہ امور ایسے تھے جن لحاظ سے اس امکا اہتمام دشوار نظر آیا، اس پر بھی محض حق سبحانہ تعالیٰ کی امداد اور اعانت پر بھروسہ کر کے میں نے اس کا ترجمہ بھی شروع کیا اور جس قدر اوقات ترجمہ صحیح بخاری شریف کے بعد بچتے تھے ان کا صرف کرنا اس کام میں مناسب خیال کیا، میں حق تعالیٰ شانہ سے بکمال تضرع اور نیاز و دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے اس ترجمہ کو پورا کر دے اور اس کو مقبول و مطبوع فرمائے۔

واضح ہو کہ جناب اخوی مطاعی مولوی حاجی بدیع الزماں صاحب مرحوم و مغفور نے اس کتاب کا ترجمہ ۱۲۹۸ھ میں شروع ہو کیا تھا اور ابتدائے کتاب سے صرف چار پانچ جز کا ترجمہ یعنی باب ماجاء فی التوقیت للمسح للمقیم والمسافر تک لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ جناب مغفور ۱۳۰۲ھ میں دنیا فانی سے سفر کر گئے اور اس کتاب کا نہ دیباچہ لکھا نہ اس کے اتمام کی مہلت پائی لہذا ناظرین باتمکین سے امید ہے جو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں کہ جناب مرحوم کو بھی دعائے خیر سے محروم نہ فرمائیں۔

جائزۃ الشعوذی شرح ترمذی | یہ حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی کا اردو ترجمہ اور شرح ہے یہ شرح مولانا وحید الزماں صاحب کے بھائی مولانا بدیع الزماں صاحب نے کیا تھا، چونکہ یہ دونوں حضرات اس کام میں شریک تھے اس بناپر مولانا وحید الزماں صاحب نے الہدی المحمود کے دیباچہ

میں اسے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے جس کی بنا پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ جائزۃ الشعوذی کے علاوہ کوئی دوسرا ترجمہ اور شرح بھی مولانا وحید الزماں صاحب نے کیا ہے غالباً اسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا عبدالحئی صاحب نے بھی الثقافۃ الاسلامیہ میں مولانا وحید الزماں صاحب کی شرح کا علیحدہ ذکر کیا ہے لیکن مولانا وحید الزماں صاحب کی اس کے علاوہ کوئی دوسری شرح نہیں ہے،

اصل بات یہ ہے کہ ان کتابوں کے اکثر ترجموں میں ان کے بڑے بھائی مولانا بدیع الزماں شریک رہے ہیں، جیسا کہ اوپر ابن ماجہ کے ترجمہ میں اس کا ذکر آچکا ہے مگر ترمذی کا ترجمہ خالص ان کا کیا ہوا ہے جس میں مولانا وحید الزماں شریک رہے ہیں۔

اس کے علاوہ شرح ترمذی کے نام سے ایک شرح مولوی فضل احمد انصاری نے کیا تھا مگر اس کے بارے میں مزید معلومات نہ ہو سکیں۔

ترجمہ ریاض الصالحین اور بلوغ المرام ریاض الصالحین امام ابوزکریا محی الدین بن شرف الدین نووی متوفی ۶۷۶ھ کی مشہور کتاب ہے اور بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی تصنیف ہے ان دونوں کتابوں کے متعدد اردو ترجمے ہو چکے ہیں۔ ریاض الصالحین کا سب سے پہلے ترجمہ احمد الدین بن شرف الدین صاحب نے کیا تھا مگر یہ ترجمہ دستیاب نہیں ہو سکا دوسرا ترجمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے " زادراہ " کے نام سے کیا ہے جو متداول ہے اسی طرح بلوغ المرام کے بھی کئی ترجمے ہوئے ایک ترجمہ شیخ محی الدین تاجر لاہور نے کیا اور دوسرا مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے کیا اس کے بعد اور ترجمے بھی ہوئے ہیں اسی طرح مسند امام ابوحنیفہ کا اردو ترجمہ مولوی حبیب الرحمن صاحب نے کیا جس کے بارے میں مزید کوئی معلومات نہ ہو سکی، ملا علی قاری کی اربعین کا ترجمہ مفتی عبدالقیوم بن مولانا عبدالحئی بڈھانوی نے کیا، اس طرح امام محمد کی کتاب الآثار اور موطا کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مسند احمد بن حنبل حدیث نبوی کا سب سے بڑا ذخیرہ مسند احمد بن حنبل میں ہے اس کتاب کی تبویب کا کام حسن البنا مرحوم کے والد نے شروع کیا تھا جسے شیخ احمد شاکر نے قریب قریب کر ڈالا ہے، ہندوستان کی اہل حدیث جماعت نے بھی ایک زمانہ میں اس کی تبویب کا پروگرام بنایا تھا مگر وہ نہ کر سکی مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کی عربی اور اردو

دونوں شرحیں لکھنی شروع کر دی ہیں ان کی اردو شرح کے چار حصے جو خلفائے راشدین کے مسانید پر مشتمل ہیں مرتب ہو چکے ہیں اور مسند ابو بکر کا ترجمہ اور شرح شائع بھی ہو چکی ہے چاروں حصوں کے صفحات کی مجموعی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے متعدد شیوخ حدیث کی درسی تقریروں کو بھی ان کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے جس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی بخاری شریف کی تقریروں کو مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

اسرار اللغۃ مع انوار اللغۃ الملقب وحید اللغات

مولانا وحید الزماں صاحب نے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے تنہا ایک اکیڈمی کا کام کیا ہے انہوں نے حدیث کا جو ذخیرہ اردو میں منتقل کیا ہے کم از کم وہ دس بارہ ہزار صفحات سے زیادہ ہے تنہا ان کی لغات الحدیث تقریباً ۴ ہزار صفحات پر مشتمل ہے ان کی اس کتاب کو اردو زبان میں حدیث نبوی کی انسائیکلوپیڈیا سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مختصر ذکر اوپر آچکا ہے مگر یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کی خصوصیات پر مزید کچھ اور لکھ دیا جائے۔

مولانا کتب حدیث کے ترجموں اور تفسیر قرآن سے فارغ ہوئے تو ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں اس تالیف کا آغاز ہوا اور تقریباً چھ برس میں یہ کام مکمل ہوا ابتدا میں اس کا تاریخی نام انوار اللغۃ ۱۳۲۴ھ رکھا پھر نظر ثانی کے بعد اسرار اللغۃ مع انوار اللغۃ الملقب وحید اللغات کر دیا اور نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے اسے اٹھائیس (۲۸) جلدوں میں "لغات الحدیث" کے نام چھاپا ہے۔ ایسی مفید، قیمتی اور صحیح کتاب ناشروں کی ناقدری کی کس طرح شکار ہوئی اس کی کیفیت مولانا نے بڑے درد کے ساتھ لکھی ہے۔

"اب غرہ ربیع ۱۳۲۴ھ ہجری سے باوجود اس کے کہ کمال نقاہت اور ضعف اور امراض میں گرفتار تھا لیکن اس پر بھی اوقات کو خالی گذارنا مشکل معلوم ہوا اور بالہام غیبی یہ حکم ہوا کہ ایک کتاب لغات حدیث میں بزبان اردو مرتب کر اور اس میں جہاں تک ہو سکے فریقین یعنی اہل سنت اور امامیہ کی حدیثیں جمع کر تاکہ حدیث شریف کے تمام طالبین کو شرح کا کام دے اور جس لفظ کے معنی میں ان کو اشکال پیدا ہو وہ اس کتاب میں دیکھ کر اپنا

اشکال رفع کرلیں۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے سے انوار اللغۃ ملقب بہ وحید اللغات رکھا تھا اور اس کی تالیف میں مفصلہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی تھی۔

نہایہ ابن الاثیر، مجمع البحار[2]، قاموس المحیط، صحاح جوہری، محیط المحیط، منتہی الارب، مجمع البحرین الدر النثیر فی تلخیص النہایۃ، الفائق، المغرب، شرح النہج العجیب، لسان العرب وغیرہ اور اس کے اٹھائیس پارے بعد حروف تہجی کے کئے گئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ جیسے اوپر بیان ہوا مطبع احمدی لاہور نے اس کتاب کو آٹھ دس سال تک بلا طبع روک رکھا بعد اس کے چند اجزا غلط سلط چھاپ کر بقیہ کتاب واپس کردی اس لئے فقیر نے ان اجزا کو بھی از سر نو مکمل و صحیح کے باضافہ چند لغات ان کا نام اسرار اللغۃ رکھا، درحقیقت یہ اجزاء اول ودوم وسوم وچہارم وپنجم انوار اللغۃ ہی کے ہیں ان اجزاء کو اجزاء ششم سے لیکر تا جز بست وہفتم ملالیں تو مکمل انوار اللغۃ حاصل ہوجاتی ہے اٹھائیس[۲۸] جلد پوری ہوجاتی ہے۔

فائدہ صاحب مجمع سے بہت اور صاحب نہایۃ سے کم مسامحات ہوئے ہیں یعنی لغت کو اس کے صحیح باب میں بیان کرنا تھا وہاں بیان نہیں کیا دوسرے باب میں بیان کردیا ہے شاید ناظرین کے آسانی کے خیال سے انہوں نے ایسا کیا ہے۔ اللہ تعالے ان دونوں کو اجر عظیم دے، انھوں نے فراہمی لغات میں بڑی محنت اٹھائی ہے میں نے اس کتاب میں باتباع ہر دو صاحبان مذکورین کے ہر لغت اسی باب میں بیان کردیا ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے مگر اکثر مقامات میں اس کے ساتھ ہی یہ اشارہ کردیا ہے کہ یہ لغت فلاں باب میں بیان کرنا تھا۔ یا اللہ تو اس کتاب کو قبول فرما اور اپنے فضل وکرم سے اس کو میری زندگی میں تمام اور شائع کرادے آمین یا رب العلمین۔

فائدہ اس کتاب میں اکثر ہر لغت شروع سطر سے لکھا گیا ہے اور اس پر اعراب بھی دیئے گئے ہیں تاکہ کم استعداد لوگوں کو مزید آسانی ہو اور ابواب کی تنقیح اس لئے

---

[1] نہایہ ابن اثیر کا پورا نام النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ہے اور مجمع البحار کا پورا نام مجمع بحار الانوار ہے

[2] اشارہ ہے طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار اور ابن اثیر جزری کی النہایۃ کی طرف

نہیں کی گئی کہ یہ کتاب عربی دانوں کے لئے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ کم استعداد ہندی
بھائیوں کے لئے اور اسی لئے ترتیب لغات اس طرح سے رکھی گئی کہ حرف
اول کو باب اور حرف ثانی کو فصل مقرر کیا ،،

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ کام کتنی تحقیق سے کیا ۔ طوالت کا خیال ہے ورنہ ان کی بہت سی تحقیقات کو مثال دے کر وضاحت کی جاتی جس کو تفصیل دیکھنی ہو اسے " حیات وحید الزماں ،، مصنفہ مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی مطالعہ کرنی چاہیے۔

حدیث نبوی کے موضوع پر اردو زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی دوسری متداول کتابوں میں سے بیشتر کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے مگر راقم الحروف کو بروقت ان کی پوری تفصیلات میسر نہیں ہو سکی اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔

آخر میں ہمیں ایک نظر حدیث نبوی کے ان ممتاز اساتذہ پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جنہوں نے تیرھویں صدی ہی جب کہ اردو زبان ایک طرف علمی زبان بھی نہیں رہی دوسری طرف وہ عوامی زبان بھی ہوتی جا رہی تھی اس کے ذریعہ درس و تدریس کی خدمات انجام دیں جس سے خواص و عوام تک حدیث نبوی کی آواز بھی پہنچی اور اس سے اردو زبان کو علمی اور عوامی زبان بننے میں مدد بھی ملی ، شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے ہیں اردو زبان بول چال کی زبان بن چکی تھی ، شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب کے بارے میں تو یہ علم نہ ہو سکا کہ ان کا درس حدیث اردو زبان میں ہوتا تھا یا فارسی میں مگر ان کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب ، اور شاہ عبدالقادر صاحب کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درس و تدریس کی زبان آسان اردو ہی تھی۔

حضرت اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان میں جو زبان استعمال کی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادہ کی مادری زبان اردو بن چکی تھی ۔ اس ابتدائی دور میں درس و تدریس کے ذریعہ جن حضرات نے فن حدیث کو ترویج دی ان میں سب سے ممتاز نام شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے شاہ محمد اسحاق صاحب ابن محمد افضل فاروقی کا ہے مولانا عبدالحیٔ صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ " فن حدیث کی امامت آپ پر ختم ہے ،،

ان کے علاوہ شیخ عبداللہ محدث الہ آبادی شیخ عبدالحق عثمانی نیوتنی متوفی ۱۲۸۶ھ شیخ عبدالغنی دہلوی ابن ابو سعید متوفی ۱۲۹۶ھ اور مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی کے صاحبزادے اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے داماد مفتی عبدالقیوم صاحبؒ مولانا احمد علی سہارنپوری، قاری عبدالرحمٰن انصاری پانی پتی متوفی ۱۳۱۴ھ سید عالم نگینوی متوفی ۱۲۹۵ھ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، ان میں سے اکثر حضرات شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے شاگرد ہیں مگر شاہ صاحب کے شاگردوں میں سب سے وسیع حلقہ میاں سید نذیر حسین حسینی دہلوی متوفی ۱۳۲۰ھ کا تھا، ان کی مجلس درس سے نہ صرف ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ مستفیض ہوئے بلکہ عرب کے علماء و طلبہ نے بھی ان کے درس سے فائدہ اٹھایا۔

آخر دور میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ متوفی ۱۳۲۳ھ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ نواب صدیق حسن بھوپالی فن حدیث میں مرجع خلائق بن گئے تھے انہی حضرات کے ذریعہ صحاح ستہ کا باقاعدہ درس مدارس عربیہ میں دیا جانے لگا، اور اب تو ہندوستان کے سینکڑوں عربی درسگاہوں میں صحاح ستہ کا دور دورہ ہونے لگا ہے۔ اور تقریباً ایک صدی سے بذریعۂ تعلیم اردو زبان ہی ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے علماء حدیث ہیں جنہوں نے اردو زبان کے ذریعہ حدیث نبوی کی خدمات انجام دی ہیں مگر یہاں احاطہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خاکہ پیش کرنا مقصود ہے۔

علامہ اقبال اور اصلاح امت

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔
پروفیسر و صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایک عظیم شاعر فلسفی صاحب تجدید ناقد حیات کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اقبال ایک شاعر ہی نہیں ایک پیامبر ہیں جنہوں نے شاعری سے تبلیغ و اصلاح کا کام لیا۔ علماء کے مواعظ اتنے پراثر نہیں جتنے اقبال کے اشعار فکر و نظر کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک عہد آفریں شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے فلسفہ اپنی شاعری اور اپنی فکری قوتوں سے اصلاح امت کا کام لیا۔ جس طرح وہ ایک بڑے شاعر تھے اسی طرح ایک عظیم مصلح امت بھی ہیں اور اسی بنا پر ان کو شاعر اسلام کہا جاتا ہے۔ ان کی زندگی اسلام کے لئے سراپا سوز تھی اور یہی کیفیت ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے وہ یورپ جاتے ہیں مگر لندن کی سردیوں میں بھی تہجد کی نماز قضا نہیں کرتے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی ⁂ نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

ان کے پاس قرآن کا جو مصحف تھا اس پر پڑھتے وقت اتنے آنسو گرتے تھے کہ جا بجا حروف دھندلے ہو گئے تھے۔ ان کی پوری شاعری ان کے اسلامی سوز و ساز کی ترجمان ہے ان کا دل امت کی زبوں حالی سے افسردہ تھا مگر وہ ناامید ہرگز نہ تھا۔ انہوں نے صحیح فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل میری مٹھی میں رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام نے ہزاروں انسانوں کو بے دینی اور دہریت کے دلدل سے نکالا ہے اور دلوں کو ایمان کی روشنی عطا کی ہے۔

وطن اور نسل کی وحدت کو اقبال نے مصنوعی قرار دیا جو بسا اوقات ہلاکت خیز نتائج کا باعث بنتی ہے اور جس کے باعث عالمگیر جنگیں وجود میں آئیں اسی فکر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ اپنی اکثریت کے علاقہ میں رہنا چاہیئے تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں[1] اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غیر مسلموں سے بغض

---

[1] فکر اقبال صفحہ ۲۴۲

تھے۔ انہوں نے تو رام گوتم بدھ اور رام تیرتھ وغیرہ پر نظمیں لکھیں ہیں۔

۱۹۰۸ء میں جب وہ یورپ سے لوٹ کر آئے تو انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ باقی عمر میں شاعری سے اب احیائے امت کا کام لیا جائے گا۔ زمانے تھے کہ میرے دل نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے کمال کو اسلام کی خدمت میں صرف کرنا، اگرچہ اسلام کی ترجمانی اقبال کے یہاں شروع ہی سے ملتی ہے مگر مغرب جاکر اس میں مزید گرمی پیدا ہو گئی ۔[1]

اقبال نے امت کی اصلاح شاعری، فلسفہ اور فکر کی راہوں سے کی ہے ان کا فلسفۂ خودی دراصل قرآن کی تعلیمات اور اسلام کی روح کی ایک فلسفیانہ تعبیر ہے جو انسانوں کو اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کی ایک دعوت ہے۔ اقبال یوں تو خودی کا پیغام پوری کائنات کو دیتے ہیں مگر مسلمانوں کو وہ خاص طور سے خودی کی طرف بلاتے ہیں بغیر اپنی ذات کے راز سے آشنا ہوئے دین کا عرفان بھی ممکن نہیں۔

چیست دیں، دریافتن اسرار خویش

زندگی مرگ است بے دیدار خویش

زندگی کی تاریکیوں میں عقل ناکام محض ہے اس لئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ عشق کا سہارا لینا چاہیئے۔ اس طرح خودی کے ذریعہ خدا تک انسان پہونچ سکتا ہے "خدا خواہی بخود نزدیک تر شو"[2]

خودی ایک بحر بے کنار ہے اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کی کوئی انتہا نہیں وہ لافانی شئے ہے مگر اس کے حصول کے لئے انسان کو جد و جہد کی ضرورت ہے وجدان اور عشق کے ذریعہ خودی کی صحیح تربیت ممکن ہے اور یہ قوت انسان کو زندہ جاوید کر سکتی ہے۔

خودی کی کامل ترین شکل خدا ہے۔ انسان کی خودی کے لئے وہ اعلیٰ نمونہ ہے۔ انسان اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جو سعی کرتا ہے وہ دراصل خود خدا کے مقاصد کی تکمیل ہے۔ اس طرح انسانی خودی انفرادیت کی ارتقائی منزلیں طے کرکے خدا کی ذات سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ " انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ خدا کی کامل ترین اور منفرد ترین خودی اس کے سامنے ایک مثالی تصویر، بلند مقصد یا نصب العین

---

[1] فکر اقبال ص ۹۰ ۔ [2] رموز اقبال، مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین ص ۲۰

ہے اور لازوال ہے اس کی راہ ارتقا میں چراغِ ہدایت ہے"۔ [1]

اقبال نے مغربی تہذیب کے تباہ کن عناصر سے امت کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اسلامی نظام حیات کی خوبیوں کو اجاگر کیا اور قنوطیت کے پرخچے چاک کرکے اسلام کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کی۔ جب ان کے سامنے اسپنگر (Spengler) کا فلسفہ پیش کیا گیا کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز کا بچپن یا ابتدا پھر جوانی اور پھر زوال یا پیری آتی ہے بالکل اسی طرح قوموں کی زندگی ہے جس میں ابتدا، جوانی اور پھر زوال آتا ہے۔ مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا شباب گذر چکا۔ تہذیب پھر کبھی اب زندہ نہ ہوگی تو اس پر علامہ اقبال نے بڑی سختی سے فرمایا کہ نہیں ہم جو قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد دوسری زندگی کے قائل ہیں، اس نظریہ پر کیسے یقین کر سکتے ہیں؟ اسلام تو بار بار زندہ ہوگا۔ اسلام ہی کی برکت سے تو یہ یورپ کی بہاریں آباد ہیں۔ وہ پھر انسانیت کو روشنی اور حرارت عطا کرے گا۔ [2]

اقبال نے جمہوریت عہد اشتراکیت اور سرمایہ داری نظام ہائے زندگی پر کڑی تنقید کی اور ان کے خدوخال کو نمایاں کرکے اسلام کے لائے ہوئے نظام حیات کی صحیح تعبیر پیش کی ہے۔ انہوں نے مغرب کے اس تصور پر ضرب کاری لگائی کہ دین اور سیاست الگ الگ چیزیں ہیں اور فرمایا کہ ؎

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

اقبال نے اسلامی دنیا کے ذہنی جمود کو توڑنے کے لئے وہ لکچر دیے جو اسلامی الہیات کی تشکیل جدید Reconstruction of Islam کے نام سے شائع ہوئے۔ ان میں اسلامی فلسفہ کا گہرا مطالعہ اور اسلامی مسائل حیات میں تجدید و اجتہاد پر زور دیا گیا ہے۔

عالم اسلام میں اصلاحی بیداری علامہ اقبال ہی کے زمانے سے شروع ہو گئی تھی چنانچہ وہ فرماتے ہیں "بہرحال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام سے عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے"۔

لہٰذا عالم اسلام کی قیادت اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا فرض یہ ہے کہ

---

[1] فلسفۂ اقبال مرتبہ بزم اقبال لائبریری صفحہ ۳۱۲ ۔ [2] فکر اقبال

وہ یورپ کی تاریخ سے سبق لیں۔ انہیں چاہیئے کہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اول یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور پھر آگے قدم بڑھائیں پھر جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان سے نہ فکر انسانی پر کوئی روک قائم ہے نہ وضع آئین و قانون پر اس کے برعکس ان میں وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور و فکر کو اور تحریک محسوس ہوتی ہے قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک روک تصور کرے لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے جس کا خیال کچھ تو اس لئے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ عہد حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہ کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔ اگر ہمارے افکار میں وسعت و دقت نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے احوال و تجربات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید سے کام لیں۔[1]

اقبال نے "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کے نام سے اسلامی فکر کی اشاعت کے لئے ایک علمی انجمن بھی بنائی تھی۔ ان کے ان کارناموں کے علاوہ ان کے کلام میں اسلام کی روح ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے جس میں اسلامی تاریخ، اسلامی اشخاص، اسلامی طرز فکر اور سابقہ ہی علماء سو پر تنقید صحیح اسلامی نظام کے تشکیل کی دعوت اور اقامت دین الٰہی کی سعی سے پورا کلام زعفران زار ہے ہندوستان کے دور جدید کے مصلحین کی صف اول میں ان کا نام روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور صدیوں تک ان کے افکار اصلاح امت کا کام کرتے رہیں گے۔

سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دیگر دانائے راز آید کہ نہ آید

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۵۱ تا ص ۲۷۵ ترجمہ نذیر نیازی بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء

ترجمہ
کتاب الاذکار

مولانا محمد قمر الزماں صاحب بیت المعارف الٰہ آباد

امام نووی متوفی ۶۷۶ھ نہ صرف حدیث و فقہ کے امام تھے بلکہ زہد و اتقا اور اعلاء کلمۃ اللہ کے اعتبار سے بھی وہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، علم و زہد کے اس اجتماع کی وجہ سے ان کی تحریروں اور کتابوں میں بے نفسی روحانیت اور بڑا اعتدال دکھائی دیتا ہے، یہ خوبیاں شرح مسلم اور ریاض الصالحین میں بھی صاف طور پر نمایاں ہیں اور ان کی کتاب تہذیب الاسماء واللغات اور روضۃ الطالبین اور شرح المہذب میں بھی اچھی چیزیں ان کی کتاب الاذکار میں بھی موجود ہیں جس کا ترجمہ برادرم مولانا قمر الزماں صاحب نے کیا ہے، اس کتاب کا پورا نام حلیۃ الابرار وشعار الاخیار فی تلخیص الدعوات والاذکار ہے مگر عام طور پر یہ کتاب الاذکار کے نام سے مشہور ہے۔

ذکر و اذکار کے بہت سے طریقے صوفیاء کے معمولات میں داخل ہیں، مگر وہ اذکار جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ہیں وہ نہ صرف فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن پاک کا عکس معلوم ہوتے ہیں بلکہ ان میں انسانی احتیاجات اور نفسیات کی جتنی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ خود اہل حاجت بھی اپنے جذبات کی اس سے اچھی ترجمانی نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ جس نیک مقصد سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ پورا ہو۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الواحد القهار العزيز الغفار، مقدر الأقدار، مصرف الأمور، مكور الليل على النهار، تبصرة لأولي القلوب والأبصار، الذي أيقظ من خلقه من اصطفاه فأدخله في جملة الأخيار، ووفق من اجتباه من عبيده فجعله من المقربين الأبرار

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو ایک ہے، بہت سخت پکڑ والا ہے بہت زبردست اور بخشنے والا ہے، اور جو تقدیروں کو مقدر کرنے والا ہے، تمام امور کا تصریف کرنے والا ہے رات کو دن میں تبدیل کرنے والا ہے دل و آنکھ والوں کے لئے روشنی ہے۔ جس نے اپنی مخلوق سے جس کو منتخب کیا اس کو بیدار کیا پس اس کو نیک لوگوں میں داخل کر دیا اور جس کو چن لیا اس کو خیر کی توفیق دی بس اس کو

وبصرهم من احبه فرهّبهم فی هذه الدار فاجتهدوا فی مرضاته والتاهب لدار القرار، واجتناب ما یسخطه والحذر من عذاب النار واخذوا انفسهم بالجد فی طاعته وملازمة ذکره بالعشی والابکار، وعند تغایر الاحوال وجمیع آناء اللیل والنهار، فاستنارت قلوبهم بلوامع الابرار، احمده ابلغ الحمد علی جمیع نعمه، واسأله المزید من فضله وکرمه۔

واشهد ان لا اله الا الله العظیم، الواحد الصمد العزیز الحکیم، واشهد ان محمدا عبده ورسوله، وصفیه وحبیبه وخلیله افضل المخلوقین واکرم السابقین واللاحقین، صلوات الله وسلامه علیه وعلی سائر النبیین، وآل کل وسائر الصالحین،

اما بعد۔ قال الله تعالی۔

فاذکرونی اذکرکم

اپنے نیک بندوں اور مقربین میں شامل کیا اور جس سے اس نے محبت کی اس کو بصیرت عطا فرمائی پس اس کو اس دنیا میں زہد و تقوی کی توفیق دی پس انہوں نے رب کی رضامندی اور آخرت کی تیاری کی کوشش کی اور اس کی ناراضگی اور عذاب نار سے بچنے کی کوشش کی اور انہوں نے صبح و شام، رات و دن اور حالات کے تغیر و تبدل کے وقت اس کی طاعت و ذکر و اذکار کو اپنے نفس پر لازم کر لیا، پس ان کے دل نیکی و بھلائی کی روشنی سے منور ہو گئے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں جس طرح تعریف کی جا سکتی ہے اس کے تمام نعمتوں پر اور اس سے اس کے فضل و کرم میں اور زیادتی کا سائل ہوں۔

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالی کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو کہ بہت بڑا، یکتا، بے نیاز اور غالب حکمت والا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اس کے مخلص، حبیب اور دوست ہیں، ساری مخلوق سے افضل ہیں اور سارے گزرے ہوئے اور آنے والے لوگوں میں سب سے زیادہ کریم ہیں ان پر اللہ تعالی کا درود و سلام ہو اور سارے نبیوں پر اور سارے نبیوں کی آل و اولاد پر اور تمام نیک بندوں پر۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا

تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا

نیز اللہ کا ارشاد ہے

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون — میں نے جن و انسان کو اپنی عبادت ہی کیلئے پیدا کیا ہے

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ بندہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ اللہ

سب سالکین کو کیا گیا اور اس کے ذکر سے اس کا دل محو ہے اور اس کے ذکر کی بہترین صورت وہ
اذکار ماثورہ ہیں جو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ اسی لئے علمائے کرام نے آپ کے
شب و روز کے اعمال اور ادعیہ و اذکار کے سلسلے میں بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن
کو اہل معرفت جانتے ہیں لیکن وہ کتابیں مکررات اور اسانید کے ذکر کی وجہ سے بہت
طویل ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے بہت سے طالبین ان کے مطالعہ کی ہمت نہیں کر پاتے
اس لئے میں نے اہل شوق کے لئے آسان انداز میں ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کر لیا
اور اختصار کا لحاظ کرتے ہوئے اسے شروع کر دیا تاکہ اعتناء و توجہ کرنے والوں کے لئے
تقریب ذکر کا ذریعہ بن جائے اور میں نے اختصار کی وجہ سے جیسا کہ اوپر ذکر چکا ہوں اکثر جگہ
اسانید کو حذف کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ تالیف خاص طور سے عبادت گذاروں کے
کام کی ہے اور کچھ لوگوں کے علاوہ اکثر لوگوں کو سندوں سے کوئی سروکار (تعلق) نہیں رہتا ہے
بلکہ اس کے تھوڑے سے ذکر کو بھی کو وہ ناپسند کرتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ اس کتاب کا مقصود
مسترشدین کیلئے اذکار کی معرفت اور اس پر عمل اور اس کے مظان کی ایضاح و توضیح ہے اور میں
انشاء اللہ اس میں اسانید سے اہم چیزیں بیان کروں گا جن کے بیان سے عام طور پر بخل کیا گیا ہے
اور وہ حدیث کی صحت و حسن و نکارت کا بیان ہے اس لئے کہ اس کی ضرورت تو چند گنے
چنے محدثین کے علاوہ سبھی کو ہے۔ اور قابل اعتنا چیزوں میں یہ سب سے اہم ہے۔
اور میں انشاء اللہ اس کتاب میں علم حدیث کے نفائس اور علم فقہ کے دقائق، اور اہم قواعد،
ریاضات نفوس کے اسرار اور ایسے آداب کو شامل کروں گا جن کی معرفت سالکین راہ کے لئے
انتہائی ضروری ہے۔ اور جو کچھ میں بیان کروں گا وہ ایسا واضح ہوگا کہ اس کا سمجھنا عوام اور اہل علم
سب کے لئے آسان ہوگا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ "جس نے ہدایت کی طرف دعوت دی جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کا اجر اس
داعی کو ملے گا اور اس کا اجر عمل کرنے والوں کے اجر کو ذرا بھی کم نہ ہوگی"۔
اس لئے میں نے چاہا کہ اس طریقہ خیر کو آسان کر دوں اور اس کی طرف اشارہ اور اس

پر چلنے کے طریقہ کی توضیح اور راہنمائی کے ذریعہ اہل خیر حضرات کی مدد کروں۔ اس لئے میں شروع کتاب میں ایسی اہم فصلوں کا ذکر کروں گا جن کی ضرورت اس کتاب یا اس جیسی کسی اور کتاب کی طرف رغبت کرنے والوں کو پڑا کرتی ہے۔

چنانچہ کوئی صحابی جو قلیل العلم لوگوں کے نزدیک مشہور نہ ہوں تو ان سے جب ہم کسی روایت کو نقل کریں گے تو ان کے نام کے ساتھ صحابی کا لفظ بڑھا دیں گے تاکہ ان کی صحابیت کے بارے میں شک نہ کیا جائے۔

اور اس کتاب میں کتب مشہورہ ہی کی احادیث کے نقل کرنے پر اکتفا کروں گا اور کتب مشہورہ جو درحقیقت اصول اسلام ہیں پانچ ہیں، صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد و ترمذی و نسائی اور ان کتب کے علاوہ دوسری مشہور کتابوں سے بھی کچھ روایت کروں گا مگر اجزاء و مسانید سے حتی الامکان کوئی روایت نقل نہیں کروں گا اگر شاذ و نادر کوئی روایت نقل کروں گا تو اس روایت کے ضعف کو بھی ظاہر کروں گا۔ اور اصول مشہورہ سے بھی ضعیف روایات نقل نہ کروں گا مگر بہت کم اور اس کے ساتھ بھی اس کے ضعف کا اظہار کر دوں گا۔ یقیناً اس کتاب میں اکثر صحیح روایتیں نقل کروں گا۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی اصل ہوگی جس پر اعتماد کیا جائے گا۔ پھر یہ بھی مجھے خیال ہے کہ ہر بحث میں ایسی حدیثیں درج کروں گا جو مسئلہ میں واضح الدلالت ہوں۔

رب کریم سے توفیق وانابت واعانت و ہدایت اور صیانت کا سوال کرتا ہوں اور اسی لئے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ میں نے نیک مقصد کا قصد کیا ہے ان کو وہ آسان فرما دیں اور ہر طرح کے عزت و شرف کو میرے لئے دائمی فرما دیں اور اپنے دار کرامت اور جملہ وجوہِ مسرت میں مجھکو اور میرے احباب کو جمع فرمائیں۔ حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل ولاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العظیم۔

توکلت علی اللّٰہ	اللہ تعالیٰ پر میں نے توکل کیا	اعتصمت باللّٰہ	اللہ تعالیٰ کو میں نے پکڑا
استعنت باللّٰہ	اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی	فوضت امری الی اللّٰہ	اللہ تعالیٰ کو اپنا معاملہ سپرد کیا
واستودعت اللّٰہ دینی ونفسی	اپنے دین و جان کو اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت رکھا۔		

ووالدیّ واخوانی واحبابی وما ئر من احسن الیّ وجمیع المسلمین وجمیع ما انعم بہ علیّ وعلیھم من امور الاخرۃ والدنیا فانہ سبحانہ اذا استودع شیا حفظہ ونعم الحفیظ۔

اسی طرح اپنے والدین، اخوان و احباب اور تمام وہ چیزیں جن سے مجھ پر اور تمام مسلمانوں پر احسان کیا گیا ہے اور تمام وہ نعمتیں جو امور آخرت اور دنیا سے ہیں ان سے مجھ پر اور تمام مومنین انعام کیا گیا ہے ان سب کو آپ کے سپرد کرتا ہے اسلئے کہ اللہ سبحانہ کے پاس جب کوئی چیز ودیعت ہوگی تو وہ اس کی حفاظت فرمائے گا اسلئے کہ وہ بہترین حفیظ ہے۔

(فصل)

((تمام اعمال ظاہری و باطنی میں اخلاص وحسن نیت کا بیان))

اللہ تعالے نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا اُمِرُوا اِلا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاءَ۔

انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر یہ کہ وہ خالص ہو کر اسی کی عبادت کریں اور سب سے کٹ کر اسی کی طاعت کریں

نیز اللہ تعالے نے ارشاد فرمایا

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔

اللہ تعالے تک قربانی کے جانوروں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا بلکہ اس کے یہاں تمہارا تقوی پہنچتا ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تک تقوی کے پہو نچنے کا مطلب یہ ہے کہ نیتیں پہونچتی ہیں۔ یعنی جس نیت سے قربانی کرو گے اسی کے مطابق اجر ملے گا

اور حضرت عمر ابن خطاب سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ یقیناً ہر آدمی کے لئے وہ ہے جو اس نے نیت کیا، پس جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ و رسول ہی کیطرف سمجھی جائے گی اور جس کی ہجرت دنیا کے حصول کیلئے ہوگی یا کسی عورت سے نکاح کیلئے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف شمار کی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے، یہ حدیث صحیح ہے۔ اسکی صحت پر اتفاق ہے۔ اور اس کی جلالت شان اور عظمت مقام پر اجماع ہے اور یہ ان احادیث میں سے ہے جن پر اسلام کا مدار ہے اور سلف اور ان کے متبعین خلف سب ہی اپنی

مصنفات کو اسی حدیث سے شروع کرنے کو مستحب سمجھتے رہے ہیں تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو حسن نیت اور اس کی اہمیت و اعتناء کی طرف متوجہ کریں ۔۔۔ اور امام ابوسعید عبدالرحمن ابن مہدیؒ کی یہ روایت ہم تک پہونچی ہے کہ جو شخص کسی کتاب کی تصنیف کا ارادہ کرے تو اس کو چاہئے کہ اسی حدیث سے ابتدا کرے۔ اور امام ابوسلیمان خطابی نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ متقدمین تو امور دین میں سے ہر امر کی ابتداء سے پہلے حدیث انما الاعمال بالنیات کی تقدیم کو مستحب قرار دیتے تھے اس لئے کہ امور دین کے جملہ انواع میں اس کی حاجت عام ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ بات ہم تک پہونچی ہے کہ آدمی کی حفاظت اس کی نیت کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ کسی صاحب نے فرمایا کہ لوگ اپنی نیات کے اعتبار سے دیئے جاتے ہیں۔ اور سید جلیل ابوعلی فضل ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی وجہ سے عمل کو ترک کر دینا ریاء ہے اور لوگوں کے واسطے عمل کرنا یہ تو شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ان دونوں ہی سے تم کو عافیت دے۔ امام حارث محاسیؒ نے فرمایا کہ صادق وہ یہ ہے کہ اس کے صلاح و تقویٰ کی وجہ سے جو لوگوں کے قلب میں اس کی قدر و منزلت ہے نکل جائے تو اس کو اس کی پروا نہ ہو اور اپنے حسن عمل کے ایک شمہ و ذرہ کو بھی لوگوں کے سامنے ظہور کو پسند نہ کرے اور اس کی کسی برائی پر لوگوں کے مطلع ہو جانے کو ناپسند نہ کرے۔ اور حذیفہ مرعشی نے فرمایا کہ اخلاص یہ ہے کہ بندے کے افعال سامنے ظاہر و باطن سامنے پیچھے سب برابر ہو جائیں اور استاذ امام ابوالقاسم قشیری نے فرمایا کہ اخلاص یہ ہے کہ طاعت میں بس اللہ تعالیٰ ہی کا قصد کرے یعنی اپنی طاعت سے صرف اللہ کے تقرب کا ارادہ کرے نہ کسی دوسری چیز کا مثلاً مخلوق کے لئے تصنع یا لوگوں کے نزدیک مدح و نیک نامی و تعریف کا حصول یا مخلوق کی طرف سے مدح کی طلب و محبت وغیرہ۔ اور سید جلیل ابومحمد سہل ابن عبداللہ تستری نے فرمایا کہ دانشمندوں نے اخلاص کی تفسیر میں غور و خوض کیا تو سوا اس کے کچھ نہ پایا کہ بندے کی حرکت و سکون خواہ ظاہر میں ہو یا باطن میں، سب اللہ تعالےٰ کے لئے ہو اس میں نفس و خواہش اور دنیا کی ذرا آمیزش نہ ہو۔

اور حضرت استاذ ابوعلی دقاقؒ نے فرمایا کہ اخلاص مخلوق کی طرف نظر کرنے سے بچنے کا نام ہے اور صدق نفس کی مطاوعت سے پرہیز کرنے کا۔ بس مخلص کے اندر ریاء نہ ہوگا اور صادق عجب

سے پاک ہوگا۔ اور ذوالنون مصری نے فرمایا کہ تین چیزیں علامات اخلاص سے ہیں۔ عام لوگوں سے مدح و ذم کا برابر ہو جانا اور اپنے اعمال کے دیکھنے سے نسیان کا طاری ہو جانا، اور عمل کا ثواب آخرت میں چاہنا۔ اور امام قشیری سے روایت ہے کہ کم سے کم صدق یہ ہے کہ سر و علانیہ برابر ہو جائے۔ اور سہل تستری سے روایت ہے کہ وہ بندہ صدق کی بو بھی نہ پائے گا جو اپنے نفس یا غیر سے مداہنت کرے۔ اکابر کے اقوال اخلاص کے بارے میں کثیر ہیں مگر جتنے کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے وہ صاحب توفیق کے لئے کافی ہے۔

(**فصل**) جان لو کہ جس شخص کو فضائل اعمال کے سلسلہ کی کوئی حدیث پہونچے تو کم از کم ایک مرتبہ اس پر ضرور عمل کرے تاکہ اس کا شمار حدیث پر عمل کرنے والوں میں ہو جائے اور یہ تو بالکل ہی نا زیبا ہے کہ اس کو بالکل چھوڑ دے (ایک مرتبہ بھی عمل نہ کرے) بلکہ جہاں تک آسانی سے ہو سکے اس پر عمل کرے، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کی صحت پر اتفاق ہے، یہ ہے کہ "جب کسی شئی کا میں حکم دوں تو حسب استطاعت اس پر ضرور عمل کرو"

(**فصل**) علمائے محدثین و فقہاء وغیرہم نے فرمایا کہ ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال میں ضعیف حدیثوں پر عمل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے مگر ہاں وہ موضوع[1] نہ ہو۔

بہر حال احکام جیسے حلال، حرام، بیع، نکاح اور طلاق وغیرہ تو اس میں صحیح یا حسن ہی حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ ہاں اگر ان میں سے کسی امر میں احتیاط برتنا ہو تو ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں مضائقہ نہیں ہے مثلاً بعض بیع یا نکاح کی کراہیت میں حدیث ضعیف وارد ہوتی ہے تو اس سے احتراز مستحب ہے مگر واجب نہیں ہے۔

اور میں نے یہ فصل اس لئے قائم کی ہے کہ اس کتاب میں بہت سی احادیث آئیں گی جس کی صحت یا حسن یا ضعف کی میں تصریح کروں گا یا اس سے ذہول یا کسی دوسری وجہ سے سکوت اختیار کروں گا۔ پس میں نے ارادہ کیا کہ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کے

---

(۱) موضوع ہی کے حکم میں وہ حدیث بھی ہے جسکی اسناد شدید ضعیف ہو، پس اس جز پر عمل جائز نہیں ہے جو کسی کذاب یا متہم سے مروی ہو (۲) اور اس کا شاہد نہ ہو۔ اور ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے لئے دو شرطیں ہیں اول یہ کہ اس کیلئے شاہد ہو مثل اسکے کہ وہ کسی (۳) عموم یا قاعدہ کلیہ کے لئے تحت داخل ہو۔ اور دوسرے یہ کہ عمل کرنے والا اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے بلکہ احتیاط کا عقیدہ رکھے۔ (۴) (یعنی اس کو واجب نہ سمجھے بلکہ اس کا عمل احتیاط کے طور پر ہو)

سامنے یہ قاعدہ مقرر ہو جائے (تاکہ اعمال کے درجات کو معلوم کرنے میں دقت نہ ہو)

(فصل) سمجھ لو کہ جیسے ذکر مستحب ہے ویسے ہی اہل ذکر کے حلقوں میں بیٹھنا بھی مستحب ہے اس پر بہت سے دلائل تو یہ موجود ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ مناسب مواقع پر مذکور ہوں گے۔

اس باب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیث کافی وافی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب جنت کی کیاریوں سے گذرو تو خوب چرو تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ؟ جنت کی کیاریاں (اس دنیا میں) کون سی ہیں تو ارشاد فرمایا کہ ذکر کے حلقے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کے کچھ ایسے فرشتے ہیں کہ ذکر کے حلقوں کی تلاش میں سیر کرتے پھرتے ہیں پس جب ان حلقوں تک پہونچتے ہیں تو ان کو گھیر لیتے ہیں۔۔

اور صحیح مسلم میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک حلقہ پر گذرے تو فرمایا کہ تم لوگوں کو یہاں کس مقصد نے بٹھلایا ہے ؟ تو ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم یہاں اس لئے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا ذکر کریں اور اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کریں کہ ہم کو اسلام کی طرف ھدایت دی اور اس کے ذریعہ ہم پر احسان فرمایا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا واللہ اسی مقصد نے تم کو یہاں بیٹھنے پر آمادہ کیا ہے ؟ اور یہ سن لو میں تم سے جو اس بات پر قسم لے رہا ہوں تو اس لئے نہیں کہ تم کذب کے ساتھ متہم ہو۔ بلکہ اس لئے کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ پس انھوں نے یہ بتلایا کہ اللہ تعالےٰ تمہارے ذریعہ فرشتوں پر فخر فرمارہے ہیں۔

اور صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ جو بھی جماعت اللہ تعالیٰ کے ذکر کیلئے بیٹھتی ہے تو اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ اپنے پاس والوں میں ان کا ذکر فرماتے ہیں

حضانت

یعنی بچے کی پرورش

مجیب اللہ ندوی

> اس سے پہلے الرشاد کے کئی نمبروں میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی تفصیل آچکی ہے اس مضمون میں ان کی ایک مشترکہ ذمہ داری کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جاتی ہیں

بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں۔ شوہر و بیوی کے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا ایک اہم فرض بچے کی پرورش بھی ہے۔ اور یہ دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ یعنی بچے کی پرورش دونوں کو مل جل کر کرنا چاہیئے۔ پہلے دودھ پلانے کے سلسلے میں جو ماں باپ کے حقوق کی تفصیل کی گئی ہے، وہ بھی اسی حضانت ہی کی ایک شاخ ہے۔ بچے کی ابتدائی پرورش ہی پر اس کی ساری زندگی کی بھلائی اور برائی کا دار و مدار ہوتا ہے اس لئے اس فرض کے سلسلے میں ماں باپ کو غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ دنیا میں بھی اس کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے اور آخرت میں بھی ان سے اس کی باز پرس ہوگی۔

بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہمیت

بچے کی پرورش کی ذمہ داری کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ماں باپ اس کی جسمانی پرورش اور نشو و نما کا سامان فراہم کردیں بلکہ اس کی جسمانی نشو و نما کے ساتھ اس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح، اس کی تعلیم و تربیت بھی ان کے اوپر واجب ہے۔ دونوں طرح کی تربیتوں کی شریعت میں تاکید آئی ہے، خاص طور پر ان کی دینی اصلاح اور تعلیم و تربیت پر قرآن پاک اور حدیث نبوی میں بہت زور دیا گیا ہے۔

جسمانی پرورش کے احکام

قرآن کے حکم کے مطابق ماں کا فرض یہ ہے کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی دودھ پلانا شروع کر دے اور اگر وہ معذور ہو یا باپ کو استطاعت ہو یا دونوں راضی ہوں، تو وہ

دوسری عورت سے بھی دودھ پلوا سکتے ہیں اگر کوئی ماں باپ ایسے ظالم ہوں کہ وہ اس فرض کو انجام نہ دیں تو سخت گناہ گار رہوں گے اور اگر نانا نانی یا دادا دادی وغیرہ کوئی نہ ہو تو دوسرے قریبی رشتہ داروں پر اس کی پرورش کرنا ضروری ہے اگر باپ موجود ہے تو اس کو بچے کی پرورش کا پورا خرچ دینا ہوگا اگر کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو تو خاندان کے لوگ اس کی پرورش کریں ماں باپ یا رشتہ دار اگر اس کی پرورش نہ کریں تو ایسے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے ذمے ہوگی، پہلے وہ ماں باپ یا رشتہ داروں کو پرورش کیلئے مجبور کریگی اگر کسی وجہ سے وہ معذور ہوں گے تو اس کا خرچ حکومت خود برداشت کرے گی۔

بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں لوگ عموماً لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر لڑکیوں کی پرورش کی تاکید کی ہے آپ نے فرمایا ہے!

مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا	جس کے کوئی لڑکی ہو اور اس نے اس کو زندہ گور
وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ	نہ کیا اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہیں دی تو
عَلَيْهَا الذُّكُورَ أَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ	اللہ تعالے اس کو جنت میں داخل کرے گا

آپ نے فرمایا کہ جس نے اپنی تین لڑکیوں کی پرورش اور کفالت اس وقت تک کی، جب تک کہ وہ اس سے بے نیاز نہیں ہو گئیں۔ یعنی ان کا شادی بیاہ ہو گیا تو اس کے اوپر جنت واجب ہے ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اگر کوئی ایک کے بارے میں سوال کرتا تو ایک کے بارے میں بھی آپ یہی فرماتے۔ (شرح السنۃ)

بچوں کی پرورش کی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے دودھ چھوڑنے کے بعد ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، بعد میں جب ان کو علم ہوا کہ مائیں وقت سے پہلے دودھ چھڑا دیتی ہیں کہ ان کو وظیفہ مل جائے تو پھر آپ نے پیدا ہوتے ہی ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

بچے کی پرورش کی مدت | لڑکے کی پرورش کی مدت سات برس اور لڑکی کی پرورش کی مدت نو برس ہے۔ اس مدت تک پرورش کی نگرانی ماں کے ذمے ہوگی اور ماں اور بچہ دونوں کا خرچ باپ

کو برداشت کرنا ہوگا، اور یہ ماں کا ایک ایسا حق ہے کہ اگر اس کو طلاق مل چکی ہو جب بھی بچے کو سات برس تک اور بچی کو نو برس تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور باپ سے اس کے اخراجات لے سکتی ہے باپ اس سے بچے کو نہیں لے سکتا، البتہ اگر طلاق کے بعد ماں خود خوشی سے بچے کو حوالہ کردے یا وہ اجنبی جگہ نکاح کرلے تو پھر باپ کو اس کی پرورش کرنی ہوگی اور اس کی مطلقہ ماں پرورش کے حق سے محروم ہوگئی[۱]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا یا رسول اللہ یہ میرا بچہ ہے، جو میرے پیٹ میں پلا ہے میری چھاتی کا دودھ پیتا ہے، اور اس کے لئے میری گود آرام گاہ ہے۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور میرے اس لخت جگر کو مجھ سے جدا کرلینا چاہتا ہے۔ آپ نے اس کی داستانِ غم سن کر فرمایا کہ اَنْتِ اَحَقُّ بِہٖ مَالَمْ تَنْکِحِیْ تم اس وقت تک اس کی زیادہ مستحق ہو جب تک تم دوسرا نکاح نہ کرلو۔ (ابوداؤد)

اگر عورت خدانخواستہ مرتد ہوجائے، یعنی اپنا دین بدل دے، یا پاگل ہوجائے تو بچے کو اس کی پرورش اور نگرانی میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر وہ بداخلاق وبدکردار ہو یعنی اس میں ایسے اخلاقی عیوب ہوں مثلاً زنا۔ چوری، گانا بجانا وغیرہ، جن کی موجودگی میں بچے کے ضائع (اور برباد) ہوجانے کا اندیشہ ہو تو ایسی عورت کی نگرانی اور گود میں بچے کو نہیں دیا جاسکتا[۲]۔ صاحب درمختار فاجرہ کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

يُضِيعُ الْوَلَدُ بِهٖ كَزِنَاءٍ وَغِنَاءٍ وَسَرِقَةٍ، وَنِيَاحَةٍ	ایسے عیوب مثلاً زنا، گانا، بجانا، چوری اور مرثیہ خوانی جس سے بچہ برباد ہوجائے

پھر کہتے ہیں کہ عام طور پر "فاجرہ" کا لفظ فقہائے احناف مطلقاً لکھتے ہیں اس سے وہ عورت بھی مراد لی جاسکتی ہے، جو مستقلاً تارک نماز ہو، اور یہی مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ کا بھی ہے۔

بعض علماء نے بضیع الولد کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے اگر کوئی ایسی عورت ہے جو نماز روزے میں اتنی مشغول ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش کا اس کو مطلقاً خیال نہیں ہے، تو ایسی عورت کی نگرانی میں بھی بچہ نہیں دیا جاسکتا۔ مگر اس سلسلہ میں فقہائے احناف نے اس رائے کو زیادہ پسند کیا ہے کہ اگر ماں کا اخلاق وکردار اچھا نہیں ہے۔ جب بھی اس وقت تک بچے کو اس کے پاس رکھا

---

[۱] ومسلم عن غیرہ کم لسنۃ [illegible] ج ۲ ص ۱۶ [۲] ہدایہ ج ۲ ص [illegible] درمختار شامی ج ۲ صفحہ ۸۰۸

جائے۔ جب تک وہ بچہ سمجھدار نہ ہو جائے۔ سمجھدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کی حرکات و سکنات کا عملاً اثر نہ لینے لگے۔

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ بچے کی جسمانی پرورش میں اس کی دینی اور اخلاقی تربیت کو بہرحال پیش نظر رکھا جائے گا۔

(۲) اگر ماں مطلقہ ہے اور اس نے کسی ایسے شخص سے نکاح کر لیا جس سے بچے کا کوئی ایسا نسبی تعلق نہیں ہے جس کی وجہ سے نکاح حرام ہو جاتا ہے تو اب اس کا حق پرورش جاتا رہا۔ البتہ اگر اس نے بچے کے کسی قریبی اعزہ ہی میں کسی سے نکاح کر لیا ہے، تو پھر اس کا حق اپنی جگہ پہ باقی رہے گا۔ پہلی صورت میں اس لئے اجازت دی نہیں گئی ہے کہ اس کے موجودہ شوہر کو بچے سے کوئی خاص انسیت نہ ہوگی بلکہ وہ بار محسوس کرے گا اور اس کا اثر ماں کے اوپر یہ پڑے گا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال اچھی طرح نہ کر سکے گی۔ دوسری صورت میں اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ چونکہ اس کا شوہر بھی بچے سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ تو ماں ہی ہے اس لئے اس کی دیکھ بھال سے دونوں کو دلچسپی ہوگی۔

ماں کے بعد پرورش کرنے کا حق (۳) ماں اگر پرورش کرنے کی اہل نہ ہو تو یعنی فاسقہ یا فاجرہ ہو یا اس نے انکار کر دیا ہو، یا اس نے کسی اجنبی سے نکاح کر لیا ہو تو اس کے بعد اس کی ماں یعنی بچے کی نانی کو پرورش کا حق ہے، اگر نانی نہ ہو تو پرنانی، اور یہ بھی نہ ہوں تو دادی کو، پھر حقیقی بہن کو، پھر ماں جائی اور سوتیلی بہن کو، پھر خالہ کو، پھر پھوپھی کو پرورش کرنی ہوگی۔

ان میں سے جس کی پرورش میں دیا جائے گا، انہی شرائط کے ساتھ دیا جائے گا جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی جس کا دین و اخلاق اچھا ہوگا اسی کو پرورش کیلئے دیا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ بچے کی دو خالائیں ہوں، یا دو پھوپھیاں ہوں، تو جو خالہ یا پھوپھی زیادہ پرہیزگار ہوگی اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔

باپ کے بعد خرچ کی ذمہ داری جب تک باپ موجود ہے، بچے کے اخراجات کی ذمہ داری باپ کے اوپر ہے۔ لیکن اگر باپ مرجائے تو اگر بچے کے نام پر کوئی جائداد یا نقد روپیہ ہے تو اسی سے اس کی پرورش کا خرچ لیا جائے گا اس کا ذکر حجر کے بیان میں آئے گا اور اگر اس کے نام کوئی جائداد یا روپیہ نہیں ہے، تو پھر بچے کی پرورش ان قریبی رشتے داروں کے ذمے ہے جو اس کے وارث ہو سکتے ہیں، اور ہر ایک پر میراث کے اعتبار سے خرچ کی ذمہ داری ہوگی۔ مثلاً اس کا دادا ابھی زندہ ہے

اور ماں بھی تو دو حصے کا خرچ دادا کو دینا پڑے گا، اور ایک حصہ ماں کو، اسی طرح دوسرے اعزہ پر اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داری ڈالی جائے گی۔

تعلیم وتربیت | بچے کی جسمانی پرورش اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ اسکی ذہنی واخلاقی تربیت بھی سب سے پہلے ماں کی اور اس کے بعد باپ کی سب سے بڑی ذمے داری ہے اگر انھوں نے اس کے جسم کی پرورش کی اور اس کے باطن کی تربیت نہ کی تو ایک طرف انھوں نے رشتۂ زوجیت کے ایک بڑے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، اور دوسری طرف معاشرہ میں صلاح پیدا کرنے کے بجائے فساد کا ایک مستقل بیج بو دیا، کیونکہ جس بچے کی ذہنی واخلاقی تربیت نہیں کی جائے گی تو اس سے یہی امید کی جا سکتی ہے کہ بڑا ہو کر وہ اپنے بال بچوں کے لئے اپنے خاندان اور پھر پورے معاشرے کے لئے دینی واخلاقی حیثیت سے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگا، گویا ایک لڑکے کی تعلیم وتربیت ایک فرد کی نہیں، بلکہ ایک خاندان اور ایک معاشرے کی تعلیم وتربیت دینے کے مرادف ہے اور اسمیں کوتاہی برتنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاندان اور ایک پورے معاشرے کو برباد کیا جا رہا ہے۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے جن کاموں کو صدقۂ جاریہ قرار دیا ہے ان میں ایک ولد صالح بھی ہے، کیونکہ اس کی نیکی سے، اس کو، اس کے بال بچوں کو، خاندان کو اور پھر پوری سوسائٹی کو فائدہ پہنچے گا، اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا جائے گا اور نہ جانے یہ فیض کب تک جاری رہے گا، اپنے بال بچوں کی تعلیم وتربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن پاک نے عام مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا	اے مسلمانو تم اپنی ذات کو اور اپنے اہل و
اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (تحریم)	عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ

اس چھوٹے سے فقرے میں تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کو نہایت جامع طور پر بیان کر دیا گیا ہے غور کیجئے، حکم یہاں آگ سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے ایک مسلمان کو اپنے بال بچوں کو ایسی ہی تعلیم اور ایسی ہی تربیت دینی چاہئے جو ان کو عذاب نار سے بچا سکے اور جو تعلیم وتربیت اس کو دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے، وہ تعلیم نہ تو تعلیم ہے اور نہ وہ تربیت، تربیت، اگر کوئی مسلمان اپنے بچے کو ایسی تعلیم وتربیت دیتا ہے، جو اسکو دوزخ میں لے جانے والی ہو تو پھر وہ نہ تو اپنے ایمان کے تقاضے کو پورا کر رہا ہے، اور نہ باپ اور سرپرست ہونے کی

حیثیت سے اپنی اس ذمہ داری کو پورا کر رہا ہے جو اس پر عائد کی گئی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ ہر شخص سے اپنی ذمہ داری کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ تم سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں قیامت میں بازپرس ہوگی۔

اچھی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں بے شمار ہدایتیں دی گئی ہیں چند حدیثیں ملاحظہ ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے آپ کا ایک دوسرا ارشاد ہے جس میں آپ نے بچے کی ایک تنبیہ کو ایک صاع صدقہ سے بہتر قرار دیا ہے۔

لَأَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ (مشکوٰۃ)

آدمی اپنے بچے کو کوئی ادب و تمیز کی بات سکھائے، تو یہ ایک صاع (ساڑھے تین سیر غلہ یا میوہ) صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

لوگ بچوں کے لئے روپیہ پیسہ جمع کرتے ہیں، ان کے لئے جائدادیں اکٹھا کرتے ہیں، ان کو مادی حیثیت سے خوش حال بنانے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں، جو ان کے بس میں ہوتا ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے سب سے بہترین عطیہ اور سب سے بہتر ہدیہ و تحفہ ان کی تعلیم و تربیت ہے۔

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهُ مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی)

کسی باپ کا اپنے بچے کے لئے اس لئے بہتر کوئی عطیہ نہیں ہے کہ وہ اس کو اچھی اور عمدہ تعلیم و تربیت دے۔

عملی تعلیم و تربیت آپ نے صرف نظری طور پر ہی تعلیم و تربیت دینے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ یہ تاکید بھی کی ہے کہ عملاً بھی ان کو اسی کے مطابق بناؤ اور اگر ضرورت ہو تو ان کو اس کے لئے سخت تنبیہ بھی کرو، آپ نے فرمایا کہ

جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو، اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ان کو مار کر نماز پڑھاؤ اور ان کو بستر سے علیحدہ کر دو (ابو داؤد) بستر سے علیحدہ کرنے کا حکم کتنی اخلاقی اور معاشرتی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کا اندازہ ہر سمجھ والا کر سکتا ہے تعلیم و تربیت کی اصل ذمہ داری عورت کے اوپر ہے اس کیلئے کہ ماں کی گود ہی بچہ کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے اس پہلی درسگاہ میں بچہ کی جیسی اچھی یا

بہتر تعلیم وتربیت ہوگی وہ زندگی بھر اس کے ساتھ رہے گی

بچوں کی پرورش کے سلسلے میں باپ ماں دونوں کو اور خاص طور پر ماں کو ان باتوں کا ضرور خیال رکھنا چاہئے

(۲) بچوں کے اخلاق وکردار پر سب سے زیادہ ماں کا اور پھر گھر بھر کے ماحول کا اثر پڑتا ہے اس لئے ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو درست رکھیں وہ اپنی زبان سے کوئی گالی گفتہ کی بات نہ نکالیں اور نہ بہت زیادہ چیخ کر بات کریں۔ ورنہ دہی عادت لڑکوں میں پڑے گی بچہ اگر گالی یا کوئی ناروا بات زبان سے نکالے تو اس پر خوش نہ ہوا جائے بلکہ اس کو تنبیہ کی جائے تاکہ دوبارہ وہ بات زبان سے نہ نکالے ماں باپ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ تعلیم کی عمر کو پہنچنے کے بعد بچے کو ایسی درسگاہ میں بھیجیں یا ایسے اساتذہ سے تعلیم دلائیں جن کی تعلیم وتربیت میں دین واخلاق کا پہلو کمزور نہ پڑنے پائے قرآن کی آیت قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا میں یہ بات شامل ہے

(۳) بچوں کو کھانا اور دودھ وغیرہ وقت سے کھلایا پلایا جائے۔ اس سے صحت اچھی رہے گی۔ ہر وقت کھانے کی عادت نہ ڈالی جائے۔

(۴) لڑکوں کا لباس زیادہ سے سادہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ لڑکوں کو سر پر ٹوپی اور لڑکیوں کو سر پر دوپٹہ ڈالے رکھنے کی تاکید کی جائے۔ بہت زیادہ بناؤ سنگار سے پرہیز کیا جائے، اس سے ان میں لحاظ وپاس اور حیا وشرم پیدا ہوتی ہے

(۴) ان کے کھیل کود کا بھی کچھ وقت ضرور مقرر کیا جائے۔ البتہ بدتمیز قسم کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے یا ان کے ساتھ رہنے سے روکا جائے۔

(۵) ان کو بڑوں کا ادب کرنے اور سب کو سلام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۶) بچوں اور بچیوں کو نماز کا عادی بنا جائے۔

(۷) اس وقت گھروں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے جو بے حیائی پیدا کر رکھی ہے اس سے کم سے کم بچوں کو تو ضرور دور رکھا جائے۔ اور ان کو اچھے قصے کہانیاں سنائی جائیں۔

(۸) بچوں کو اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے کی عادت ڈلوائی جائے۔ وہ خود اپنا بستر بچھائیں خود اٹھائیں اپنی چیزیں خود سلیقہ اور قرینہ سے رکھیں اور ان سے کبھی کبھی دوسروں کی خدمت بھی لی جائے۔

(۹) پڑھنے میں اگر بچہ سستی کرے تو اس میں ذرا بھی رعایت نہ کی جائے۔ بلکہ اس کیلئے سزا دی جائے اور ماں باپ خود اس کی تعلیم کی نگرانی کرتے رہیں کہ وہ تعلیم میں ترقی کر رہا ہے یا نہیں۔

(۱۰) دوسروں کی خدمت کرنے خاص طور پر مہمان کی خاطر مدارات کرنے کی ان کو عادت ڈلوائی جائے اور سائل کو ان کے ہاتھ سے پیسہ وغیرہ دلوایا جائے۔ تاکہ ان میں بلند حوصلگی اور سخاوت کی عادت پڑے۔

(۱۱) بچہ کی ہر ضد کو پورا نہ کیا جائے ورنہ آئندہ اس کے مزاج میں ضد پیدا ہو جائے گی۔

(۱۲) بچہ اگر بستر پر پیشاب کرے تو ماں کو چاہیئے کہ وہ فوراً دھو ڈالے۔ اور اس کے پیشاب کے مقام پر پانی ڈال دے۔ تاکہ اسے استنجا کی عادت پڑے۔ ہوشیار بچے کھڑے ہو کر بغیر استنجا پیشاب کریں تو ان کو سزا دی جائے۔

(۱۳) بچوں کو بہت سویرے نہ سونے دیا جائے اور صبح بہت سویرے اٹھانے کی عادت ڈالی جائے

(۱۴) اگر بچہ کوئی اچھا کام کرے تو اس کو شاباشی دینا چاہیئے۔ بلکہ بچہ کو انعام بھی دیا جائے تو بہتر ہے اور اگر برا کام کرے تو اس کی برائی اس کو سمجھانا چاہیئے اور ضرورت کے وقت سزا دی جائے

(۱۵) کوشش کی جائے کہ بچے کوئی کام چھپا کر نہ کریں اور چھپا کر کوئی چیز خریدیں۔ اگر غلط کام کریں تو اس کو سمجھا دیا جائے مگر وہ اسے بھی چھپا کر نہ کریں اور نہ جھوٹ کی عادت پڑنے پائے۔

(۱۶) ہوشیار ہونے کے بعد بچیوں سے پورا کام لیا جائے۔ اور ان کو سینے پرونے، کھانا پکانے کی عادت ڈالی جائے، جو لوگ لاڈ پیار میں ان سے گھر کے اندر کا کام نہیں لیتے وہ ان کے مستقبل کو خراب کرتے ہیں، ایسی لڑکیاں عموماً شوہر اور سسرال والوں پر بوجھ ہوتی ہیں

بقیہ رشحات :۔ ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جب بعض صحابہ نے کچھ منافقین کے قتل کا مشورہ دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ لوگ کہینگے کہ محمدؐ اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کے قتل سے بھی باز نہیں آتے۔

ظاہر ہے کہ منافقین صرف ظاہری طور پر مسلمان تھے مگر دشمنوں کے سامنے اس سے اپنی کمزوری ظاہر ہوتی اسلئے آپؐ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔

نفحات البردہ

شرح قصیدہ بردہ

از ڈاکٹر ایم۔اے رشادی

محمد بن سعید صنہاجی بوصیری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۶۰۸ھ کے قصیدۂ بردہ کو جو مقبولیت اللہ تعالیٰ نے عطا کی وہ شاید ہی کسی زبان کے کسی قصیدہ یا نعتیہ کلام کو حاصل ہوگی، اہل زبان نے زبان کی حیثیت سے اور اہل دل نے اس کی روحانی و معنوی کیفیت کی وجہ سے اسے ہمیشہ اپنی آنکھوں سے لگایا اور سویدائے قلب میں اسے جگہ دی اسکی مقبولیت اور پذیرائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، اور چالیس سے زیادہ اس کی شرحیں لکھی گئیں، اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہماری مجلس ادارت کے ایک رکن ڈاکٹر مولانا مختار احمد صاحب رشادی نے بھی اس کی ایک اردو شرح لکھنی شروع کی ہے، ماشاء اللہ ان کو عربی زبان کا ذوق بھی ملا ہے، اور ساتھ ہی اہل دل کی صحبتوں کے بھی وہ لذت شناس ہیں اس لئے ان کی تشریحات میں بھی ایک خاص قسم کی حلاوت محسوس ہوتی ہے، اس لئے ناظرین الرشاد کی خدمت میں اس کے دو شعر کی تشریح پیش کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) أمن تذکر جیران بذی سلم .

مزجت دمعاً جری من مقلۃ بدم

ترجمہ:۔ کیا مقام ذی سلم کے پڑوسیوں کی یاد میں تیری آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی ہیں،

لغوی تحقیق:۔

أ :۔ حرف استفہام بمعنی کیا،
تذکرا :۔ یاد کرنا باب تفعل سے
جیران :۔ جار کی جمع ہے بمعنی پڑوسی، اس کا مصدر جِوَارٌ ہے جس کے معنی پناہ طلب کرنا اور مدد کی درخواست کرنا ہے، یہاں پر جَوْرٌ اور جِوَارٌ کے درمیان فرق معلوم کرلینا ضروری ہے کیونکہ مادہ، (ج، و، ر) دونوں کا ایک ہی ہے لیکن دونوں کے معنی ومفہوم میں بہت فرق ہے، کیونکہ جَوْرٌ کے معنی لغت میں عن کے صلہ کے ساتھ راستہ سے ہٹ جانا اور علیٰ کے صلہ کے ساتھ ظلم کرنا ہے، جارعن الطریق، راستے سے ہٹ گیا جَارَعلیہ، اس پر ظلم کیا،
اس کے برعکس مصدر جِوَارٌ میں پناہ دینے کا مفہوم مضمر ہے چونکہ کمزور حضرات عموماً طاقت ور کے قرب وجوار میں رہائش اختیار کرتے ہیں تاکہ محفوظ ومامون رہ سکیں اسی لئے لفظ جار پڑوسی اور ہمسایہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے،
ذی سلم :۔ ذی سلم ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے جہاں سلم کے درخت زیادہ پائے جاتے ہیں، سلم ایک درخت کا نام ہے جو پیلو کی مانند ہوتا ہے۔
مَزَجْتَ :۔ تو نے ملا دیا، مصدر مزجٌ اور مزاجٌ ہے جس کے معنی ملانے کے آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مزج الشراب بالماء یعنی شراب میں پانی ملا دیا،
دمع :۔ ماء العین یعنی آنسو ج دموعٌ
دمٌ :۔ ج دماءٌ۔ وہ سرخ سیال مادہ جو کسی حیوان کی رگوں میں دوڑتا ہے یعنی خون، اس کی اصل دمیٌ یا دموٌ ہے کلمہ لام کو حذف کرکے میم سے بدل دیا گیا، جس کی وجہ سے دمٌ ہوگیا چنانچہ اس کا مثنیٰ دمان، دمیانِ و دموانِ آتا ہے،
جریٰ :۔ جاری ہوا، مصدر جریٌ وجریان ہے،
مُقْلَۃٌ :۔ آنکھ کا ڈھیلا، یا خود آنکھ کے معنی میں بھی مستعمل ہے، ج مُقَلٌ
توضیح :۔ دنیا میں انسان کسی نہ کسی کو یاد کرتا اور اس سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اہل ہوس

عشاق اپنے محبوب مجازی کی یادیں دامن کے چاک اور گریباں چاک کے فاصلہ کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اور تصور جاناں میں شب و روز کے کتنے قیمتی لمحات تکمیل ہوس کی تمنا میں برباد کر ڈالتے ہیں۔

عشق و محبت انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہ انسان کے ظرف کی بات ہے کہ وہ محبت کی روحانی عظمت کو باقی رکھتا ہے یا اسے سطحی جذبات کی نذر کر دیتا ہے۔ اگر وہ ہوا و ہوس کے جذبات سے عشق و محبت کا قصر تعمیر کرتا ہے تو اس قصر کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی محبت کا مرکز جمال الٰہی کی ضوفشانی اور اس کے رسول کے شیوہائے دلدار کو بناتا ہے تو وہ اپنے دل میں یاد محبوب کا ایسا قصر تعمیر کرتا ہے جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا اور صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس کے ظاہری و باطنی شکوہ میں کوئی فرق نہیں آتا جسکی بنیادیں سراکی گہرائیوں تک پہونچی ہوئی ہیں اور جس کی بلندیاں پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی اونچی دکھائی دیتی ہیں۔

کتنے سو سال گذر چکے، امام بوصیری نے مدح رسول کا ایک قصر حسین تیار کیا تھا لیکن آج بھی دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر ابھی حال ہی میں ہوئی ہے۔

کیوں نہ ایسا ہو، جبکہ اس میں مٹی اور چونے کا گارا استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی ایک ایک اینٹ خون دل کی گرمی میں پکائی گئی ہے۔

امام بوصیریؒ اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ تیرے اضطراب دل، درد و الم اور خونناب فشانی کا حقیقی سبب محبوب کی یاد ہے راز داران محبت اور واقفان رموز عشق اس فلسفہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ عاشق صادق کو ہر اس چیز سے محبت ہوتی ہے جس کا تعلق اس کے محبوب سے ہے ورنہ کہاں مقام ذی سلم اور کہاں وہ محبوب حقیقی لیکن ذی سلم کو اس محبوب سے نسبت حاصل ہے اس لئے اس کے ہمسایوں کی یاد نے اس کو اشکبار کر دیا،

حقیقت یہ ہے کہ یاد زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے بلکہ حاصل زندگی ہے، عارف ... مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہٗ نے اس حقیقت کی عارفانہ اسلوب میں

کیا خوب ہی ترجمانی کی ہے۔

تیری یاد دل کی سرے دوا ترا نام روح کی ہے شفا
ترا بھولنا مری موت ہے ترا ذکر حاصل طور ہے

۲ أم هبت الريح من تلقاء كاظمة
أو أومض البرق في الظلماء من إضم ،

ترجمہ :۔ یا مقام کاظمہ کی سمت سے ہوا چلی ہے یا تاریکیوں میں جبل اضم کی جانب سے بجلی چمکی ہے ،

لغوی تحقیق :۔

أم :۔ حرف استفہام بمعنی یا

هبت :۔ صیغہ واحد مونث غائب بمعنی (ہوا) چلی ۔ مصدر هبّ وهبوب ہے ہوا چلنا ،

ريح :۔ ہوا ، مؤنث سماعی ہے ج ۔ رياح"

تلقاء :۔ جانب ، سمت ، اسم مصدر ہے مادہ ل ، ق ، ی ہے

كاظمة :۔ ایک مقام ہے جس کو دیار حبیب سے نسبت حاصل ہے

أوْ :۔ حرف بمعنی یا اس شعر میں بطور عطف استعمال ہوا ہے حیرت واسجاب کو ظاہر کرتا ہے

أومض :۔ مادہ و ، م ، ض ہے ، مصدر الایماض ہے

اومض البرقُ ، لمع خفيفا ، یعنی بجلی ہلکی سی چمکی

البرق :۔ بجلی ، ج بروق

ظلماء :۔ بمعنی تاریکی ، روشنی کا ختم ہوجانا ، ليلةٌ ظلماءُ ، اندھیری رات ،

اضم :۔ ایک پہاڑ کا نام ہے جو مدینہ منورہ کے قرب وجوار میں ہے ،

توضیح :۔ ذکر محبوب کی یاد سے قلب میں تموج پیدا کرنے اور آنکھوں کو اشکبار کرنے کے یوں تو بہت سے اسباب ہوتے ہیں لیکن صاحب قصیدہ یہاں اسکے دو امکانی اسباب کا ذکر کرتے ہیں کہ یاد محبوب میں میری آنکھیں جو اچانک اشکبار ہو گئی ہیں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دیار حبیب کے مقام کاظمہ سے جو ہوائے نامبر چلی ہے اپنے دوش پر کوئی پیغام لائی ہے جس نے دل کے

تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے آنکھوں سے خون آلود آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔

یا دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جبل اضم سے جس کا تعلق دیارِ حبیب سے ہے، جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے بجلی چمکی ہے جس نے دریائے اشک کی موجوں میں ہیجان برپا کر دیا ہے،

عاشق صادق کے احساسات بہت ہی لطیف اور بہت ہی حساس (Hypersensitive) ہوتے ہیں ہواؤں کی ان لہروں میں ہم بھی سانس لیتے ہیں اور انھیں فضاؤں میں یہ ساری آوازیں گونجتی رہتی ہیں لیکن ہم کسی آواز کو محسوس نہیں کر پاتے لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حساس تار ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی ہوئی آوازوں اور تصویروں کو گرفت کر لیتے ہیں کیونکہ ظاہری اور مادی اسباب کے بغیر ان تاروں کا کنکشن اس اسٹیشن سے ہوتا ہے۔

اسی طرح جس کے دل میں محبت ہوتی ہے اس کے دل کا ٹیلی ویژن محبوب کی ہر ادا اور ہر آواز کو ٹیپ کر لیتا ہے اور بعد مسافت و بعد زمانے کے باوجود بھی وہ اس سے متاثر ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر دیارِ حبیب سے کوئی ہوا گذر کر آتی ہے تو وہ اس کو بھی محسوس کر لیتا ہے کہ یہ کس کے زلف عنبریں کی خوشبو اس میں بسی ہوئی ہے جو مشام جان کو معطر کر رہی ہے۔

اور اگر تاریکیوں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے تو یادوں میں تموج پیدا کر کے آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتی ہے،

الہ آباد بورڈ کے عربی فارسی امتحانات

(مجیب اللہ ندوی)

یوپی گورنمنٹ کی طرف سے الہ آباد بورڈ کے امتحانات کا جو سلسلہ انگریزوں کے دور سے شروع کیا گیا تھا وہ آزادی کے بعد بھی برقرار ہے، بلکہ اس وقت یوپی کے مشرقی اضلاع میں اس نے ایک وبا کی شکل اختیار کرلی ہے، جو پرانے مدرسے ہیں وہاں تو بہرحال تعلیم و تربیت کا کچھ کام ہو رہا ہے مگر جو سیکڑوں کی تعداد میں مدرسے اس وقت سے قائم ہو گئے ہیں جب سے گورنمنٹ نے ایڈ دینا شروع کر دیا ہے ان میں اکثر مدرسے صرف کاغذی خانہ پری پر چل رہے ہیں، اور جو پرانے مدرسے ہیں اور جن کے پیچھے قابل ذکر تاریخ ہے وہ بھی فرضی کاغذی خانہ پری میں کچھ کم نہیں ہیں، ان امتحانات نے نہ صرف عربی مدارس کی اس روح حریت اور دینی حمیت کو نقصان پہونچایا ہے جسکیلئے ہمارے بزرگوں نے ان مدارس کو بڑی تنگی زیستی کے ساتھ قائم کیا اور چلایا تھا، بلکہ ان کے نقطۂ نظر میں آخرت طلبی پر دنیا طلبی غالب آتی جارہی ہے، اس سلسلہ میں ہم عربی مدارس کے اساتذہ اور ذمہ داروں کی خدمت میں چند باتیں پیش کرتے ہیں۔ کاش وہ ان پر غور کرتے تو ملت کا یہ اتنا بڑا سرمایہ ضائع ہونے سے بچ جاتا،

سب سے پہلی بات ہمارے لئے قابل غور یہ ہے کہ الہ آباد بورڈ کے عربی و فارسی کے امتحانات کا سلسلہ کیوں شروع کیا گیا اور ان سے حکومت کا کیا فائدہ اور نقصان تھا یا ہے، یہ امتحانات انگریزی حکومت کے عہد میں اسلئے شروع کئے گئے کہ انھوں نے اندازہ لگایا کہ انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک اٹھتی ہے اور بغاوت کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اس میں سب سے آگے عربی مدارس کا پروردہ یہ مولوی طبقہ رہتا ہے اور چونکہ ملازمتوں اور ان کے در کی دریوزہ گری سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہا ہے اسلئے اس کے اندر دینی حمیت و غیرت جہاد کی روح اور آزادی کی اسپرٹ موجود رہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طبقہ کے اس جذبۂ جہاد و حریت فکر کو اگر ختم نہیں تو کم کیا جائے ظاہر ہے کہ براہ راست اس حلقہ کو جدید تعلیم گاہوں تک لاکر اس کے اس جذبہ کو سرد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ جدید تعلیم گاہیں کھول کر انھوں نے تجربہ کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ ان کے عقائدی قلعے

میں کوئی شگاف نہیں پیدا کیا جا سکتا اسلئے اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ انہیں کے پسندیدہ راستہ سے ان پر حملہ کیا جائے چنانچہ اس نے تحریک خلافت کے زمانے میں اور اس سے کچھ پہلے[1] مختلف صوبوں میں عربی اور فارسی کے امتحانات کا سلسلہ شروع کرایا گیا اور ان امتحانات کی قانونی حیثیت کو حکومت نے کسی قدر تسلیم بھی کر لیا یعنی فلاں امتحان ہائی اسکول کے مساوی ہے، فلاں امتحان انٹر اور بی اے کے مساوی ہے وغیرہ وغیرہ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی حلقہ کے سینکڑوں آدمیوں کو اس کے ذریعے اسکولوں اور کالجوں اور دوسرے شعبوں میں ملازمتیں مل گئیں۔ اور ان کی ذہانت وصلاحیت جو دین کے کام آتی وہ تھوڑی سی مادی منفعت کی نذر ہو گئی،

اب آپ آزادی کے بعد ہماری سیکولر حکومت کی کرم فرمائیوں پر بھی ایک نگاہ ڈالیں ۱۹۴۷ء کے بعد ہماری سیکولر حکومت نے مسلمانوں کے ایک ایک امتیاز کو مٹانے یا کم از کم ان کے نشانات کو معدوم کرنے کی بھرپور کوشش کی، ان کو ملازمتوں سے بے دخل کر دیا گیا، ان کو جانی ومالی نقصان پہونچانے کی براہ راست اگر کوشش نہیں کی گئی تو نقصان پہونچانے والوں کی ہمت افزائی ضرور کی گئی، اس نے اسلامیہ مکاتب کے سلسلہ کو توڑ کر ان کو عام پرائمری اسکول بنا دیا اردو زبان کو یکسر ختم کرنے اور اسے دیس نکالا دینے کی کوشش کی مسلم پرسنل لا، پر حملہ کیا گیا مگر کیا وجہ ہے کہ اس کی نگاہ کرم عربی مدارس کی طرف سے نہیں پھری، بلکہ ان پر دیویوں کی بارش شروع کر دی، ہماری حکومت نے انگریزی دور کی کسی خوبی کو اپنانے کی تو کم ہی کوشش کی مگر ان کی سازشی برائیوں کو البتہ اپنے سینے سے لگانے میں پیش پیش رہی، جن میں ایک یہ کہ عربی مدارس کے ان شاہین بچوں کو پہاڑوں کی چٹانوں سے نکال کر قصر شاہی کے گنبد پر بٹھا دیا جائے، تاکہ ان طائراں لاہوتی ہمیشہ پر شغل ہو کر رہ جائیں اور ان کی شہ بازی اگر ختم نہیں تو ان کی پرواز میں کوتاہی آجائے چنانچہ ہر شخص اس بات کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ ان مدارس کے اندر دینی حس اور امانت ودیانت کی روح آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے، چار پانچ یا چھ سو روپے ماہوار تنخواہ کیلئے ہمارا مولوی طبقہ اس سے زیادہ جھوٹا سچا حساب پیش کر رہا ہے جتنا ایڈڈ اسکول اور کالج کرتے ہیں وہ

---

[1] انگریزوں کا پہلا دارالسلطنت کلکتہ تھا اس لئے سب سے پہلے وہاں کلکتہ مدرسہ کی انہوں نے ابتدا کی اور پھر ڈھاکہ کا عربی مدرسہ اور پھر شمس الہدیٰ پٹنہ کو اس نے اپنی تحویل میں کیا

کم سے کم فرضی ٹیچروں اور فرضی چپراسیوں کے نام نہیں دیتے اور نہ فرضی لڑکوں کو امتحان دلاکر ایڈ میں اضافہ کی کوشش کرتے ہیں، مگر ہمارا مولوی طبقہ بڑی بے باکی سے ایسا کرتا ہے، ایک بڑے مدرسہ کے صدر مدرس نے بیان کیا کہ ہمارے دو مدرس اگر مسجد میں جا بیٹھیں گے تو وہ اپنے گریڈ کے بڑھانے اور غلط سلط حساب کے پیش کرنے کی سازش اور اسی طرح کی باتیں کریں گے، نہ دین کی کوئی بات وہ کرتے ہیں اور نہ علم کی، ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا مقصد یہی ہے کہ اللہ کے ان آزاد شیروں کو روباہ طراز بنا دیا جائے اور اس طرح ان کے پسندیدہ راستہ سے اپنی مہلک تعلیمی پالیسی کو ان پر مسلط کر دیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے ہمارے مدارس کا معیار تعلیم دن بدن گرتا چلا جارہا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب کے ساتھ ایک سبب یہ امتحانات بھی ہیں ظاہر ہے کہ جب مدارس کے اساتذہ گروہ در گروہ بیٹھ کر طلبہ کو نقل کرائیں گے تو ان کے اندر کتاب کے مطالعہ کا ذوق اور دقت نظری سے ان کے سمجھنے کی ان کو کیا ضرورت محسوس ہوگی؟ اور ان کا طلبہ کے دل میں کیا وقار رہ جائے گا؟ پھر یہی نہیں بلکہ کبھی استاذ صاحب کی جگہ طالب علم امتحان میں بیٹھتا ہے اور کبھی طالب علم کی جگہ استاذ صاحب بیٹھتے ہیں یہ مولوی حضرات فارم پر فوٹو لگانے کی اسی لئے مخالفت کرتے ہیں کہ ان کو اس فریب کا موقع ملے اس سے بہتر تو اسکول و کالج والے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے یا انھیں ایسا نہیں کرنے دیا جاتا،

تیسری بات یہ کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ مولوی طبقہ کے بارے میں کچھ پہلے سے زیادہ حسن ظن نہیں رکھتے تھے ان امتحانات نے ان کو اس حمام میں اس طرح ننگا کر دیا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جب ان کی سطحیت اور بے غیرتی کے واقعات بیان کرتا ہے تو اب ان کے وقار کی صفائی میں ہمارے پاس کوئی جواب نہیں رہ جاتا ہے اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس سے نہ صرف ان کا وقار گر گیا ہے بلکہ دین کے احترام کا جذبہ بھی اس سے مجروح ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو قرآن پاک کو آنکھوں اور سینوں سے لگاتے ہیں اگر وہ غلطی سے گر جاتا ہے تو ہم صدقہ نکالتے ہیں۔ مگر مولوی طبقہ تو قرآن کے ٹکڑے (گو وہ عام عربی عبارت میں ہوتی ہے) پیشاب خانوں اور راستوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ اب لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے بھی پردے کے پردے امتحانات دینے

آنے لگے ہیں۔ ہمارے ضلع اعظم گڈھ میں بعض بڑے مدرسوں نے مدرسۃ البنات کا شعبہ کھولا تو بڑی خوشی ہوئی مگر معلوم ہوا کہ اس شعبے کے کھولنے کا مقصد نہ تو بچیوں کی دینی تعلیم و تربیت ہے اور نہ ہوم سائنس وغیرہ سکھانے کا کوئی خاص پروگرام ہے۔ اس کا مقصد اس شعبے کو دکھا کر مزید گورنمنٹ سے ایڈ لینا مقصود ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حیا و شرم کی تمام حدوں کو توڑنے کی کیا ضرورت تھی اس کی وجہ سے مستقبل میں بھی جو بہت سے اخلاقی فتنے پیدا ہوں گے وہ مزید براں ہیں۔

جن مدرسوں میں ان امتحانات کا سلسلہ جاری ہے وہاں کے ناظموں کے نظامت اور مدرسہ کے ارکان کے لئے رکنیت بہت آسان اور منفعت بخش ہو گئی ہے، مگر ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس کا حق ادا نہ کرنے کی گرفت بھی خدا کے یہاں کم درجہ کی نہیں ہوگی۔ ملت کا بگڑا ہوا ایک ایک فرد قیامت میں ان کا دامن پکڑے گا۔

گورنمنٹ کی پابندیاں گورنمنٹ یو پی ان مدارس پر جو اتنی بڑی رقم خرچ کر رہی ہے تو اس کی یہ نظر کرم بے سبب نہیں ہے۔ اب اس نے آہستہ آہستہ ایڈڈ مدرسوں پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دی ہے۔ پہلے ہندی زبان اور جن گن من وغیرہ کی بھی پابندی عائد کی گئی تھی، اب اس نے دو سال سے نئی تقرری روک دی ہے، اور صدر مدرس کے فاضل پاس ہونے کی شرط عائد کر دی ہے، یہ اساتذہ جو اس وقت اپنے شاگردوں کو نقل کرا کے اپنی تنخواہ بنا رہے ہیں ان کے یہ منقول جانشین آئندہ نقل کرانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے، اور حدیث نبوی کی پیشین گوئی کے مطابق مسند علم و درس نا اہلوں کے ہاتھ چلی جائے گی۔ جیسا کہ صوبۂ بہار کا تجربہ سامنے ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے یہاں اس بازپرس کی ذمہ داری تنہا ان کے سر ہوگی

نااہل رجسٹرار اس سلسلہ کی ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ انگریزوں کے زمانہ میں طبقۂ علماء کے لائق ترین لوگ بورڈ رجسٹرار ہوتے تھے، اس سے پہلے مولانا ضیاء الحسن ندوی، شبیر احمد غوری جیسے اہل علم اس کے رجسٹرار ہوتے تھے، اس لئے کچھ علمی وقار و معیار باقی تھا مگر اب عربی و فارسی سے جاہل گورنمنٹ کے آفیسر اس کے رجسٹرار ہوتے ہیں، اور اب تو قیامت کی علامت ایک عورت ان مولوی حضرات کے سروں پر مسلط کر دی گئی ہے، معلوم نہیں فوٹو کے عدم جواز کا فتوی دینے والے حضرات ان محترمہ سے ملاقات کے بارے میں کیا فتوی دیتے ہیں؟

اس کا حل راقم الحروف کے نزدیک اس کا لائق حل صرف یہ ہے کہ الہ آباد بورڈ سے یہ مدارس اپنا تعلق توڑ لیں، اور اس کے ایڈ کی وجہ سے لائق اساتذہ کا جو معیارِ تنخواہ قائم ہوگیا ہے اسے منتظمین پورا کریں۔ اور بغیر کسی سختی کے جو طلبہ کی بغیر جمع کرلی گئی ہے اسے کم کرکے اس رقم کو اساتذہ کی تنخواہ میں خرچ کریں، پھر اس کے بعد علم دین کی وہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے بزرگوں کا شعار رہا ہے، انشاء اللہ پیسہ کی کمی نہیں ہوگی،

اہلحدیث علماء سے افسوس یہ ہے کہ وہ حضرات جو اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں خاص طور پر علمائے اہلحدیث سے گذارش ہے کہ وہ اپنی پچھلی تاریخ پر نگاہ ڈالیں کہ ان کے بزرگوں نے احیائے سنت کا کتنا عظیم الشان کام کیا تھا، مگر موجودہ دور کے اہل حدیث حضرات محض روایتی طور پر اہل حدیث رہ گئے ہیں اور ان کے احیائے سنت کا دائرہ آمین بالجہر اور رفع یدین اور چند اور مسائل تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، وہ زندگی کے دوسرے معاملات کے ساتھ ان امتحانات کے سلسلہ میں احیائے سنت کی روایت کو کیا زندہ کرتے، نہ جانے کتنے فرائض کو پامال کر رہے ہیں۔ کیا یہ انتہائی افسوس ناک اور غیرت کی بات نہیں ہے کہ دعوی تو آپ احیائے سنت کا کریں اور روش ترک سنت ہی نہیں بلکہ ترک فرض کی اختیار کریں؟ کیا حنفیوں سے صرف رفع یدین اور آمین بالجہر تک کی لڑائی ہی مین احیائے سنت کا تقاضا رہ گیا ہے؟ اس ترک سنت میں بلکہ ترک فرض میں کوئی جھگڑا کیوں نہیں آپ کرتے؟

حنفی علماء حضرات سے میں ان حضرات سے جو اپنے کو حنفی کہتے ہیں پوچھتا ہوں کہ آپ سے اگر فتوی پوچھا جائے کہ جماعت اور جمعہ و عیدین میں عورتیں مسجد میں جائیں یا نہیں؟ وہ گھر میں اپنی جماعت کریں یا نہیں؟ تو آپ جواب دیں گے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے۔ مگر آپ اپنی معصوم بچیوں کو گھر سے پچاسوں میل دور کچھ پردہ اور کچھ بے پردہ گذارتے ہوئے امتحانات دلانے لیجائیں تو آپ اس روش کے بارے میں کیا فتوی دیں گے؟ حنفیوں میں جو لوگ اپنے کو اہلسنت والجماعۃ کہتے ہیں اور جن کے نزدیک قبر کے چڑھاوے ہوئے نذرانے بھی جائز ہیں وہ اگر اس ڈگر پر چل رہے ہیں تو زیادہ تعجب خیز بات نہیں ہے مگر جو لوگ اس طرح کی رقموں سے اپنا دامن بچاتے ہیں وہ جھوٹ و فریب اور گورنمنٹ کے سود سے حاصل کی ہوئی رقم کے بارے میں کیا فتوی دیں گے؟

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ اسکول اور کالج کے طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم سے مدد دی جائے یا نہیں تو آپ یہ فتویٰ دیں گے کہ ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے مگر آپ اپنے یہاں کے طلبہ کو دینی کتابیں پڑھا کر بھی وہی دنیادارانہ مزاج بنائیں اور غلط صحیح ہر طرح کا کام ان سے لیں تو ایسے طلبہ کیلئے زکوٰۃ کی رقم لینا اور ان پر خرچ کرنا کیسے جائز ہوگا ؟

مجھے پورا احساس ہے کہ میرا لہجہ ذرا تلخ ہوگیا ہے اور انداز تحریر حد ادب سے آگے چلا گیا ہے مگر مدارس کی پچھلی تاریخ اور جو تھوڑی بہت دینی حمیت و غیرت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کی بنا پر ملت کے اس سرمایہ کو ضائع ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا ؎

رکھو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

میں نصاب تعلیم پر مذاکرہ (مجیب اللہ ندوی)

۲۸، ۲۹ ، فروری ۸۳ء کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نصاب تعلیم کے سلسلہ میں ایک علمی مذاکرہ کا انعقاد ہوا تھا، اس مجلس مذاکرہ میں ایک نباض کی حیثیت سے راقم الحروف کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی کئی برس کے بعد مادر علمی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، اس لئے اس مدت میں یہاں وہاں جو غیر معمولی اور حسین ترین تعمیری ترقی ہوئی ہے، اس کو دیکھ کر غیر معمولی مسرت ہوئی، کتبخانہ کی نئی عمارت جس کا اس موقع پر افتتاح ہوا تھا وہ بھی اپنی نوعیت کی منفرد عمارت ہے، اسی طرح مسجد کے اگلے حصہ میں جو توسیع ہوئی ہے وہ بھی عمارتی لحاظ سے شاہکار ہے۔ نیا آدمی محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ کوئی نیا اضافہ ہے، یہ سب نتیجہ ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی شخصیت اور ان کے رفقاء کار کی مساعی جمیلہ کا۔

ندوہ کے عین بغل میں لکھنؤ یونیورسٹی کی عمارت اور اس کے کئی ہاسٹل ہیں۔ جن کو دیکھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آصف الدولہ کے زمانے کے امام باڑے ہیں۔ معنوی رونق کیا دکھائی دیتی ظاہری طور پر بھی نکبت برستی نظر آتی ہے، آزادی سے پہلے جب یہ یونیورسٹی پبلک ہاتھوں میں تھی تو اسمیں خاصی چہل پہل اور رونق محسوس ہوتی تھی، تعجب ہوتا ہے کہ چندہ سے چلنے والے ندوہ کے صرف در و دیوار سے بلکہ اس کے ذرہ ذرہ سے زندگی کا حسن ابلتا نظر آتا ہے اور گورنمنٹ یونیورسٹی کی خستہ حالی خود اپنا نوحہ کر رہی ہے،

دوسرے دن نصاب تعلیم پر مذاکرہ تھا، افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر مذاکرہ کی تمام نشستوں میں راقم الحروف شریک نہیں ہوسکا۔ مگر پہلی نشست میں جو تقریریں ہوئیں اور جو مقالے پڑھے گئے اس سے اندازہ ہوا کہ نصاب تعلیم کے مسئلہ کو ایک نظری مسئلہ سمجھکر اس پر غور کیا جا رہا ہے اور ندوہ کے قیام سے اب تک جو باتیں کہی اور لکھی گئی ہیں وہی دہرائی جاری ہیں۔ جہاں تک عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا سوال ہے اب وہ مسئلہ نہیں رہا

ہے ، ندوہ کی تحریک اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان کی دو چار درسگاہوں کو چھوڑ کر سب سے نے اسے قبول نہیں تو تسلیم کر لیا ہے ، اب ضرورت اس کے عملی پہلو کی طرف توجہ کی ہے ، زمان کے ساتھ مکان کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ نصاب تعلیم پر غور کرتے وقت ہمیں اپنے ملک کے حالات اور وہاں کی دینی ضرورتوں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے ، ہمیں صرف آزاد اسلامی ملکوں کی ریس یا تقلید میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔

آزاد اسلامی ملکوں میں قدیم طرز کے مدرسے ہوں یا جدید و قدیم دونوں علوم کے حامل ادارے بہر حال وہاں اس نصاب کو پڑھنے کے بعد طلبہ کے سامنے اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک میدان بھی موجود ہوتا ہے ، اس لئے ان کے لئے جو بھی نصاب تعلیم بنایا جائے گا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے یکسو ہو کر پڑھیں گے ۔ مگر ہندوستان اور ایسے تمام ممالک میں جہاں مسلمان تعلیمی پالیسی بنانے میں آزاد نہیں ہیں وہاں دینی درسگاہوں کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے مقصد اور ضرورت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ،

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد سے اب تک ان کا سب سے بڑا مسئلہ دین اور علم دین کا تحفظ رہا ہے تاکہ مسلمان نسل ایمان کی روشنی اور توحید کی حرارت سے محروم نہ ہونے پائے ، اور آزادی کے بعد اس مسئلہ نے اور زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے اسی ضرورت اور مقصد کی تکمیل کے لئے ہمارے اسلاف نے آزاد دینی مدارس کے قیام کی پوری کوشش کی اور اس کے لئے اپنے جسم و جان کی پوری صلاحیت لگا دی ، انکی کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف دین اور علم دین کا چشمۂ صافی غیر اسلامی عناصر سے مکدر نہیں ہونے پایا بلکہ اسلام کی وہ اخلاقی اور روحانی زندگی جس کی تعمیر توحید خالص پر ہوئی تھی ہمیشہ زندہ و تابندہ رہی ، اور الحمد اللہ وہ آج تک زندہ و تابندہ ہے ۔ اس ضرورت اور مقصد کے تحت ہم جب ہندوستان کی درسگاہوں کے نصاب تعلیم پر غور کرتے ہیں تو موجودہ " درس نظامیہ " کا نصاب تعلیم ہمیں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتا ہے ۔ اس لئے کہ ہندوستان میں دین اور علم دین کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ ہر سطح کے آدمی ہم کو ان درسگاہوں سے مل سکیں ہمیں حدیث و قرآن کے اچھے مدرسین کی بھی ضرورت ہے اور فقہ و افتاء کیلئے اچھے فقیہ اور

مفتی کی بھی ضرورت ہے ہمیں نحو وصرف پڑھانے والوں کی بھی ضرورت ہے اور ہمیں امام و مؤذن کی بھی ضرورت ہے مکتب کی چٹائی پر بیٹھکر پڑھانے والے کی ضرورت ہے، اور تقریر و خطابت کے لئے بھی ہمیں آدمی درکار ہیں، ان ضرورتوں کے لحاظ سے جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں درس نظامیہ کے مطابق چلنے والے مدرسے اور وہاں کے فارغین زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں اور ان کے ذریعہ زیادہ تر ہماری ملی ضرورتیں پوری ہوئیں،

اس کے برخلاف جہاں قدیم وجدید دونوں کے حاملین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی یا کی جارہی ہے وہاں سے قدیم وجدید کے ماہر تو اب تک پیدا نہ ہو سکے البتہ کچھ انگریزی اسکولوں کے ٹیچر، ادب و انشاء کے کچھ واقفین کچھ اچھے مصنفین اور رہبران صحافت کے کچھ شہسوار تو ضرور مل گئے مگر ہماری پوری ملی ضرورتیں ان سے پوری نہ ہو سکیں، تفسیر وحدیث اور فقہ کا ہرین کی بات تو دور کی رہی جن علوم میں ان درسگاہوں کا امتیاز ہے اس میں بھی ہم دوسری درسگاہوں کے لئے اچھے افراد فراہم نہ کر سکے، اور فقہ وافتاء اور دوسرے علوم دینیہ میں تو ہمیشہ دوسری درسگاہوں کے محتاج رہے اور قدیم وجدید دونوں کے ماہر تو آج تک عنقا ہی رہے۔ خاص طور پر ندوہ جو اس کا سب سے بڑا داعی ہے اس کے نصاب میں بھی جب تک قدامت کا اثر غالب رہا اس وقت تک تو ہر شعبے کے افراد پیدا ہوتے رہے، مگر اب اس کی وہ ہمہ جہتی باقی نہیں رہ گئی اس کا ایک اور نقصان یہ ہوا کہ جن درس گاہوں میں درس نظامیہ کی تعلیم قدامت پرستانہ انداز میں ہوتی تھی وہاں بھی ان کے اثر سے جدید و قدیم کی آمیزش کی سطحیت پیدا ہونے لگی ہے جس کی وجہ سے وہاں بھی باصلاحیت افراد تیار ہونا کم سے کم ہو گئے ہیں راقم الحروف کے نزدیک ان کی ناکامی کے چند اسباب یہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہم جس طرح کے مزاج وصلاحیت والے افراد تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے لئے وسیع پیمانہ پر اس ملک کے اندر کوئی میدان نہیں ہے اس لئے ان درسگاہوں کے فارغین ایسے میدانوں کو اپنی جولانگاہ بناتے ہیں یا اس کے لئے کوشش کرتے ہیں جو ذاتی طور پر تو ان کے لئے تو مفید ہوتی ہے مگر ملت کے لئے اس کی کوئی افادیت نہیں ہوتی بلکہ اس سے دوسری درسگاہوں کے فارغین کے مزاج میں بھی بگاڑ پیدا ہونے لگا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم ان کے اندر کسر نفسی، تواضع قناعت پسندی کے بجائے جو ایک فرضی بلندی کا احساس برتری بلکہ پندار

پیدا کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہندوستان میں وہ کسی عربی درسگاہ کی مدرسی کو بھی آسانی سے پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ ٹوٹی چٹائی اور پھٹے ٹاٹ والے مدرسوں کی پنہ ماری والی زندگی کے لئے وہ تیار ہوں، ہم نے ان مدرسوں کے ماحول کو خود ایسا بنا دیا کہ ان کے فارغین ٹھوس علمی کام سے زیادہ سطحی چیزوں اور شہرت وعزت کی اچھل کود کو اپنا طرۂ امتیاز بناتے ہیں۔ ایک جگہ بیٹھکر کسی ایک چھوٹے یا بڑے کام میں زندگی کھپا دینے کا جذبہ ہیں نایاب نظر آتا ہے

راقم الحروف یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ درس نظامیہ میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے یعنی یونانی منطق وفلسفہ کی کتابیں کم کرکے ان کی جگہ ہیئت، جغرافیہ اور جنرل سائنس کی عام معلومات فراہم کرائی جائیں، جن سے قرآن پاک کی وہ آیات جن میں آفاق وانفس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اسے وسیع طور پر سمجھ سکیں، اور ساتھ ہی عربی انشاء ادب کا اضافہ کردیا جائے کہ وہ تحریر وتقریر سے بے بہرہ نہ رہیں۔ رہی انگریزی تو اس کی سارے طلبہ کو ضرورت نہیں ہے، البتہ جو طلبہ اس کو اپنے علمی یا دعوتی کاموں کا میدان بنانا چاہیں ان کو اختتام تعلیم کے بعد اس کے لئے خود تیار کیا جائے اس کے لئے ایک آدھ گھنٹہ مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر یہ کسی مقصد اور ضرورت کے تحت ہونا چاہئے صرف قدامت پرستی کا داغ چھڑانے کی غرض سے ہم اسے قطعی قبول نہ کریں ہمارے مدارس میں انگریزی ونگریزی تو آتی نہیں البتہ دماغ میں بلا وجہ سطحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہاں سب سے زیادہ یہ بات ہی قابل غور ہے کہ کیا نصاب تعلیم کی تبدیلی سے عربی درسگاہوں میں کوئی انقلاب آجائے گا؟ یا اس کے لئے طلبہ، اساتذہ اور منتظمین مدرسہ میں بھی کسی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ راقم الحروف کے نزدیک سب سے زیادہ ضرورت اساتذہ اور منتظمین میں مقصدیت پیدا کرنے کی ہے، جب تک ان کے ذہن میں یہ بات نہ بیٹھے گی اور عمل سے وہ اس کا ثبوت نہ دیں گے کہ دینی درسگاہوں کا مقصد اور ان کی غرض کیا ہے اس وقت تک نصاب تعلیم کی تبدیلی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بے چاری بے جان کتابوں پر سب کا نزلہ گرتا ہے اور اسی کے رد وبدل کی بات کہی جاتی ہے مگر مدرسہ کے زندہ اساتذہ اور منتظمین میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے یا اس کے لئے بھرپور کوشش نہیں کرتے، اس سے پہلے درس نظامیہ کے مدرسوں کے فارغین علم دین کے تحفظ کے ساتھ گاؤں گاؤں علم دین کی

روشنی اسی وجہ سے پھیلا سکے کہ خود ان کے اساتذہ اگر ایک گاؤں یا چھوٹے سے مدرسہ میں بیٹھ گئے تو پھر پوری زندگی وہیں گذار دی، اور علم کے ساتھ انہوں نے اپنے عمل سے پوری پوری آبادی کو متاثر کردیا۔ پہلے منتظمین مدرسہ کے کام کو امانت و ذمہ داری سمجھتے تھے اور اب ہم اسے عزت و وجاہت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، وہ مدرسہ کے کام کو اپنے ذاتی کام کی طرح کرتے تھے اور دوسرے بہت سے جذباتی کاموں کے مقابلے میں اسے بنیادی کام سمجھتے تھے۔ ان کا سینہ رشک و حسد اور اعزاز و اکرام کی خواہش سے پاک ہوتا تھا، وہ مدرسہ کا کام کرکے بھی اپنے کو سراپا تقصیر سمجھتے تھے، ساتذہ اور منتظمین کے اس خلوص، للہیت اور مقصدیت کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا تھا اور وہ بھی شوری اور غیر شعوری طور پر دینی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوتے تھے دینی درسگاہیں جن مقاصد کے لئے قائم ہوئیں ان کی تکمیل چند کتابوں کی تبدیلی سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ کتابوں کے بدلنے سے پہلے خود اساتذہ اور منتظمین اپنے کو بدلنے کی کوشش کریں، اگر ہمارے اندر اسوۂ نبوی کا ہلکا سا اثر بھی پڑ جائے تو مدرسوں کی دنیا بدل جائے۔

ایک بار جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمہؓ معاشی تنگی سے پریشان ہوکر خدمت نبوی میں حاضر ہوئیں اور کچھ امداد طلب کی اس حال و سوال پر قلب نبوی پر جو کیفیت طاری ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر باپ آسانی سے کرسکتا ہے، مگر حضورؐ نے ان کو جو جواب دیا اس کی مثال دنیائے انسانیت میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

أعطيك وأدع أهل الصفة	بیٹی میں تم کو دوں اور درسگاہِ صفہ کے طالبان
تطوى بطونهم	علم بھوکے رہیں۔

(زرقانی، ذکرنا المجد النبوی ص ۲۴۴)

طلبہ قصرِ سلطانی کے گنبد پر اپنا نشیمن بنانے کے بجائے پہاڑوں کی چٹانوں میں اسی وقت بسیرا لینے کے لئے تیار ہوں گے جب اساتذہ اور منتظمین بھی شاہراہ اسی کو بنائیں اور درس نظامیہ کی کامیابی کا راز بھی یہی حضرات تھے۔ اب وہاں بھی سناٹا چھاتا جارہا ہے۔

فیشن اور ظاہر پرستی جس نے ہمارے ملک میں ایک وبا کی شکل اختیار کرلی ہے اسی ہندوستان میں لاکھوں آدمی ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے کسی مقصد سے ٹاٹ پہننا شروع

کردیا ہے یہاں ہزاروں تعلیم یافتہ لوگ ہیں جن کو ظاہر ہے اپنی بہت سی خواہشات کا خون کرنا پڑا ہوگا۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ کتابوں سے زیادہ زندہ افراد میں تبدیلی کی ضرورت ہے اس راستہ کو اختیار کرنے میں نہ تو بہت زیادہ شور وغوغا نظر آئے گا اور نہ بھیڑ بھاڑ مگر ہندوستان میں دین اور علم دین کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ بزرگوں کا خاموش طریقہ اختیار کیا جائے یہی احساس تھا جس نے امام غزالی سے مدرسہ نظامیہ کی صدارت چھوڑوادی۔

پھر نصاب تعلیم میں تبدیلی کی بات جب آتی ہے تو سب سے زیادہ یونانی منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تبدیلی کی بات ہوتی ہے اور پھر ادب والنشاء کے اضافہ کی ظاہر ہے کہ فقہ وحدیث میں کوئی تبدیلی تو ہوگی نہیں۔ لیکن قرآن پاک کی تعلیم کو نہ تو بنیادی اہمیت درس نظامیہ میں دی گئی ہے اور نہ قدیم وجدید کے علوم کے ساتھ چلنے والے مدرسوں میں کہیں قرآن پاک کی منتخب سورتیں پڑھائی جاتی ہیں، کہیں جلالین کا دورہ ہوتا ہے اور بیضاوی کا ایک آدھ پارہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ قرآن کو مرکز بنا کر سارے علوم کو اس کے گرد گردش دی جائے اور اس کی ایک ایک آیت پر پڑاؤ ڈال کر اسے پڑھا اور پڑھایا جائے اور اس کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو قلب ودماغ میں اتارا جائے اس سلسلہ میں مولانا حمیدالدین فراہی صاحبؒ کی اصول تفسیر سے متعلق کتابوں سے فائدہ اٹھانے میں ہم نے جو حجاب حائل کر رکھے ہیں اس کو نکال دیا جائے تو نیک فالی کی بات ہوگی۔ افسوس ہے کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی تفسیر میں ایک ادعائی انداز اختیار کر کے ان کے فکر سے فائدہ اٹھانے میں ایک نئی دیوار کھڑی کر دی ہے۔

افسوس ہے کہ نصاب تعلیم کی تبدیلی کا محور مختلف فنوں کی چند کتابوں کو بنایا جاتا ہے اور ام الکتب کو محور بنانے پر بہت کم غور کیا جاتا ہے۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ چند باتیں کسی دل آزاری کی خاطر نہیں کہی گئی ہیں صرف اپنے چند ذاتی تاثرات کا اظہار مقصود ہے۔ وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی۔

الرشاد کی ڈاک

معرفت

Mr. G. R. ANSARI
"G 500 SHA-E SHARQI"
Sir Syed Nagar
Aligarh

13-3-83

گرامی منزلت سلام مسنون

سری نگر سے چلتے وقت میں نے آپ کو اطلاع دے دی تھی کہ میرا تقرر علی گڑھ میں ہو گیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں۔ اس کے بعد سے کچھ خط لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ آج شعبۂ فلسفہ کے ایک ریسرچ اسکالر حمید نسیم رفیع آبادی آپ کی نئی کتاب سرمد اور ان کی رباعیاں مجھ کو دکھانے لائے تو آپ کی یاد پھر آئی میں اس کتاب کی اشاعت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میر درد والا کام بھی آپ جلد منظرِ عام پہ لے آئیں گے۔

مجھکو نومبر ۸۲ء کے بعد سے الرشاد کا کوئی شمارہ نہیں ملا ہے اگر آپ کی توجہ سے یہ شمارے مل جاتے تو میری فائل ناقص نہ ہوتی۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

والسلام
کبیر احمد جائسی

مکرر: الرشاد کے دفتر میں میرا سری نگر کا پتہ کٹوا کر درج بالا پتہ لکھوا دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ ۲۹ فروری ۱۹۸۴ء — حمید نسیم رفیع آبادی مسلم یونیورسٹی

محترمی و مکرمی حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کے بھیجے ہوئے "الرشاد" کے دونوں پرچے مل گئے، شکریہ

اب ماشاءاللہ " الرشاد " کا معیار روز بروز خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے اور مضامین بھی اچھے اچھے
آنے لگے ہیں ۔ میری دلی خواہش ہے کہ " الرشاد " ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ برصغیر ہندوپاک کے مشہور علمی
اور تحقیقی رسالوں میں جگہ پائے آپ چونکہ یہ پرچہ کسی جماعت یا فرقہ سے منسلک نہیں ہے اس لئے اس کے غیر جانبدار
علمی خدمت کے زیادہ روشن امکانات ہیں، خالص علمی اور فکری نوعیت کے مضامین ایسے ہی غیر وابستہ پرچے میں
بار پا سکتے ہیں ۔ میں ہر وقت " الرشاد " کے لئے کوئی بھی خدمت کرنے کے لئے تیار رہوں ۔ بہرحال میں نے
آج سے تقریباً ڈیڑھ مہینے پہلے ایک مضمون " انسان فطرۃ مسلمان ہے " کے نام سے " الرشاد " کیلئے
روانۂ خدمت کیا تھا ۔ مگر معلوم نہ ہوسکا وہ آپ کو ملا کہ نہیں ، براہ کرم مطلع فرمائیں ۔

خادم العلماء حمید نسیم رفیع آبادی

باسمہ تعالیٰ 31/3/84

مکرمی و المحترمی سلام مسنون

۲ ہفتہ قبل وحیدالدین سلیم حیدرآبادی کے ساتھ اعظم گڈھ حاضری پر جامعۃ الرشاد میں ایک شب کا قیام
ایک ایسا پرکیف عالم تھا جو مدتوں یاد رہے گا ۔ آپ نے ہم جیسے گنہگاروں کی جسطرح مدارات کی اور اپنی
مصروفیات علمی و انتظامی کے باوجود جتنا وقت عنایت فرمایا اسکا ہمارے دلوں پر گہرا نقش ہے وحید صاحب
نے بھی خوش مزاجی انکسار اور ذکاوت کی غیر معمولی کیفیات کا جو مشاہدہ آپ کی ذات میں کیا اس سے بے حد
متاثر تھے ۔ خدا آپ جیسے علماء باعمل و اصحاب فراست کو اس مظلوم ملت کی راہنمائی کے لئے زیادہ سے زیادہ
دن تک قائم و سلامت رکھے ۔ آپنے الرشاد کے جنوری ۸۴ء کے شمارہ کے شذرات میں آپ نے سکینہ صاحب
کی رپورٹ پر مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے سلسلے میں جو تبصرہ فرمایا ہے اسے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ
آپ نے ایک حق ادا کردیا ۔ میں نے یہ رپورٹ جب انگریزی اخبارات میں دیکھی تو خود اس پر تبصرہ کرنے والا
تھا حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا زبردست تعلیمی انحطاط ایسا تشویشناک مسلہ ہے جس پر اہل فکر
کو زیادہ سے زیادہ توجہ دینی ہے ورنہ یہ ملت دیکھتے ہی دیکھتے بار بردار جانوروں میں تبدیل ہوجائے گی
قاضی عدیل عباسی مرحوم کی طرح جنون جولولہ کی آتش سوزاں کاش پھر کسی دیوانہ کے سینے میں فروزاں ہو
ہوجائے اور ملت کے دیگر مسائل کی طرح اس طرف لوگوں کی توجہات مبذول کرانے کو وہ اپنی زندگی کا مشن بنالے
آپ حضرات کو خدا جزائے خیر دے کہ آپ صرف فکری راہنمائی نہیں کر رہے ہیں بلکہ میدان عمل کے بھی

سپاہی ہیں اللہ ایک پھلتا پھولتا اور سرسبز و شاداب ادارہ آپ کی باغبانی کا کرشمہ ہے۔" الرشاد "
کا علمی و تحقیقی معیار اطمینان بخش ہے۔ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس عہد کے جدید مسائل پر بھی اسلامی
نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا جائے اور مختلف مکاتب فکر کے اہل قلم کا تعارف حاصل کیا جائے اور کبھی کبھی
مغرب سے مرعوب ذہنوں کا اسلام کے بارے میں کل انسانی گفتار کا جائزہ بھی لیا جائے۔ اس سلسلے میں
جامعہ ملیہ سے نکلنے والے ایک رسالہ کی طرف بھی میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کا نام ہے
" اسلام اور عصر جدید "

والسلام

نیاز مند۔ سید عبدالباری (شبنم سبحانی) جمیلہ منزل محلہ شاہ گنج۔ سلطان پور یوپی

باسمہ تعالیٰ

950/N سمن آباد لاہور۔25 — 12-2-84

جناب مس زید مجدکم !!

سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ کل کی ڈاک سے آپ کا مرسلہ مجلہ الرشاد موصول ہوا۔ اس کرم فرمائی
اور یاد آوری کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ اسے رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔
مجھے جناب محترم ابوعلی صاحب نے الرشاد میں لکھنے کے لئے کہا تھا۔ میں انشاء اللہ اس مجلہ کے لئے
ضرور مضمون لکھوں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ اس مجلہ میں کس طرح کے مضمون چھپتے ہیں۔
میں رجسٹرڈ بک پوسٹ سے ایک پیکٹ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اس میں میری چند تصانیف
اور فہرست مضامین شامل ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو ان پر تبصرہ کر دیں۔ میں اعظم گڈھ آیا تو ضرور حاضر
خدمت ہوں گا۔ مستشرقین والی کانفرس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، لیکن میں شریک نہ ہو سکا
ابوعلی صاحب ملیں تو میرا سلام کہیئے گا۔

جناب مشیر الحق صاحب سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اسی تقریب میں سید سلمان ندوی
اور مولانا محمد ناظم ندوی بھی موجود تھے۔

ان دنوں طبیعت خراب ہے۔ خون کے دباؤ میں کمی کا شکار ہوں دعائے صحت کیلئے
درخواست ہے۔ اور کیا عرض کروں۔ والسلام

نیاز مند محمد اسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فون: ۶۹ ۳۱۰۴
RESEARCH CELL
مرکزِ تحقیق
DYAL SING TRUST LIBRARY.
Nisbet Road, Lahore (Pakistan)
دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
نسبت روڈ، لاہور (پاکستان)

حوالہ نمبر RC/9189-8 تاریخ 29/2/86

مکرم بندہ حضرت مولانا! سلام مسنون

اس سے قبل ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ امید کہ موصول ہوا ہوگا روز بروز جواب کا منتظر ہوں۔ الرشاد کے شمارہ ستمبر اکتوبر ۸۳ء میں آپ کا ایک مقالہ بعنوان " اسلام اور بین الاقوامی تصورات " شائع ہوا ہے۔ مگر یہ مقالہ کی دوسری قسط ہے اس کی پہلی قسط شمارہ " جون جولائی ۸۳ء میں شائع ہوئی ہے ہمارے پاس دوسری قسط موجود ہے۔ اگر براہ کرام آپ اس کی پہلی قسط ارسال فرما دیں تو میں انشاء اللہ دونوں قسطوں کو اکٹھا " منہاج " کی آئندہ اشاعت مورخہ اپریل ۸۳ء میں شائع کر دوں گا۔ یہ یہ مقالہ بڑا عالمانہ اور وقیع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اہل پاکستان بھی اس سے مستفید ہوں دوسری قسط کی کتابت ہو چکی ہے پہلی کا انتظار ہے۔

سہ ماہی منہاج کا " اسلامی نظام عدل نمبر " دو جلدوں میں چھپ رہا ہے۔ انشاء اللہ العزیز تجلید کے فوراً بعد ارسال خدمت کیا جائے گا " اسلام کا قانون اجرت " فی الحال ہماری کمیٹی کے زیر مطالعہ ہے منظوری کے بعد انشاء اللہ اس کی بھی کتابت و طباعت شروع ہو جائے گی۔

میں اپنے پہلے خط کے جواب کا منتظر ہوں۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ماہنامہ " الرشاد " پر تبصرہ اسلامی نظام عدل نمبر حصہ دوم میں شائع ہو رہا ہے اطلاعاً عرض ہے۔ والسلام

محمد متین ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنارس
11-2-86

مخدوما! متعنا اللہ بطول حیاتکم

امید کہ بخیر ہوں گے۔ بغیر کسی تمہید اور لاگ لپیٹ کے میرا خیال ہے کہ اسلامیات پر لکھنے والوں میں آپ کی ذات والا صفات ایک منتخم ہستی ہے، دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے بھی جب میں نے آپ کو سنا ہے اور گاہے بگاہے اعظم گڈھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف جب حاصل ہوا ہے تو اس وقت دینی تعلیم کے ہندوستانی مسائل کے سلسلہ میں آپ کی رائے کی قدر کا احساس ہوا ہے زیر نظر شمارہ جنوری ۱۹۸۲ء الرشاد میں رشحات کا نوٹ، خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ اور سب سے اہم مضمون احتکار کافی پسندیدہ ہے۔ لیکن آپ کے ایک قدر شناس بلکہ حلقہ بگوش کی حیثیت سے ایک بات بہت بری معلوم ہوئی جس کا اظہار میں صفائی سے کرنا چاہتا ہوں کہ نئی کتابوں کے ذیل میں جامعۃ الرشاد میں جو تبصرہ شائع ہوا ہے وہ بے حد کرخت ہو گیا ہے، اور حقیقت حال کا ترجمان نہیں ہے، ایصال ثواب کے موضوع پر مولانا صفی الرحمن صاحب کا مضمون جو مستفتی کے جواب میں لکھا گیا ہے از راہ کرم اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں، اس میں کون سی ایسی بات ہے جس کی بنا پر انھیں مورد طعن بنایا جائے کچھ ضمنی اور غیر متعلق باتیں جو اس میں آگئی ہیں وہ ایک جاہل ادا شناس اور دینی مزاج سے بہت ہی بعید شخص کی فہمائش کے لئے کسی دوسرے موقع سے لکھی گئی تھیں، ان کا ایصال ثواب کے تحت آنا علمی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے

والسلام مع الاحترام

خاکسار

امیر محمد افضل مئوی

مرکزی دار العلوم بنارس

باسمہٖ تعالیٰ

جامعہ مظہر العلوم

۲۲ر مارچ ۱۹۸۲ء

مکرمی و محترمی حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب زیدت عنایاتکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

عافیت خواہ بعافیت ہے۔

آنجناب کا مرسلہ گرامی نامہ باصرہ نواز ہوا، پڑھکر از حد مسرت حاصل ہوئی، خیال تھا کہ جلد ہی جواب ارسال خدمت کر دوں گا، مگر ادھر پے بہ پے امتحانی اور دیگر مصروفیات نے ایسا گھیرا

کہ ارادہ نہاں خانۂ دل میں کروٹیں لیتا رہا اور وقت برق رفتاری کے ساتھ گزرتا رہا اور نوبت بایں جا رسید کہ تقریباً دو ماہ ہو گئے اور قلم کاغذ سے رسم وراہ کا اتفاق نہ پڑا، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، آج بفضل اللہ تاخیر کی معذرت کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں، والعذر عند الکرام مقبول۔

مکرمی! یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے مفید مشوروں سے نوازا، اور اس نو آموز کی کسی حد تک دستگیری فرمائی، بندہ اس سلسلہ میں اپنے مقصد کی برآری میں حتی الوسع کوشاں ہے۔ اور اپنے موضوع کے متعلقات کی تلاش میں لگا ہوا ہے، آپ کے مضامین (جو معارف کی قدیم فائلوں میں ملے اور الرشاد کے بھی) پیش نظر ہیں اس سے مجھے بیحد روشنی مل رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے یہ مضامین میرے لئے نشان راہ ہیں اور زبان وبیان کی شرینی کیساتھ اس مبتدی کے لئے تسکین ذوق کا سامان بہم پہونچاتے ہیں، بلاشبہ اس موضوع کے ہشت جہت ہونے کے باوجود آپ نے جس طرح اسے بنایا ہے یہ آپ ہی کا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں اضافہ کرے اور تحقیقی کاموں کا موقع دے۔ آمین،

میں نے آپ کے حسب المشورہ کام شروع کر دیا ہے، دعا کی درخواست ہے، اور تمنا ہے کہ مزید مشوروں سے نوازتے رہیں گے، الرشاد معمول ہے، شستہ زبان اور شیریں بیان ہونے کے باعث طلبہ ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، خدا کرے اور ترقی کرے، آمین

والسلام علیکم

مجیب الرحمٰن الاعظمی جامعہ مظہر العلوم بنارس

نئی کتابیں

۱۔ تذکرۂ مصلح الامت | مرتبہ :۔ مولانا قمر الزماں صاحب ۔ ناشر :۔ دائرۃ المعارف، ۲۷ بخشی بازار۔ الہ آباد۔ کتابت وطباعت :۔ عمدہ ۔ قیمت ۳۰ روپئے ، صفحات :۔ ۳۲۰

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بیش بہا تصانیف کے ساتھ اپنے بعد جو زندہ خلفاء چھوڑ گئے انہوں نے مولانا کے مخصوص انداز سے جتنا فائدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پہونچایا اوران کے ذریعہ احیائے سنت ، اصلاح عقیدہ اور شرک وبدعت کا قلع قمع کرنے کا جتنا کام ہوا۔ ماضی قریب میں مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تبلیغی کام کے علاوہ اتنا کسی دوسرے بزرگ کے ذریعہ نہیں ہوا۔

مولانا کے دو ممتاز خلفاء ایک مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری ضلع اعظمگڈھ کے مغربی گوشے میں اور دوسرے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعظم گڈھ کے مشرقی گوشے میں تقریباً پون صدی تک نہ صرف ضلع کو بلکہ پورے ملک کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کرتے رہے۔ خاص طور پر حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ اصلاح امت کا بہت کام ہوا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب مصلح الامت قرار پایا۔ ضرورت تھی کہ مولانا کے حالات زندگی لکھے جاتے تاکہ لوگوں کو اس سے اصلاحی کام کرنے کا حوصلہ ملتا۔ اس کام کو سب سے پہلے راقم الحروف نے شروع کیا تھا مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔ خوشی ہے کہ مولانا کے خویش مولانا قمر الزماں صاحب جو مولانا کے خاص تربیت یافتہ اور خلوت وجلوت کے رازداں اور مجاز صحبت ہیں اور ان کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہٗ سے خلافت کی سعادت بھی حاصل ہے انہوں نے یہ کمی پوری کردی۔ ان کی زندگی کے ہر گوشہ پر انہوں نے روشنی ڈال دی ہے۔

کتاب کی ایک ایک سطر میں ایک خاص روحانی کیفیت ولذت محسوس ہوتی اور قلب وروح کو تازگی ملتی ہے اور اپنی بے عملی پر شرمندگی اور ندامت پیدا ہوتی ہے

امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور اس سے کتنے تشنگان علم ومعرفت کی پیاس

بچے گی۔ یہ کتاب کا حصہ اول ہے دوسرا زیر ترتیب ہے

۳۔ **محی الملتہ والدین** | مرتبہ :۔ مولانا شاہ عون احمد قادری مدظلہٗ ۔ ناشر :۔ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ۔ پٹنہ ۔ بہار ۔ کتابت و طباعت : معمولی ۔ صفحات ۱۸۵ ۔ قیمت :۔ ۲۵ روپے

یہ کتاب خانقاہ مجیبیہ کے سابق سجادہ نشین مولانا شاہ محمد محی الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر لکھی گئی ہے۔ کتاب کے مرتب بھی اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی جلوت و خلوت کے سارے پہلو انہوں نے اسطرح اجاگر کر دئے ہیں کہ صاحب کتاب ایک زندہ شخصیت معلوم ہوتے ہیں یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے جس میں خاندان اور نسب، ابتدائی حالات، ان کی زندگی اور خدمات کا ذکر ہے۔

خانقاہی زندگی کی راحت پسندی قومی و ملی کاموں کی سخت کوشی کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے مگر شاہ محمد محی الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ پورے طور پر جام و سندان باختن کے مصداق تھے۔ یہ کتاب سلسلۂ قادریہ مجیبیہ کے خصوصی تعلق رکھنے والوں کے ساتھ عام لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے، کاش خانقاہی رسمیات کے حسن خانوں میں بیٹھنے والے حضرات کو بھی اس کے مطالعہ کی سعادت مل جاتی تو بڑی اچھی بات ہوتی۔

۳۔ **نصیحتیں اور وصیتیں** | مرتبہ :۔ عبدالمجید اصلاحی ۔ ناشر :۔ انجمن دارالتعلیم والصنعت، جاجمؤ، کان پور ۔ یوپی ۔ کتابت و طباعت : عمدہ ۔ صفحات ۱۷۶ ۔ قیمت :۔ ۱۰ روپے

کان پور کے ایک مشہور صاحب خیر اور دینی مزاج رکھنے والے تاجر حاجی منت اللہ صاحب ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بچوں کو کچھ تحریری نصیحتیں کی تھیں۔ بعد میں ان کو خیال پیدا ہوا کہ عام فائدہ کے لئے اس کو چھپوا دیا جائے۔ یہ کام انہوں نے عبدالمجید اصلاحی کے سپرد کیا۔ مرتب نے اسمیں انبیاء اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیتوں کا اضافہ کرکے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کردیا ہے

یہ کتاب ہر باپ اور ہر بیٹے کے مطالعہ کے لائق ہے۔

۴۔ سرمایۂ عمر

۵۔ **مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سیاسی مکتوبات** | مرتبہ :۔ محمد اسلم، استاد شعبۂ تاریخ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

ناشر:۔ ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، پاکستان۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ صفحات :۔ ۲۹۹
قیمت:۔ ۱۵ روپے

جناب محمد اسلم صاحب استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور متعدد اہم علمی وتاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ان کی قلمی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سرمایۂ عمر ان کے ان علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو وہ مختلف اوقات میں لکھتے رہے ہیں۔ اس میں تیرہ موضوعات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ وہ موضوعات یہ ہیں شاہ فتح اللہ شیرازی، دور اکبر میں موسیقی اور موسیقار، سلاطین دہلی ہندو تہذیب اور ادب، تذکرۃ الشیخ والخدم، میر دارشا کی تاریخی اہمیت، حضرت مجدد الف ثانی اور جہانگیر، شاہ جہاں بادشاہ دین پرور، عربوں کے عہد میں سندھ میں علم وادب، داراشکوہ کے مذہبی رجحانات، ملفوظات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سلطان فیروز تغلق کا ذوق موسیقی، جہانگیر کی تخت نشینی میں راسخ العقیدہ امرا کا کردار، ہمایوں اور علم ہیئت۔

حضرت مجدد الف ثانی اور جہانگیر کے تعلقات کے سلسلہ میں تذکروں اور تاریخوں میں متضاد قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ اس پر مصنف نے تحقیقی انداز میں گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن جیسے لوگ اب تک یہ لکھتے رہے ہیں کہ قید کے بعد مجدد صاحب جہانگیر کی خوشامد کرنے لگے تھے اس کی پوری تردید ہو جاتی ہے بلکہ جہانگیر ان کا صد درجہ گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر مضمون میں وہ علم وتحقیق کے کچھ نئے گوشے وہ سامنے لائے ہیں۔

سیاسی مکتوبات | یہ خطوط مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے رفیق خاص ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی متوفی ۱۹۷۰ء کو لکھے ہیں۔ ان خطوط سے مولانا سندھی کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ان کے سیاسی اور مذہبی خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا سندھی کی تعلیم وتربیت گو خالص مذہبی ماحول میں ہوئی تھی مگر سیاسی سرگرمیوں کے درمیان روس وغیرہ کے سفر کے بعد ان کے خیالات میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ جن سے علامہ اقبال نے بھی اختلاف کیا تھا اور مولانا مسعود عالم ندوی نے بڑی تفصیل سے مضامین لکھے تھے۔ بہرحال ان خطوط کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی تھی اس لئے اسلم صاحب نے اچھا کیا کہ اسے شائع کر دیا،

۶ ۔ مزاروں کی جھلکیاں | مؤلفہ:۔ مولانا عبدالمالک صاحب بھوجپوری۔ ناشر۔ مکتبہ رشیدیہ
سیمل گرام، کلٹی، بردوان ۔ مغربی بنگال ۔ کتابت وطباعت۔ عمدہ۔ صفحات ۱۹۲ قیمت ۸ روپے
کتاب مذکورمیں فاضل مؤلف نے اہل بدعت کی ان غیر شرعی حرکات پر تنقید کی ہے جو وہ اولیاء کرام اور بزرگوں کی قبروں پر وہ کرتے ہیں۔ مؤلف نے بذات خود تمام مقام اعراس پر جاکر وہاں ہونے والی ان خرافات کا معائنہ کیا جس سے انسان اور شرک میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

۷ ۔ محرم کے دس دن | مولفہ:۔ مولانا عبدالمالک صاحب بھوجپوری

۸ ۔ عیدین اور رویتِ ہلال کی شرعی حیثیت | ناشر:۔ ادارۂ تالیفات ضیاء الاسلام،
گدڑی بازار، بلیا۔ یوپی۔ کتابت وطباعت:۔ عمدہ صفحات:۔ ۱۹۰ ۔ ۴۸ ۔ قیمت:۔ ۶ روپے ۔ ۲ روپے
اس کتابچہ میں عیدین اور چاند کے دیکھے جانے اور اسمیں جو اختلافات ہوتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتابچہ دراصل لندن سے نکلنے والے ہفت روزہ "اخبار وطن" میں مطبوعہ ایک مضمون " دو دن عید کیوں ؟ مذہبی رہنماؤں سے ایک سوال " کا جواب ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ جس کو کتابی شکل میں شائع کردیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کتابچہ سے ان لوگوں کو ضرور تسکین ہو جائے گی جو لوگ اس مسئلہ میں علماء کو مطعون کرتے ہیں

۹ ۔ اسلام کا نظام زکوٰۃ | از۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ ناشر:۔ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام ۹۸/۹۲ ناظر باغ کانپور
صفحات ۴۸ ۔ قیمت ۱ روپیہ ۵۰ پیسے
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایک پرانے مضمون کو کتابی شکل میں شائع کردیا گیا ہے جس میں مولانا نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں زکوٰۃ کی اہمیت اور حکمت پر روشنی ڈالی ہے

۱۰ ۔ ایکتا کا پیامی (ہندی) | از:۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ ۔ ترجمہ:۔ علی الوزبی اے ۔ ناشر:۔ جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام ۹۸/۹۲ ناظر باغ کان پور ۔ طباعت:۔ عمدہ ۔ قیمت:۔ ۲ روپے ۵۰ پیسے، صفحات ۴۸
یہ حضرت الاستاذ سید سلیمان ندویؒ کا تصنیف کردہ کتابچہ کا ہندی ترجمہ ہے ۔ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور پیغام کی تشریح اور تفہیم کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے کی گئی ہے یہ کتابچہ بے حد مفید ہے ۔

۱۱۔ رسول اکرم (ہندی) از:۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ ترجمہ:۔ محمد ولی اللہ ہاشمی۔ ناشر:
مرکزیہ تبلیغ الاسلام ۹۸/۹۲ ناظر باغ کان پور۔ صفحات ۱۱۔ طباعت:۔ عمدہ قیمت ۱ روپیہ ۵۰ پیسے
یہ بھی حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے کتابچہ کا ہندی ترجمہ ہے اسمیں نبی کریم۔
صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سوانح حیات بہت مختصر انداز میں پیش کی گئی ہے وہ ہندی داں حضرات
جو حضور کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے ہاتھوں میں بغیر کسی تامل کے یہ کتابچہ دیا
جاسکتا ہے۔

Phone:- 461

Regd. No. AZM / N. P. 42 / 84
Regd. No. R. N. 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرات (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیۃ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں

ادارے کا خرچ

(۱) ادارے کا سالانہ خرچ ڈھائی لاکھ روپے سے زائد ہے۔

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد ندوے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں، امسال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہوں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون کے بعد شروع ہو جاتا ہے

ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۸۲ء

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ حافظ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے ... اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جسطرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادت کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت اور حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲×۱۸ ۔ صفحات ۵۶، قیمت [illegible]

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ "الفرقان" میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک مجمع میں پڑھوا کر سنوایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ سائز ۲۲×۱۸ ۔ صفحات ۱۰۰، قیمت [illegible]

اسلامی تعلیم

حصہ اول - دوم - سوم - چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت حصہ اول [illegible]، دوم [illegible]، سوم [illegible]، چہارم [illegible]

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے۔ شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی، اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں اُن صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نامی پریس لالباغ ... چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد سے شاہ ... اعظم گڑھ سے شائع کیا

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/-
خصوصی مدد 100/-
قیمت فی پرچہ 2-50

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد
جامعۃ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/-

جلد ۷ | مئی و جون ۱۹۸۴ء مطابق شعبان و رمضان ۱۴۰۴ھ | شمارہ ۳۵

76
(1)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

فروری ۱۹۸۱ء ماہنامہ الرشاد کا آغاز ہوا تو راقم الحروف نے اس کی ضرورت پر جو کچھ لکھا تھا اس میں یہ بات بھی تھی

"اس ہوشربا گرانی کے زمانے میں کسی نئے پرچہ کا نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مگر کسی ادارہ کے مقاصد، عزائم اور اس کے کاموں کی پوری نوعیت کو دوسروں کو سمجھانے کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ خود ادارہ کا ایک آرگن ہو، اس وقت مسلمانوں کے اندر، جماعتی، مسلکی، طبقاتی اور سیاسی عصبیتیں اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں کہ کسی کو اپنے حلقہ کے باہر کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اور ان کے رسالے، پرچے اخبارات سب اس کا شکار ہیں، اب اگر کوئی شخص یا ادارہ ان کے ذہنی سانچے اور بنائے ہوئے طریق کار سے ہٹ کر کوئی دینی شرعی یا ملی بات خواہ کتنی حقیقت پسندانہ ہو کہنا چاہیئے تو مشکل ہی سے اس کی کوئی بات وہ لوگ سن سکتے ہیں اور ان کے پرچے اسے چھاپ سکتے ہیں، اسی صورت حال سے مجبور کر پرچہ نکالا جا رہا ہے کہ اگر دین واخلاق یا ملک وملت کے سلسلے اعتدال وتوازن اور اتفاق واتحاد کی کوئی بات کہنی ہو تو اس کیلئے کوئی دائرۂ اثر خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو ہونا ضروری ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس چھوٹے سے دائرہ کے ذریعہ اعتدال وتوازن اور اتحاد واتفاق پیدا کرنے کا کوئی معمولی سے معمولی کام لینے کی توفیق عطا فرمائے"

بحمد اللہ الرشاد اب تک اسی روش پر قائم ہے۔ حتی الامکان اس نے اپنا دامن جماعتی، مسلکی اور ذوقی عصبیتوں سے بچائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کسی شخص یا جماعت کے کاموں کی تحسین کی گئی ہے تو اس کے کاموں کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہے اور اگر کسی کے کام یا طرز عمل کے بارے میں کوئی ناگوار بات زبان وقلم سے نکلی ہے تو بحمد اللہ اسمیں کسی عصبیت یا انتقام کا جذبہ نہیں رہا ہے بلکہ اصلاح مقصود رہی ہے۔ لیکن اگر نادانستہ طور پر کوئی ایسی بات

قلم سے نکل گئی ہو جس سے کسی کو اذیت پہنچی ہو تو ہم اُنسے معذرت خواہ ہیں ہم کو اگر کسی نے تحسین کا خط لکھا ہے تو اس سے ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں، اور اگر کسی نے تنقید کا خط لکھا ہے تو ہم نے کھلے دل کیساتھ انکی تنقید کو برداشت کیا ہے۔ بلکہ اسے شائع کر کے ناظرین الرشاد تک بھی پہنچایا ہے۔ جیساکہ رسالے کے مقاصد کے سلسلے میں اوپر عرض کیا گیا ہے حتی الامکان دینی واجتماعی مسائل میں اعتدال و توازن کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور اجتماعی مسائل میں اتحاد و اتفاق کی نہ صرف دعوت دی جائے بلکہ اس کی عملاً پوری جد و جہد کی جائے یہ روش کچھ ایجاد بندہ نہیں ہیں بلکہ اس کا ماخذ قرآن پاک کی یہ ہدایات ہیں۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا — اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوط پکڑ لو اور متفرق ہو کر نہ ہو

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا — کسی قوم کی دشمنی تمکو اس بات پر امادہ نہ کرے کہ تم عدل و

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى — انصاف سے ہٹ جاؤ عدل و انصاف اختیار کرو یہی تقوی سے قریب تر ہے

ہم کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ کسی کام کرنے والے کیساتھ اگر کوئی جماعتی یا مسلکی عصبیت ہوتی ہے تو اسکا کام قدرے آسان ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالی نے جو تھوڑا بہت علم دین کا فہم عطا کیا ہے اسکی بنا پر کسی عصبیت کا راستہ اختیار کرنے کیلئے ہم تیار نہیں ہیں خواہ اس میں کتنی ہی دقتیں کیوں نہ ہوں بقول علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ

از بسکہ جادہائے غلط شاہ راہ گشت
بے راہبر رفتنم ذطریق خطا نہ بود

لیکن اسی کیساتھ خدا تعالی سے ہم اس بات سے بھی پناہ مانگتے ہیں کہ کسی رائے کے قائم کرنے یا کوئی طرز عمل اختیار کرنے میں کتاب و سنت کا راستہ ہم سے چھوٹے یا اسلاف اور جمہور امت کے خلاف ہم کوئی نئی روش اختیار کریں،

روزہ

روزہ کو عربی میں صوم کہتے ہیں، صوم کے معنی بات چیت یا کھانے پینے سے رک جانے کے ہیں۔ اور شریعت میں صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کھانا پینا چھوڑنے، عورت سے الگ رہنے اور بری باتوں سے بچنے کو صوم یا روزہ کہتے ہیں

روزہ کی اہمیت قرآن کی متعدد آیات اور بے شمار احادیث نبوی سے روزہ کی نہ صرف اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا شمار ان فرض عبادات میں ہوتا ہے جن پر ایمان و اسلام کی بنیاد ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ)

مسلمانو! تمہارے اوپر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے دوسری امتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی طرح روزہ کا حکم بھی خدا نے دوسری امتوں کو بھی دیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے نبی اور رسول دنیا میں گذرے ہیں ان سب نے اس کی تاکید کی تھی اور اسے فرض قرار دیا تھا۔ اہل کتاب میں روزہ کا رواج تو تھا ہی، ان کے علاوہ مشرک قوموں میں برت کا رواج قرآن کی اس تاریخی شہادت پر یقین کے لئے کافی ہے۔ صرف جو فرق ہے وہ روزوں کی تعداد اور وقت میں ہے۔ یہ امت مسلمہ کی خصوصیت ہے کہ اس پر پورے ایک مہینے کے روزے فرض کئے گئے ہیں قرآن نے من قبلکم کے لفظ سے صرف ایک تاریخی حقیقت ہی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کے سامنے اس کی طبعی مشقت کو یہ کہہ کر آسان بنا دیا ہے کہ تم سے پہلے اگلی امتیں بھی اس مشقت کو برداشت کر چکی ہیں۔

قرآن شریف جو اس دنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت ہے اسکا نزول اسی مبارک مہینے میں شروع ہوا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (بقرہ) رمضان کا مہینہ وہی ہے جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن روزے کے مہینے سے نازل ہونا شروع ہوا۔ قرآن پاک کی دوسری آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رمضان میں بھی اس مبارک رات سے اس کا نزول شروع ہوا جسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، ہم نے قرآن پاک کو شب قدر میں نازل کیا۔ اس بارے میں محدثین کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے کہ وہ کون سی رات تھی۔ کسی نے ۲۵ویں رات کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کسی نے ۲۷ویں کو، مگر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ شب قدر (آخری عشرہ کی) پانچ طاق راتوں میں سے کسی رات میں پڑ سکتی ہے، اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ انہی پانچ راتوں میں سے کسی رات سے اس کا نزول شروع ہوا۔

قرآن کی پہلی آیت لعلکم تتقون پر ختم ہوتی ہے اور دوسری آیت لعلکم تشکرون پر۔ روزہ کی روح انہی دو لفظوں میں پنہاں ہے یعنی روزہ سے آدمی کے اندر پرہیزگاری اور اللہ کی بے شمار نعمتوں کی شکرگذاری کی امید کی جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ چیز نہ پیدا ہو تو پھر وہ روزہ بے روح ہوگا جس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے۔

حدیث نبوی میں روزہ کی بے شمار فضیلت آئی ہے۔ چند ارشادات نبوی یہ ہیں:۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ " اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر نیکی کا ثواب بندوں کے اعمال نامے میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھا جاتا ہے۔ لیکن روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دوں گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجر کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "روزے دار کی منہ کی بو خدا کو مشک سے بھی زیادہ پسند ہے" ایک حدیث میں ہے کہ "ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادت کا دروازہ روزہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ روزہ گناہوں سے بچنے کے لئے ایک ڈھال ہے۔" آپ نے فرمایا کہ "جن روزہ داروں کے روزے مقبول ہو جائیں گے ان کے لئے قیامت کے دن ایک دروازہ ہوگا جس سے وہ جنت میں داخل ہوں گے اس دروازہ کا نام ریّان یعنی سیراب کرنے والا ہوگا۔" آپ نے فرمایا کہ "جب روزہ شروع ہوتا ہے تو شیطان مقیّد کر دیئے جاتے ہیں، جہنم کا دروازہ بند کر دیا

جاتا ہے۔ اور جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "روزہ قیامت کے دن خدا سے سفارش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اے پروردگار اس نے میری وجہ سے کھانا پینا اور اپنی خواہش نفس کو چھوڑ دیا تھا تو اس کی مغفرت فرما۔"

لیکن یہ اجر و ثواب اس وقت ملے گا جب روزہ مقبول ہو اور کسی عبادت کے مقبول ہونے کے لئے سب سے ضروری چیز خلوص ہے۔ یعنی وہ عبادت صرف خدا کے لئے کی گئی ہو۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں خلوص دوسری عبادتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اگر چاہے تو چھپ کر کھا پی سکتا ہے یا اپنی خواہشِ نفس پوری کر سکتا ہے اور یہ سب کرتے ہوئے خدا کے علاوہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا، مگر اس کے باوجود نہ تو وہ کھاتا پیتا ہے اور نہ اپنی خواہشِ نفس پوری کرتا ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ خدا ہی کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا نے کہا ہے کہ "روزہ کا بدلہ میں دوں گا۔"

لیکن اس خلوص کے باوجود بعض اعمال ایسے ہیں کہ جو روزہ کے خلوص کو خراب کر دیتے ہیں اور روزہ دار اس کے ثواب سے محروم رہ جاتا ہے، مثلاً روزہ میں لڑائی جھگڑا کرنا، گالی گفتہ بکنا، پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا، چغلی کرنا، حرام مال کھانا، جو لوگ ان باتوں سے نہیں بچتے ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ،

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔	جو شخص غلط، جھوٹ اور گناہ کی بات اور غلط اور گناہ کا کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

غلط بات اور غلط عمل میں زبان اور جسم کا ہر برا اور غلط عمل شامل ہے۔

آپؐ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا،

كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاُ	کتنے روزہ دار ہیں جن کو پیاسا رہنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہے۔

اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا ہے کہ روزے سے گناہ ضرور معاف ہوتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں ایک ایمان اور دوسرے احتساب۔ مَنْ صَامَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا

غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ ایمان تو یہ ہے کہ اس کو خدا، آخرت، رسالت وغیرہ پر یقین ہو اور احتساب یہ ہے کہ روزہ خدا ہی کیلئے رکھا گیا ہو اور اس کو تمام برائیوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔

ایمان واحتساب کی قید لگا دینے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ ایمان اور احتساب کے بغیر بھوکے پیاسے رہتے ہیں ان کا بھوکا پیاسا رہنا روزہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر برت اور بھوک ہڑتال وغیرہ کو اسلامی شریعت میں روزہ نہیں کہا جائے گا۔ اگر ان تمام باتوں کا خیال کر کے آدمی روزہ رکھے تو جیسا کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے۔ واقعی آدمی پرہیزگار اور متقی بن سکتا ہے اور اس کا نفس اس کے قابو میں آسکتا ہے۔

اسی اہمیت کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی اور رمضان کے درمیان برابر صحابہؓ کو روزہ مقبول بنانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے آپؐ نے بار بار فرمایا ہے کہ "جو شخص ایمان واحتساب کے ساتھ روزہ رکھے گا اسکے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔" مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے شعبان کے آخری دنوں میں صحابہؓ کے مجمع میں ایک تقریر فرمائی جس میں فرمایا کہ "ایک بہت ہی مبارک مہینہ تمہارے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اس مہینہ میں ایک رات ہزار مہینے سے زیادہ بہتر ہے۔ دن میں اس کے روزے فرض ہیں اور رات کو عبادت میں ثواب ہے اس میں نفل کا ثواب فرض کے برابر، اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور سلوک کا مہینہ ہے۔ اس میں مومن کی روزی زیادہ ہو جاتی ہے، جو شخص روزہ دار کو افطار کرا دے اس کو ایک روزہ کا ثواب ملے گا۔ اس پر صحابہؓ نے دریافت فرمایا، یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص کے پاس اتنا وافر کھانا تو نہیں ہوتا کہ خود بھی کھائیں اور کسی کو افطار بھی کرائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کچھ نہ ہو تو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی ہی سے افطار کرا دو۔ غور کیجئے کہ کتنے صحابہؓ کے پاس اتنا زیادہ کھانا بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کو افطار کرا سکیں، مگر اس کے باوجود روزہ رکھتے تھے۔ خود آپؐ کا حال بھی یہی رہتا کہ آپؐ کو کبھی کبھی روزہ پر روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ یعنی مشکل سے پیٹ بھر کھانا میسر ہوتا تھا۔ (بخاری ومسلم، بیہقی، شعب الایمان)

روزہ کب فرض ہوا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابہؓ جب تک مکہ میں رہے ہمیشہ نفل روزے رکھتے تھے، مگر اب تک رمضان کا روزہ فرض نہیں ہوا تھا۔ جب آپ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں جانے پر بھی ڈیڑھ برس تک روزہ فرض نہیں ہوا، ڈیڑھ برس کے بعد یعنی سنہ ۲ھ میں رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض ہوئے۔

ہر عاقل بالغ، مرد اور عورت پر پورے رمضان کے مہینہ کا روزہ فرض ہے، اس کی فرضیت کا انکار کرنے والا کافر اور بغیر کسی عذرِ شرعی اس کا چھوڑنے والا سخت گنہ گار اور فاسق ہوگا اگر کوئی شخص ایک وقت کی نماز چھوڑ دے تو اس کو صرف ایک وقت کی نماز قضا ادا کرنی ہوگی لیکن اگر کوئی ایک روزہ قصداً توڑ دے تو اس کے بدلے اس کو مسلسل دو مہینے تک روزہ رکھنا پڑے گا، اور پھر بھی اس کو وہ اجر اور ثواب نہیں مل سکتا جو رمضان کے ایک روزہ کا تھا۔ رمضان کا روزہ چاند دیکھکر شروع کرنے کا حکم ہے اور چاند دیکھ کر ختم کر دینے کا، اس لئے پہلے چاند دیکھنے کا بیان کیا جاتا ہے۔

رمضان کا چاند دیکھنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "چاند دیکھکر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ توڑ دو"۔ اسی حکم کی بنا پر شعبان کی ۲۹ تاریخ کو مطلع کے اوپر رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ مطلع سے مراد آسمان کا وہ حصہ ہے جہاں چاند نکلتا ہے یہ ہر موسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اگر ۲۹ کو چاند دکھائی دے تو دوسرے دن سے روزہ رکھنا چاہیئے اور اگر چاند دکھائی نہ دے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ مہینہ ۳۰ کا ہے اور ۳۰ کا دن گذار کر دوسرے دن سے روزہ رکھ لینا چاہیئے۔ خواہ کوئی چاند دیکھے یا نہ دیکھے۔

یہ حکم اس وقت کا ہے جب مطلع یعنی چاند نکلنے کی جگہ پر بدلی یا بہت زیادہ گرد و غبار[1] نہ ہو لیکن اگر ۲۹ تاریخ کو مطلع صاف نہ ہو تو پھر دوسرے دن ۱۰، ۱۱ بجے تک چاند کی خبر کا انتظار کرنا چاہیئے اور کھانا پینا نہ چاہیئے کہ ممکن ہے کہیں سے چاند کی معتبر خبر آ جائے۔

اگر آ جائے تو پھر روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیا جائے اور اگر نہ آئے

ع۱ عالمگیری ج ۱ ص ۱۹۷

تو پھر کھا پی لینا چاہئے[۱]۔

(۱) ۲۹ ر تاریخ کو اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نہ ہو تو پھر ۳۰ ر تاریخ کو چاند کی خبر کے بغیر روزہ کی نیت کرنا مکروہ ہے بعض لوگ یہ نیت کر لیتے ہیں کہ اگر چاند کی خبر آئی تو رمضان کا روزہ ورنہ نفل کا روزہ، یہ بھی مکروہ ہے۔ شریعت میں اس کو شک کا دن کہتے ہیں۔ اور اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔

(۲) بعض لوگ اس خیال سے تیس کا روزہ رکھ لیتے ہیں کہ تیس روزے پورے ہو جائیں یہ بھی مکروہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ توڑ دو چاہے انتیس روزے ہوں یا تیس۔

چاند کی گواہی اگر مطلع صاف نہ ہو اور عام لوگوں کو چاند نظر نہ آیا ہو، لیکن اگر ایک نمازی پرہیزگار اور سچا مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت یہ گواہی دے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی گواہی مان لینی چاہئے اور دوسرے دن سے روزہ شروع کر دینا چاہئے[۲]۔ یہ تو رمضان کے چاند کا حکم تھا لیکن اگر بدلی یا غبار کی وجہ سے عید کا چاند نہ دکھائی دے تو پھر ایک آدمی کی گواہی قابل اعتبار نہیں ہے، چاہے وہ کتنا پرہیزگار اور نمازی کیوں نہ ہو، بلکہ اس کے لئے دو پرہیزگار اور سچے مسلمان مرد، یا ایک مسلمان مرد اور دو عورتوں کی گواہی کی ضرورت ہے۔

یہ تو مطلع صاف نہ ہونے کا حکم تھا، اگر مطلع صاف ہو تو پھر ایک یا دو آدمی کے دیکھنے اور ان کی گواہی دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اتنے آدمیوں کا دیکھنا ضروری ہے کہ ان سب کو جھٹلانا آسان نہ ہو[۳]۔

---

[۱] رد المحتار و یفتی العامۃ بالتلوم الی وقت الزوال ثم بالافطار ج ۲ صفہ ۱۲۴

[۲] فتاویٰ ھندیہ ج ۱ صفہ ۱۹۷ [۳] علامہ شامی نے نشر العرف میں اس بات کی تفصیل کرتے ہوئے کہ عرف و عادت کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ رویت ہلال کے مسئلہ کو بھی لیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ حسن امام صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ مطلع خواہ صاف ہو یا نہ صاف، ایک دو آدمیوں کی شہادت ہر حال میں قبول کر لینی چاہئے"، اس کے بعد کہتے ہیں کہ امام صاحب کی اس رائے کو کسی نے قبول نہیں کیا ہے لیکن موجودہ دور میں دین کی طرف سے جو سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر اس روایت پر عمل زیادہ مناسب ہے، وینبغی العمل علیہا فی زماننا لان الناس تکاسلوا عن ترای الاھلۃ (صفہ ۱۲۰)

چاند کی خبر چاہے کتنی دور سے کیوں نہ آئے۔ اگر قابلِ اعتبار طریقے سے آئی ہے تو وہ مان لی جائے گی۔ ریڈیو، ٹیلیفون، وائرلیس یا ٹیلی ویژن کے ذریعہ اگر چاند کی خبر پہنچانے کا ایسا باقاعدہ انتظام ہو جائے کہ اس میں شک باقی نہ رہے یعنی اس کا انتظام دیندار، اور پرہیزگار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو تو اسکی خبر مان لی جائے گی، بشرطیکہ دونوں جگہوں میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک جگہ ایک دن پہلے چاند نکلتا ہو اور دوسری جگہ دوسرے دن۔ مثلاً حجاز میں ایک دن پہلے چاند دکھائی دیتا ہے اور ہندوستان میں ایک دن بعد دکھائی دیتا ہے تو حجاز کی خبر کا ہندوستان میں اور ہندوستان کی خبر کا حجاز میں اعتبار نہیں کیا جائے گا، اسی طرح دوسرے ممالک کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

فقہ کی عام کتابوں میں یہ بات تو ملتی ہے کہ اگر مشرق کی خبر مغرب میں باوثوق ذرائع سے پہونچ جائے تو وہ مان لی جائے گی لیکن ساتھ ہی بعض محققین فقہائے احناف نے اختلاف مطلع کو بھی تسلیم کیا ہے جیساکہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ کی رائے کا ذکر آگے آرہا ہے بظاہر دونوں رایوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ سمجھنا پڑے گا کہ جن فقہانے مشرق کے مطلع کو مغرب کا مطلع قرار دیا ہے اس سے ان کی مراد عرب اور اس کے قریبی ملک تھے۔ پوری دنیا ان کے پیشِ نظر نہیں تھی۔ اسی بنا پر مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی فرنگی محلیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اور مختلف فقہا کی عبارتیں نقل کرنے کے اپنی آخری رائے دی ہے کہ

> عقل و نقل دونوں اعتبار سے سب سے صحیح مسلک یہی ہے کہ ایسے دو شہر جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ان کے مطلع بدل جائیں جس کا اندازہ ایک ماہ کی مسافت سے کیا جاتا ہے، ان میں ایک شہر کی دوسرے شہر کے لئے معتبر نہیں ہونی چاہئے۔ اور قریبی جگہوں میں جن کے درمیان ایک ماہ سے کم کی مسافت ہو ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ کیلئے ضروری ہوگی۔

اس سلسلہ میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء نے ۱۹۶۷ء میں مختلف علماء کی متفقہ رائے سے جو فیصلہ دیا تھا وہ یہ ہے :۔

۱۔ نفس الامر میں پوری دنیا کا مطلع ایک نہیں ہے بلکہ اختلاف مطالع مسلم ہیں یہ ایک واقعاتی چیز ہے اس میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ البتہ فقہاء اس باب میں مختلف ہیں کہ صوم وافطارِ صوم کے باب میں یہ اختلاف مطالع معتبر ہے یا نہیں؟ مختلف محققین احناف اور علمائے امت کی تصریحات اور ان کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ رائے ہے کہ بلاد بعیدہ میں اس باب میں بھی اختلاف مطلع معتبر ہے۔

۳۔ بلاد بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں باہم اس قدر دوری واقع ہو کہ عادۃً ان کی رویت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہے۔

۴۔ بلاد قریبہ وہ شہر ہیں جن کی رویت میں عادتًا ایک دن کا فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ ہندوستان و پاکستان اور بعض قریبی ملکوں مثلاً نیپال و بنگلہ دیش کا مسئلہ ایک ہے۔ علمائے ہند و پاک کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا ہے

۶۔ مصر و حجاز جیسے دور دراز ملکوں کا مسئلہ ہندوستان کے مسئلہ سے علاحدہ ہے۔ یہاں کی رویت ان ملکوں کے لئے اور ملکوں کی روایت یہاں والوں کے لئے ہر حال میں لازم و قابل قبول نہیں ہے۔

بعض جگہوں پر ہوائی جہاز پر چڑھ کر چاند دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ ایک لاحاصل کام ہے اور شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

ایک شخص نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا مگر کسی وجہ سے اس کی گواہی قبول نہ کی گئی تو اس کو دوسرے دن روزہ رکھنا واجب ہے۔ اس کو عید نہ کرنی چاہیے۔[1]

روزہ کا وقت روزہ کا وقت صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ یعنی روزہ کی نیت سے اسوقت تک کھانا پینا چھوڑنے اور عورت سے مباشرت نہ کرنے کا نام روزہ ہے۔ کھانے پینے میں یہ بھی شامل ہے کہ معدہ میں کسی اور طریقہ سے غذا یا دوا وغیرہ نہ پہنچے اور عورت سے مباشرت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جن کے ذریعہ آدمی ارادہ کے ساتھ اپنی خواہش نفس

---

[1] رد المحتار۔

پوری کرے اور منی خارج ہو جائے۔ احتلام اس لئے اس حکم سے خارج ہو گیا کہ اس میں ارادہ نہیں پایا جاتا۔

روزہ کی نیت روزہ کے صحیح ہونے کے لئے نیت ضروری ہے۔ اگر بغیر نیت کے رکھا جائے تو درست نہ ہوگا۔ مثلاً کسی نے دن بھر کھایا پیا نہیں مگر روزہ کی نیت نہیں کی تو روزہ نہیں ہوگا لیکن زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس کیلئے دل میں ارادہ کر لینا کافی ہے مثلاً روزہ رکھنے کے لئے سحری کھائی یا سحری کے وقت کچھ کھایا پیا تو نہیں، مگر روزہ کی نیت سے کلّی کی، پانی پیا تو یہ بھی نیت سمجھی جائے گی[۱] نیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عربی میں کریں، بلکہ وہ جس زبان کو جانتا ہے اسی زبان میں کرلے۔

رمضان کے روزے کی نیت یا تو رات ہی میں کرلی جائے، یا دوپہر سے پہلے پہلے کرلینی چاہیئے۔ نیت میں اتنا ارادہ کرلینا یا زبان سے کہہ دینا کافی ہے کہ آج میں رمضان کا روزہ رکھونگا اگر رمضان کا ذکر نہ کیا بلکہ صرف روزہ کہا تب بھی روزہ ہو جائے گا۔ عربی کی نیت یہ ہے

نَوَیْتُ بِصَوْمِ الْیَوْمِ۔

سحری روزہ رکھنے کی نیت سے جو کھانا یا پانی صبح صادق سے پہلے کھایا پیا جاتا ہے، اسے سحری کہتے ہیں۔ سحری کھانا سنت ہے۔ اور اس کھانے میں ثواب ہے۔ اگر کھانے کی خواہش کم ہو تو تھوڑا سا کوئی میٹھا کھا لے یا دودھ وغیرہ پی لے۔ اگر بالکل خواہش نہ ہو تو دو چار گھونٹ پانی ہی پی لے مگر سحری کی نیت سے ضرور کچھ کھا پی لینا چاہیئے۔

بعض لوگ احتیاط کے خیال سے تین چار گھنٹہ رات رہتی ہے جب ہی سحری کھا لیتے ہیں ایسا کرنا اچھا نہیں ہے بلکہ سحری دیر کرکے کھانا سنت ہے۔

سحری کے سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنی چاہیئے

(۱) اگر رات کو سو جانے کی وجہ سے سحری نہ کھا سکے تب بھی روزہ رکھنا چاہیئے۔ اگر سحری نہ کھانے کی وجہ سے کسی نے روزہ نہ رکھا تو بہت بڑا گناہ ہوگا۔

(۲) کسی کی آنکھ دیر میں کھلی اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ سحری کا وقت نہیں تھا تو روزہ اس کا

---

[۱] بحرالرائق

بیکار گیا، اب رمضان کے بعد اس کی قضا رکھنی پڑے گی۔ لیکن اس دن بھی اس کو روزہ داروں کی طرح رہنا چاہئے۔ یعنی روزہ کے احترام میں کچھ کھانا پینا نہ چاہیئے۔

(۳) اگر یہ شک ہو جائے کہ اب وقت ہے یا نہیں تو ایسی حالت میں سحری نہ کھانا چاہئے

افطار سورج ڈوبنے کے بعد روزہ ختم کرنے کے خیال سے جو کچھ کھایا پیا جاتا ہے، اس کو شریعت میں افطار کہتے ہیں جسطرح سحری میں دیر کرنا ثواب ہے اسی طرح افطار میں جلدی کرنا ثواب ہے۔ جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی اس بات کا یقین ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا فوراً روزہ افطار کر لینا چاہئے۔ یہ انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ ذرا اندھیرا ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت اس وقت تک بھلائی پر رہے گی جب تک افطار میں جلدی کرتی رہے گی۔ دیر کرنا مکروہ ہے۔ چھوہارے یا کھجور یا پانی سے افطار کرنا بہتر ہے، افطار کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھنی چاہیئے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔

اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیری دی ہوئی روزی سے افطار کیا۔

افطار کرنے کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیئے:۔

ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ۔ (بخاری و مسلم)

پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اس کا اجر بھی ملا۔

روزہ افطار کرنے کے کچھ دیر بعد مغرب کی نماز پڑھنی چاہیئے

گیارہ مہینوں میں اذان کے بعد فوراً مغرب کی نماز پڑھنی چاہئے لیکن رمضان میں افطار کی وجہ سے اگر نماز میں کچھ دیر ہو جائے تو کچھ ہرج نہیں ہے۔ مگر اتنی دیر نہ کرنی چاہئے کہ بالکل اندھیرا ہو جائے۔

(۱) بدلی کے دنوں میں ذرا دیر کر کے روزہ کھولنا چاہئے۔ جب تک پورا یقین نہ ہو جائے کہ سورج ڈوب گیا ہے اس وقت تک روزہ نہ کھولنا چاہیئے۔ چاہے گھڑی کے اعتبار سے وقت ہو ہی کیوں نہ گیا ہو[1]

---

[1] رد المحتار۔ ج ۲ صفہ ۱۸۳

(۲) اگر یقین ہوگیا کہ سورج ڈوب گیا اور افطار کرلیا، اس کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا تو اس کی قضا رکھنی پڑے گی۔

(۳) اگر بعد میں صرف شبہ ہو کہ سورج غروب ہوا تھا یا نہیں تو اس شک و شبہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے، یقین ہونا چاہیے۔

روزہ میں کرنے کا کام روزہ میں اپنا کوئی وقت بے کار کاموں اور فضول باتوں میں نہ گنوانا چاہیے بلکہ جو وقت روزی کمانے سے بچے اسے قرآن کی تلاوت، نفل، نماز یا کسی اور نیک کام میں صرف کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو شدید گرمی کے زمانے میں روزہ رکھے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے اور تبلیغ کی ہے اگر وہ تلاوت قرآن یا کوئی اور نیک کام نہ کرے تو فضول باتوں میں لگے رہنے سے بہتر ہے کہ سو جائے تاکہ گناہ سے تو بچا رہے۔

روزہ کے مکروہات روزہ میں کھانا پینا اور مباشرت ترک کرنا تو فرض ہے، ان کے ارتکاب سے روزہ ٹوٹ ہی نہیں جاتا بلکہ ایک روزہ کے بدلے اس کو دو مہینے مسلسل روزے رکھنے پڑیں گے، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے اور ثواب کم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔ (۱) پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا اور چغلی کھانا گالی گفتہ کرنا سخت کلامی کرنا، چیخنا چلانا، فضول باتیں کرنا، لڑائی جھگڑا کرنا (۲) بھوک پیاس کی وجہ سے گھبراہٹ اور بے چینی ظاہر کرنا (۳) کسی چیز کا منہ میں ڈالے رکھنا یا چبانا خواہ وہ کھانے کی چیز ہو یا نہ ہو (۴) کوئی کھانے کی چیز چکھنا، اگر کسی عورت کا شوہر یا کسی ملازم کا مالک چڑچڑا اور بدمزاج ہو تو ان کو زبان کی نوک سے نمک چکھ لینے کی اجازت ہے تاکہ تو تو میں میں نہ ہو (۵) روزہ کی حالت میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے میں اتنا زیادہ مبالغہ کرنا کہ حلق تک پانی چلا جائے یا ناک کے ذریعہ حلق میں پانی آجائے (۶) نہانے کی ضرورت ہو مگر صبح صادق کے بعد تک نہ نہانا، صبح ہونے اور دن نکلنے کے بعد نہانا اور زیادہ برا ہے (۷) کوئلہ چبا کر یا منجن وغیرہ سے دانت صاف کرنا۔ یہی حکم ٹوتھ پیسٹ کا بھی ہے (۸) منہ میں بہت سا تھوک جمع کرکے نگل جانا یا دانت میں چنے سے کم کوئی چیز اٹکی ہو تو

اس کو نگل جانا (۹) اگر یہ خیال ہو کہ اپنے اوپر قابو نہیں رہے گا تو عورت کا بوسہ لینا اور اس سے بغل گیر ہونا مکروہ ہے لیکن اگر یہ خدشہ نہ ہو تو کوئی ہرج نہیں ہے مگر جوان آدمی کو ہر حال میں اس سے بچنا چاہیئے [۱] اور عورت کا ہونٹ منھ میں لینا ہر حال میں مکروہ ہے (۱۰) اپنے منھ سے چبا کر بچے کو کوئی چیز کھلانا۔

جن باتوں سے روزہ مکروہ وفاسد نہیں ہوتا

(۱) سر پر تیل ڈالنا (۲) بدن پر تیل ملنا (۳) سرمہ لگانا (۴) مسواک کرنا، مسواک خواہ سوکھی ہو یا گیلی۔ دوپہر کے بعد کی جائے یا دوپہر سے پہلے (۵) خوشبو لگانا یا سونگھنا (۶) بھولے سے کھالینا یا پانی پی لینا، یا عورت سے ہم بستر ہو جانا۔ اگر دوسرا آدمی کسی کو روزہ میں بھول کر کھاتے پیتے دیکھے تو اس کو فوراً بتانا چاہیئے کہ روزہ ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ بہت بھوکا پیاسا ہے تو پھر نہ بتانا چاہیئے (۷) خود بخود قے ہو جانا خواہ زیادہ ہو یا کم (۸) منھ میں جو ذرا سا تھوک آجاتا ہے اس کو نگل جانا (۹) بغیر ارادہ مکھی یا دھواں وغیرہ کا حلق سے اتر جانا (۱۰) گرمی کی شدت سے بار بار کلی کرنا یا بدن پر پانی ڈالنا یا کپڑا تر کر کے بدن پر رکھنا [۲] (۱۱) سونے میں احتلام ہو جانا (۱۲) روزہ کا خیال نہیں تھا اور عورت کے ساتھ ہم بستر ہونے لگا یا کھانے پینے لگا مگر اس کو فوراً ہی اپنی غلطی کا علم ہوا اور وہ عورت سے علیٰحدہ ہو گیا یا کھانا پینا چھوڑ دیا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا بلکہ اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیئے۔

کن باتوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے

جن باتوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے وہ دو قسم کی ہیں (۱) ایک وہ جن سے صرف قضا لازم آتی ہے (۲) دوسری وہ جن سے قضا اور کفارہ دونوں لازم آتے ہیں۔

قضا کی صورتیں

قضا کے معنی پورا کرنے کے ہیں، روزہ قضا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس کا ایک یا کئی روزے چھوٹ گئے تو اس کو صرف ایک یا جتنے روزے چھوٹ گئے ہیں رمضان کے

---

[۱] ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ایک بڈھے آدمی کو اس کی اجازت دی اور ایک نوجوان کو منع فرمایا۔

[۲] درمختار میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اسکو مکروہ لکھا ہے لیکن ان کے قول پر فتویٰ نہیں ہے (ردالمحتار)

بعد استطاعت ہی پورے کر لینے چاہئیں۔ ان صورتوں میں قضا ضروری ہے۔
(۱) کسی نے زبردستی روزہ دار کے منہ میں کچھ ڈال دیا اور وہ حلق سے اتر گیا (۲) روزہ یاد تھا مگر کلی کرتے وقت ارادہ کے بغیر بے احتیاطی سے حلق کے نیچے پانی اتر گیا (۳) قصداً منہ بھر کے قے کرنا یا منہ میں ہو واپس قے آئی اور اس کو نگل جانا (۴) جو چیزیں کھائی نہیں جاتیں مثلاً کاغذ، کنکری، مٹی، کوئلہ وغیرہ ان کو قصداً نگل جانا (۵) دانتوں میں روٹی کا ٹکڑا یا گوشت کا ریشہ رہ گیا اور صبح کے بعد اس نے خلال کیا اور وہ حلق سے نیچے چلا گیا تو اگر یہ ٹکڑا چنے سے چھوٹا ہے تو کوئی ہرج نہیں لیکن اگر یہ چنے کے برابر یا اس سے بڑا ہے تو روزہ قضا کرنا چاہیئے اور یہ حکم اس صورت میں ہے جب منہ کے اندر ہی سے نگل جائے، لیکن اگر منہ کے باہر نکال کر پھر اس کو نگل لیا تو وہ ٹکڑا چھوٹا ہو یا بڑا قضا ضروری ہے (۶) کان میں تیل ڈالنا (۷) ناک سے کوئی چیز سڑک لینا اور وہ حلق سے نیچے اتر جائے (۸) دانت سے نکلے ہوئے خون کو اگر وہ تھوک سے زیادہ ہو نگل جانا (۹) بھولے سے کچھ کھا پی گیا اس کے بعد یہ سوچ کر کہ روزہ تو ٹوٹ گیا پھر دوبارہ کچھ کھا پی لیا (۱۰) صبح صادق کے بعد یہ خیال کر کے سحری کھالی کہ ابھی وقت باقی ہے (۱۱) غروب آفتاب سے پہلے اس خیال سے روزہ افطار کر لینا کہ سورج ڈوب چکا ہے (۱۲) رمضان شریف کے روزوں کے علاوہ کسی نفل یا واجب روزے کو قصداً توڑ دینا (۱۳) دوپہر کے بعد روزے کی نیت کرنا۔ ان تمام صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے بدلے میں ایک روزہ رکھنا پڑے گا۔[1]

روزہ قضا کرنے کا وقت روزہ قضا ہو جائے تو سال کے گیارہ مہینے میں جب چاہے اس کی قضا کر لے، مگر رمضان کے بعد فوراً رکھ لینا بہتر ہے۔ قضا روزوں کا مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً کسی کے تین چار روزے قضا ہو گئے ہوں تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کی ایک ساتھ قضا کرے، ایک یا دو دو کو ناغہ دے دے کر قضا کرے تو بھی صحیح ہے۔
کسی پر گذشتہ رمضان کے روزے باقی تھے کہ دوسرا رمضان آگیا تو پہلے اس رمضان کے روزے رکھ لے، پھر رمضان کے بعد قضا روزے پورے کر لے۔ رمضان میں کسی دوسرے

---

[1] شرح وقایہ ج ۱ صفحہ ۳۱۱ و شرح النقایہ

روزے کی نیت کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کرے گا تب بھی وہ رمضان ہی کا روزہ شمار کیا جائے گا

قضا اور کفارہ دونوں کا لازم ہونا

کفارہ کے معنی چھپانے کے ہیں اور شریعت میں کسی گناہ کو چھپانے یا مٹانے کے لئے جو چیز دی جاتی ہے اس کو کفارہ کہتے ہیں۔ جن صورتوں میں کفارہ واجب ہوتا ہے وہ یہ ہیں :۔

(۱) رمضان کا روزہ رکھکر قصداً کوئی ایسا کام کرنا جس کا کرنا روزہ میں منع ہے۔ مثلاً کھانا پینا یا عورت کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرنا۔ کھانے میں یہ بھی شامل ہے کہ منھ کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے قصداً معدہ یا دماغ میں کوئی غذا پہنچادی جائے تو کفارہ واجب[1] ہوگا۔ اسی طرح پینے میں پانی، دوا یا کوئی اور پتلی چیز کے علاوہ حقّہ، سگریٹ، بیڑی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اگر ان چیزوں کا استعمال کوئی کرے گا تو کفارہ دینا ہوگا۔

(۲) روزہ میں کوئی ایسا کام کیا جس کا کرنا جائز ہے۔ مثلاً سر پر تیل مَلا۔ خوشبو سونگھی یا عورت کا بوسہ لیا اور پھر یہ خیال کرکے میرا روزہ ٹوٹ گیا اور قصداً کھا پی لیا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

یہاں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

الف۔ ایک یہ کہ اگر اس کو کسی عالم نے غلط فتویٰ بتا دیا اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو پھر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔

ب۔ دوسرے یہ کہ یہ کام اگر ایسا تھا جس میں بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً اس نے بھول کر پیٹ بھر کھالیا۔ یا عورت سے بغل گیر ہوا اور منی نکل آئی، اب یہ خیال کرکے کہ میرا روزہ ٹوٹ گیا پھر دوبارہ کھا پی لیا تو اس صورت میں بھی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ لیکن اگر یہ کام قصداً کرے گا تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا قضا و کفارہ دونوں ادا کرنا پڑے گا[2]

روزہ توڑ دینے کا کفارہ

رمضان کے روزے کو قصداً توڑ دینے کا کفارہ ادا کرنے کی صورتیں یہ ہیں :۔ (۱) ایک روزے کے بدلے میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنا فرض ہے۔ اگر دو مہینے کے درمیان میں ایک روزہ بھی چھوٹ گیا تو پھر سے روزہ رکھنا ہوگا۔ اس لئے کفارہ کا

---

[1] جدید دور میں اس کی بہت سی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں جو اس سے پہلے نہیں تھیں، فقہائے صرف دو صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ کچھ اور صورتوں کا ذکر آگے آرہا ہے [2] علم الفقہ حصہ سوم

روزہ ایسے وقت شروع کرنا چاہیے جب آدمی خوب تندرست ہو اور آگے کوئی ایسا دن نہ آنے والا ہو جس میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ مثلاً عید الضحیٰ کے دن دنوں میں۔

(۲) کفارہ کے روزے رکھنے کے درمیان میں اگر عورت کو حیض آجائے تو حیض کی مدت ختم کر کے فوراً روزہ شروع کر دینا چاہیے۔ چونکہ یہ قدرتی دائمی عذر ہے۔ اس لئے ان کو اتنی اجازت دی گئی ہے۔ البتہ نفاس کی وجہ سے روزے چھوٹ جائیں تو کفارہ صحیح نہیں ہوگا اسے پھر سے روزہ رکھنا ہوگا، کیونکہ یہ عذر ہر مہینے پیش نہیں آتا۔[۱]

(۳) اگر کسی میں لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا پھر صدقۂ فطر میں جتنا غلہ دیا جاتا ہے اتنا غلہ یا اس کی قیمت ان کو دے دے۔ غلام آزاد کرنے کی صورت باقی نہیں رہی اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اگر اکٹھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا نہ کھلا سکے یا وہ نہ مل سکیں تو ایک کو ساٹھ دن کھانا کھلا دے یا ساٹھ دنوں تک روزآنہ ایک دن کا غلہ دیدے تب بھی جائز ہے۔ مگر ایک آدمی کو ساٹھ دنوں کا اکٹھا غلہ یا اکٹھی قیمت ایک ہی دن دے دی تو کفارہ نہیں ادا ہوا۔ اگر ایک ہی رمضان کے تین چار روزے چھوٹ گئے تب بھی ایک ہی کفارہ واجب ہے لیکن اگر یہ روزے دو رمضان کے ہوں تو دو کفارے دینے ہوں گے۔ رمضان کے علاوہ اگر کوئی نفل روزہ توڑ دے تو کفارہ واجب نہیں ہے۔ اس کی قضا کر لینی چاہیے۔

روزہ نہ رکھنے کی اجازت | جن عذروں کی وجہ سے ایک مسلمان کو رمضان کے روزے نہ رکھنے یا توڑ دینے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں:۔[۲]

(۱) **سفر** | یعنی اگر کوئی شخص ۴۸ میل (۷۲ کلومیٹر) سے زیادہ کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو خواہ سفر پیدل کا ہو یا ریل اور ہوائی جہاز کا اس کو روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن اگر سفر میں تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

اگر کوئی شخص روزہ کی نیت کرنے کے بعد پھر سفر شروع کرے تو اس کو اس دن کا روزہ رکھ لینا ضروری ہے۔

---

[۱] شرح التنویر ج ۲ صفحہ ۹۵ ؛ [۲] فتاویٰ ہندیہ ج ۱ صفحہ ۱۳۲

(۲) مرض اگر کوئی شخص ایسا مریض ہو کہ وہ روزہ رکھے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا یا کوئی نیا مرض پیدا ہو جائے گا، یا اس کے اچھے ہونے میں دیر لگے گی تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے یا مرض تو نہیں ہے لیکن کمزوری اتنی ہے کہ روزہ رکھے گا تو پھر بیمار ہو جائے گا تو اس کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

لیکن مرض کی صورت میں اسی وقت روزہ چھوڑنا چاہیئے جب کوئی نیک محتاط مسلمان ڈاکٹر یا حکیم اس کو روزہ چھوڑنے کا مشورہ دے۔ یا خود آدمی کو پورا یقین ہو، یا یہ تجربہ ہو کہ روزے سے اس کو نقصان پہنچے گا۔

حاملہ اور مرضعہ جو عورت حاملہ ہو یا دودھ پلاتی ہو اس کو اگر اپنی جان یا بچے کی جان کا خطرہ ہو یا اس کو، یا بچہ کو سخت تکلیف میں پڑ جانے کا یقین ہو تو اس کو روزہ چھوڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً روزہ دار حاملہ عورت کو بیہوشی کی کیفیت ہو جاتی ہو، یا اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہو اور بچہ بھوک سے تڑپتا ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص مالدار ہو اور اپنے بچہ کو کسی دوسری عورت سے معاوضہ دے کر دودھ پلوانے کا انتظام کر سکتا ہو، یا بچہ اوپر کا دودھ پی لیتا ہو اور اس کی صحت کو کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو ان صورتوں میں عورت کو روزہ رکھنا فرض ہے۔[۱]

حیض و نفاس حیض و نفاس کی حالت میں بھی عورت کو روزہ چھوڑ دینا چاہیئے۔[۲] لیکن جوں ہی پاک ہو جائے اس کو روزہ شروع کر دینا چاہیئے اور جو روزے چھوٹ جائیں ان کو رمضان کے بعد پورا کر لینا چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حیض و نفاس میں چھوٹی ہوئی نماز تو معاف ہے مگر روزہ معاف نہیں۔

یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہنا چاہیئے کہ ان تمام صورتوں میں رمضان کے بعد جب عُذر دُور ہو جائے اس کی قضا کرنی ضروری ہے۔ اگر نہ کی جائے تو سخت گناہ ہوگا۔

روزہ رکھ کر توڑ دینے کی اجازت اگر کسی کو روزہ رکھ لینے کے بعد (۱) اتنی شدید پیاس لگی یا (۲) اتنی بھوک لگی کہ اگر روزہ نہ توڑے تو اس کی جان چلی جائے گی یا (۳) اس

---

[۱] رد المحتار ج ۲ صفحہ ۱۸۶ ∴ [۲] رد المحتار ج ۲ صفحہ ۱۸۶

پر بیہوشی طاری ہو جائے گی یا (۴) کوئی اور مرض پیدا ہو جائے گا یا (۵) مرض بہت زیادہ بڑھ جائے گا، تو اس حالت میں روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً (الف) کسی کو تیز بخار آ گیا، پیٹ میں یا معدہ میں یا کان میں شدید درد ہوا، اب اگر وہ دوا نہیں پیتا ہے تو اس کا بخار یا درد اچھا نہیں ہوگا تو اس کو دوا پی کر روزہ توڑ دینا چاہئے یا (ب) مثلاً کسان نے دھوپ میں ہل چلایا یا مزدور نے اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کے لئے دھوپ میں محنت مزدوری کی اور اس کو اتنی پیاس لگ گئی کہ وہ روزہ نہیں توڑتا تو بیہوش ہو جائے گا تو اس کو روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص مزدوری پر ہل چلوا سکتا تھا یا بغیر دھوپ میں کام کئے ہوئے اپنے بچوں کی پرورش کر سکتا تھا اور اس نے صرف پیسے کی لالچ میں ایسا کیا تھا تو اس کو روزہ توڑنے کی اجازت تو ہے مگر سخت گنہ گار ہوگا۔

(۲) اسی طرح اوپر جو صورتیں روزہ نہ رکھنے کی بیان کی گئی ہیں، ان کے علاوہ بھی کوئی اچانک بات پیش آجائے تو روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً کوئی اچانک بیمار پڑ جائے یا اچانک سفر پیش آجائے اور اس میں روزہ پورا کرنا ممکن نہ ہو، یا حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت نے روزہ رکھ لیا مگر اس کو یا بچہ کو شدید تکلیف ہو گئی۔ اسی طرح کوئی بے ہوش ہو گیا یا پاگل ہو گیا، ان سب صورتوں میں روزہ رکھ کر توڑ دینا جائز ہے اس روزے کے بدلے صرف ایک قضا روزہ رکھنا ہوگا کفارہ ادا کرنا نہ ہوگا۔

بڑھاپے اور طویل بیماری کا حکم | اگر کوئی اتنا بوڑھا ہو جائے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا یا اس کو کوئی ایسی مہلک یا طویل بیماری ہو کہ اس سے صحت پانے کی بہ ظاہر کوئی امید نہ ہو اور روزہ رکھنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہو تو ایسے آدمی کو اپنے ہر روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت ہے۔

فدیہ | فدیہ کے معنے بدلہ دینے کے ہیں اور شریعت میں نماز قضا ہو جانے یا روزہ نہ رکھ سکنے کے بدلے میں جو خیرات کی جاتی ہے اس کو فدیہ کہتے ہیں۔

ایک روزہ کے بدلے ایک محتاج کو اتنا غلہ دے جتنا غلہ صدقہ فطر میں دیا جاتا ہے

یعنی پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جَو یا ان میں سے کسی ایک کی قیمت دینے دینی چاہئے مگر قیمت دینے میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جس چیز کی قیمت لگانے میں غریبوں کا فائدہ ہو اسی چیز کی قیمت لگائی جائے۔ اگر جَو اور گیہوں کے علاوہ کوئی اور غلہ دے تو پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جَو کی جتنی قیمت ہو اتنی قیمت کا وہ غلہ دے۔

(۱) فدیہ میں اگر غلہ نہ دے بلکہ ایک محتاج کو دونوں وقت پیٹ بھر کھلا دے تو اس سے بھی فدیہ ادا ہو جائے گا مگر وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے (۲) فدیہ کا غلہ یا قیمت کئی محتاجوں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

فدیہ ادا کرنے کے بعد کسی بوڑھے میں طاقت روزہ رکھنے کی آگئی یا کوئی بیمار تندرست ہوگیا تو اس کے چھوٹے ہوئے تمام روزوں کی قضا کرنی واجب ہے۔ اس نے جو فدیہ ادا کیا ہے اس کا ثواب اس کو الگ ملے گا۔

جو لوگ بڑھاپے سے کمزور ہو گئے ہوں، یا کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوں ان کو چاہیئے کہ اپنے روزوں کا فدیہ رمضان ہی میں ادا کر دیں، اس انتظار میں نہ رہیں کہ ممکن ہے طاقت آجائے یا تندرست ہو جائیں۔ پھر قضا رکھ لیں گے۔ ایسا کرنا گناہ ہے۔ موت کا وقت معلوم نہیں، کیا معلوم کس وقت آجائے اور وہ ادا نہ کر سکیں۔

مرنے والوں کا حکم اگر کوئی شخص مر گیا اور اس کے ذمے رمضان کے روزے باقی رہ گئے تھے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس نے فدیہ ادا کر دینے کی وصیت کر دی ہے یا وصیت نہیں کی ہے۔

(۱) اگر اس نے وصیت کر دی ہے تو اس کے وارثوں کو چاہیئے کہ اس کے ایک تہائی مال سے اس روزہ یا نماز کا فدیہ ادا کر دیں، اس کے بعد دو تہائی مال وارث تقسیم کر لیں ہر نماز کے بدلے ایک فدیہ ہے۔

اگر اس کے روزے یا نماز کے فدیہ میں ایک تہائی سے زیادہ مال نکل جاتا ہو تو اتنا ہی فدیہ ادا کرنا ضروری ہے جتنا کہ ایک تہائی میں پورا ہو جاتا ہو۔ بقیہ فدیہ کا ادا کرنا وارثوں پر ضروری نہیں ہے، اگر وہ خوشی سے ادا کر دیں تو یہ ان کو اختیار ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ

مُردہ کے دفن اور کفن میں جو کچھ خرچ ہوا یا اس کے ذمہ اگر کوئی قرض ہو تو اس کو ادا کرنے کے بعد پھر فدیہ ادا کیا جائے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے وصیت نہیں کی ہے تو ایسی صورت میں یہ وارثوں کی مرضی پر ہے وہ ادا کریں یا نہ کریں مگر ادا کر دینا بہتر ہے اس لئے کہ وہ اس کے چھوڑے ہوئے مال سے دنیا میں فائدہ اٹھا رہے ہیں تو اس احسان کے بدلے میں اگر وہ فدیہ ادا کر دیں گے تو اس کو بھی آخرت میں فائدہ ہوگا اور ان کو بھی ثواب ہوگا، ممکن ہے کہ اس کے دل میں وصیت کرنے کی نیت رہی ہو اور وہ نہ کر سکا ہو۔ لیکن جو وارث نابالغ ہوں اگر وہ کہیں بھی تو ان کے حصے سے فدیہ نہ ادا کرنا چاہیئے۔

جن دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے ان دنوں میں نفل، فرض ہر قسم کے روزے رکھنا حرام ہے (۱) عید الفطر کے دن (۲) عید الاضحیٰ کے دن (۳) ایام تشریق یعنی عید الضحیٰ کے دن اور اس کے بعد گیارہ، بارہ، تیرہ تاریخ کو۔

چند اور ضروری باتیں (۱) روزہ چھوڑنے اور قضا رکھ لینے کی جو اجازت شریعت نے دی ہے وہ ہماری طبعی کمزوری کی بنا پر دی ہے ان چیزوں کو بہانا بنا کر یا ان سے فائدہ اٹھا کر اگر کسی نے روزہ توڑ دیا یا نہ رکھا تو گو بندے اس کو ملامت نہ کریں مگر خدا کے یہاں وہ قابل ملامت اور عذاب کا مستحق قرار پائے گا، بندے تو ظاہر پر حکم لگائیں گے مگر خدا ہماری نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ قضا روزہ میں بہر حال وہ ثواب نہیں ہے جو رمضان کے روزوں میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے ایک روزہ کا مقابلہ دوسرے دن کے گیارہ مہینے کے روزے بھی نہیں کر سکتے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

(۲) اگر کسی کو روزہ رکھ کر توڑ دینے یا روزہ چھوڑ دینے کی ضرورت پیش ہی آ جائے تو جہاں تک ممکن ہو اس کو چھپائے اور کسی کے سامنے کچھ کھائے پیئے نہیں اور نہ روزہ دار عورتوں کو پکانے کھلانے کی زحمت دے جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو۔ روزہ کا ظاہری احترام بہر حال ضروری ہے۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شرابی کو جس نے رمضان میں اتفاق سے شراب پی لی تھی، سزا دیتے ہوئے کہا کہ "ہمارے بچے تو روزہ رکھتے ہیں اور تو بالغ ہو کر

شراب پیتا ہے۔ شرم نہیں آتی۔

موجودہ دور میں روزہ نہ رکھنے والوں کو کوئی سزا دینے والا تو نہیں ہے مگر مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آخرت کی سزا دنیا کی سزا سے کئی ہزار گنا سخت ہے۔

(۳) جس طرح نماز کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بچے سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو اور جب دس برس کے ہو جائیں تو مار کر پڑھاؤ۔ اسی طرح سات برس کی عمر کے بچے کو روزہ کی عادت ڈالنی چاہیئے اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ان کو سختی کے ساتھ روزہ کی عادات ڈالنی چاہیئے۔ اوپر حضرت عمرؓ کا قول گزر چکا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ کے زمانے میں عام طور پر بچے روزہ رکھتے تھے حالانکہ عرب کی گرمی اتنی سخت ہوتی ہے کہ ادھر کے جوان آدمی بھی اس سے پریشان ہو جاتے ہیں۔

(۴) اگر کوئی شخص سفر میں تھا اور روزہ نہ رکھنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر دوپہر سے پہلے سفر ختم ہو گیا اور ابھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے تو روزہ کی نیت کر لینی چاہیئے اور روزہ رکھنا چاہیئے۔

(۵) اگر کسی عورت نے حیض کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیا ہے۔ رات کے وقت اس کا خون بند ہو گیا تو اس کو فوراً روزہ کی نیت کر لینی چاہیئے۔ اگر اس وقت غسل نہ کر سکے تو دن میں غسل کر لے[1]۔

نمازِ تراویح رمضان کے مہینے میں عشاء کی فرض اور سنت نماز کے بعد اور وتر نماز سے پہلے جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کو شریعت میں نماز تراویح کہتے ہیں۔ تراویح ترویحہ کی جمع ہے اور یہ لفظ راحت سے بنا ہے، تراویح میں چونکہ ہر چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر بیٹھکر آرام کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو آرام وراحت والی نماز کہتے ہیں۔

نمازِ تراویح کا حکم تمام بالغ مردوں اور عورتوں کے لئے نماز تراویح کا پڑھنا سنت مؤکدہ ہے البتہ عورتوں کو گھر میں پڑھنا چاہیئے اور مردوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ۔ اگر محلہ یا گاؤں کی مسجد میں کوئی شخص بھی تراویح جماعت سے نہ پڑھے تو پورے محلہ اور گاؤں کے لوگ قابل ملامت ہوں گے۔ رمضان کے مہینے میں یوں بھی جس وقت کوئی نفل نماز پڑھے اس کا

---

[1] بہشتی زیور حصہ سوم

ثواب دوسرے مہینوں کے فرض کے برابر ملتا ہے لیکن نماز تراویح کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے آپؐ نے خود بھی نماز تراویح پڑھی ہے اور اس کے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کے پیچھے تراویح پڑھنے والوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ مسجد میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ آپؐ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ ذوق و شوق اور ہجوم دیکھ کر فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ یہ نماز کہیں فرض نہ کر دی جائے۔ ایک دن آپؐ نے نماز تراویح اتنی دیر تک پڑھی کہ صحابہؓ کو یہ خیال ہوا کہ کہیں سحری کے کھانے کا وقت ختم نہ ہو جائے۔

تراویح کا وقت

نماز تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے صبح صادق تک ہے۔

تراویح میں قرآن پڑھنے کا حکم

نماز تراویح میں ایک بار پورا قرآن ختم کرنا سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں حضرت جبریلؑ کو پورا قرآن سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اس سال دو بار آپؐ نے حضرت جبریلؑ کو قرآن سنایا۔ حضرت عمرؓ نماز تراویح کی جماعت اور اس میں پورا قرآن سنانے کا اہتمام کرتے تھے۔

ضروری ہدایتیں

(۱) تراویح میں قرآن اس اہتمام، احتیاط اور ان ہی آداب کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ جو تلاوت قرآن کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں، خواہ مخواہ اتنا زیادہ قرآن کی کوشش نہ کرنی چاہیے کہ قرآن پڑھنے کا حق نہ ادا ہو سکے، ایسا کرنے میں گناہ کا خوف ہے۔

(۲) اگر نمازیوں کو بار نہ معلوم ہو اور صاف قرآن پڑھا جائے تو پھر جتنا قرآن چاہے تراویح میں پڑھا جا سکتا ہے، لیکن اگر نمازیوں کو بار معلوم ہو اور تراویح کی جماعت ٹوٹ جانے یا کم ہو جانے کا خوف ہو تو پھر اتنا ہی قرآن پڑھنا چاہیے جتنا کہ نمازی خوش دلی سے سن سکیں۔ نمازیوں کے لئے جب فرض نماز کو ہلکا کر دینے کا حکم ہے تو یہ تو سنت ہی ہے۔

اگر نماز تراویح میں پورا قرآن ختم کیا جائے تو کسی سورۃ کے شروع میں ایک بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھ لینا چاہیے۔ بعض لوگ قرآن ختم کرتے وقت قل ھو اللہ احد تین بار ضرور پڑھتے ہیں ایسا کرنا ضروری نہیں ہے۔

تراویح میں کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن نماز تراویح باجماعت ادا فرمائی، پہلے دن

مختصر قیام فرمایا، دوسرے دن اس سے طویل اور تیسرے دن اتنا طویل قیام فرمایا کہ بعض صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم کو خوف ہوا کہ سحری نہ چھوٹ جائے۔ چوتھے دن آپؐ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف نہیں لائے اور فرمایا کہ اس نماز کے لئے تمہارا ذوق و شوق دیکھ کر مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کہیں یہ فرض نہ کر دی جائے۔ ان تینوں دنوں میں آپ نے جتنی رکعتیں پڑھیں اس میں صحابہؓ کا اندازہ مختلف ہوا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں مسجد نبوی میں بیس رکعت با جماعت تراویح پڑھنے کا اور پڑھانے کا اہتمام کیا اور عام صحابہؓ اس میں شریک ہوئے اور کسی نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ اسی بنا پر ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور داؤد ظاہریؒ بیس رکعت کے قائل ہیں اور اسی کو جمہور اُمت نے اختیار کیا ہے۔ امام مالکؒ سے اس بارے میں کئی روایتیں ہیں جن میں ایک بیس کی بھی ہے مگر ان کا معتمد علیہ مسلک ۳۶ رکعت کا ہے۔ بعض ائمہ نے اس سے بھی زیادہ لکھا ہے۔ بعض صحابہؓ سے وتر کے علاوہ ۸، ۱۰ رکعت کا تراویح پڑھنا ثابت ہے ہندوستان کے اہل حدیث حضرات اسی پر عمل کرتے ہیں مگر ان حضرات کا بیس رکعت یا اس سے زائد پڑھنے والوں کے فعل کو خلاف سنت کہنا اور اس پر جھگڑنا انتہائی نامناسب بات ہے۔ اس لئے کہ جمہور امت بیس یا اس سے زائد کے قائل ہیں۔ آج بھی حرمین شریفین میں بیس رکعت تراویح پڑھی جاتی ہے۔

تراویح کی نماز میں چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر آرام کر لینا بہتر ہے، اس کو ترویحہ کہتے ہیں۔ اس وقفہ میں چاہے نمازی تسبیح وغیرہ پڑھیں، یا چپ چاپ بیٹھے رہیں یا نفل پڑھیں ان کو اختیار ہے۔

نمازِ وتر جو لوگ جماعت سے تراویح پڑھیں ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ رمضان میں وتر بھی جماعت سے پڑھیں۔

اگر کوئی شخص عشاء کی فرض نماز جماعت سے نہ پڑھ سکا ہو تو اس کو چاہئے کہ پہلے فرض پڑھے اور پھر سنت پڑھے، اس کے بعد تراویح کی نماز میں شریک ہو اور تراویح کی

لہ ابن رشد مالکی بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں فاختار مالک فی احد قولیہ وابوحنیفہ والشافعی واحمد وداؤد القیام بعشرین رکعۃ سوی الوتر وذکر ابن القاسم عن مالک انہ کان یستحسن ستا وثلثین رکعۃ والوتر ثلاث رکعات ج ۱ صفحہ ۱۹۲

جو رکعتیں چھوٹ جائیں ان کو چار رکعت کے بعد آرام کا جو وقفہ ہوتا ہے اس میں پڑھ لے۔

اگر چند آدمی الگ الگ عشاء کی نماز فرض پڑھیں اور پھر جماعت بنا کر تراویح کی نماز شروع کریں تو یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جب فرض نماز جماعت سے نہیں پڑھی تو پھر سنت کو فرض سے زیادہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔

تین رات سے کم میں قرآن ختم کیا جا سکتا ہے لیکن آج کل جو شبینے پڑھے جاتے ہیں ان میں قرآن کے ساتھ تکمیل ہوتا ہے اس لئے اس سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔

عام طور پر جب کسی مسجد میں دس یا پندرہ دن میں قرآن ختم ہو جاتا ہے تو لوگ تراویح میں سستی کرنے لگتے ہیں۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ تراویح میں صرف پورا قرآن سننا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ پورے مہینہ میں تراویح پڑھنا سنت ہے خواہ اس میں قرآن ختم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

آخری عشرہ یوں تو رمضان کا پورا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے مگر اس کے آخری دس دن بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت اہمیت بیان فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ بیان فرماتی ہیں کہ:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهٖ (مسلم)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیک کام اور عبادت میں جتنی محنت رمضان کے آخری دس دنوں میں فرماتے تھے اتنی محنت کسی اور دنوں میں نہیں فرماتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت ہے:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَأَحْيٰى لَيْلَهٗ وَأَيْقَظَ أَهْلَهٗ (بخاری مسلم)	جب عشرۂ آخری داخل ہوتا تھا تو آپؐ کمربستہ ہو جاتے، رات رات بھر جاگتے تھے اور اہل و عیال کو بھی جگاتے تھے۔

اور اس عشرہ میں دو اہم اور ضروری کام ہیں۔ ایک تو اعتکاف کرنا، دوسری لَیْلَۃُ الْقَدْر کو تلاش کرنا یہاں دونوں کاموں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اعتکاف اعتکاف کے لفظی معنی ٹھہرنے اور کسی جگہ بند ہونے کے ہیں۔ شریعت میں رمضان کے آخری دس دنوں میں یا دوسرے دنوں میں دنیاوی کاروبار اور بیوی بچوں سے الگ ہوکر اور کٹ کر مسجد یا گھر میں نماز کی جگہ ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں۔

اعتکاف کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں مسجد میں اعتکاف فرماتے تھے اور آپؐ کے ساتھ صحابہ کرامؓ بھی اعتکاف کرتے تھے۔ آپؐ اعتکاف کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ اگر کبھی وہ کسی وجہ سے چھوٹ جاتا تھا تو عید کے مہینے میں اسے پورا فرماتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں نے یہ سنت بالکل چھوڑ دی ہے۔ اس کو زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ جس بستی میں ایک آدمی بھی اعتکاف نہ کرے تو پوری بستی کے لوگ گنہ گار ہوں گے۔ یہ سنت مؤکدہ کفایہ ہے۔

اعتکاف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب آدمی تمام دنیاوی کاروبار اور نفسانی خواہشات سے الگ ہوکر کچھ دنوں تک ہر وقت خدا کی عبادت اور اس کے ذکر میں لگا رہے گا تو اس سے خدا کا تعلق مضبوط ہوگا۔ اس سے اس کی محبت پیدا ہوگی۔ قلب و دماغ میں طمانیت اور نورانیت پیدا ہوگی۔ اسی طرح جب وہ ایک مدت تک فضول کاموں اور فضول باتوں سے بچے گا اور ہر وقت خدا کی یاد اس کے دل میں تازہ رہے گی۔ تو اس سے اس کو یہ سبق ملے گا کہ ایک بندے کو پوری زندگی میں اسیطرح بری باتوں سے بچنا اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور خدا کی یاد دل میں تازہ رکھنی چاہیئے۔

اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد کے ایک گوشہ میں اپنے لئے ایک جگہ خاص کرلے، اور ایک پردہ باندھکر ایک حجرے کیطرح بنالے اور اس میں دس دن تک رہے۔ لیکن پردہ اس طرح باندھنا چاہیئے کہ جماعت کے وقت اس کو اٹھانے کی ضرورت ہو اٹھا دیا جائے اس جگہ کو عام طور پر معتکف کہدیا جاتا ہے مگر معتکف پوری مسجد ہے البتہ اس کو کھانا پینا، سونا، اور ذکر و تلاوت اس خاص جگہ کرنا چاہیئے

بیس تاریخ کو عصر کی نماز پڑھکر اعتکاف میں بیٹھ جانا چاہیئے اور جب عید کا چاند دکھائی

دے جائے تو اس سے باہر نکل آنا چاہیئے۔

عورتوں کا اعتکاف | یہ مردوں کا حکم ہے، عورتوں کا مسجد میں اعتکاف کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ ان کے لئے اعتکاف کی سب سے بہتر جگہ وہ ہے جہاں وہ پنج وقتہ نماز پڑھتی ہیں۔ اگر نماز کی کوئی جگہ مقرر نہ ہو تو پھر گھر کے کسی صاف اور ستھرے حصہ میں اعتکاف کر سکتی ہیں

اعتکاف کیلئے ضروری شرطیں | اعتکاف کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔
(۱) مردوں کے لئے مسجد[1] اور عورتوں کے لئے گھر میں دس دن تک ٹھہرنا (۲) اعتکاف کی نیت کرنا اعتکاف کی نیت کے بغیر دس دن کوئی مسجد میں ٹھہرا رہے تو اعتکاف نہیں ہوگا (۳) حدث اکبر یعنی جنابت اور حیض و نفاس سے پاک ہونا۔

رمضان کے علاوہ بھی نفل اعتکاف کی اجازت ہے، اس اعتکاف میں روزہ رکھنا بھی ضروری نہیں ہے لیکن یہاں جس مسنون اعتکاف کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے لئے روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر واجب اعتکاف ہو تو اس میں بھی روزہ رکھنا ضروری ہے جیسے کوئی شخص اعتکاف کی نذر مان دے تو اعتکاف واجب ہے۔ اگر مرد کسی وجہ سے روزہ توڑنا پڑے تو اس کا اعتکاف بھی ٹوٹ گیا۔ اسی طرح اگر عورت کو حیض آجائے تو اس کا اعتکاف بھی ختم ہوگیا۔

جو باتیں اعتکاف میں ناجائز ہیں | دو قسم کے کام اعتکاف میں حرام ہیں:-

پہلی قسم کے کام (۱) بلا ضرورت اعتکاف کی جگہ سے باہر نکلنا حرام ہے۔ جن ضرورتوں سے آدمی باہر نکل سکتا ہے وہ دو طرح کی ہیں ایک آدمی کی طبعی ضرورتیں جیسے کھانا پینا، پیشاب پاخانہ، غسل جنابت وغیرہ۔ دوسری شرعی ضرورتیں مثلاً جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد جانا کوئی شخص نماز جنازہ پڑھانے والا نہ ہو تو نماز پڑھانے کے لئے جانا وغیرہ لیکن ان ضرورتوں کے سلسلے میں چند ضروری باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(۱) اگر مسجد میں پیشاب خانہ یا پائخانہ ہو تو اسی میں رفع حاجت کرنا چاہیئے۔ اگر مسجد یا مسجد کے قریب پیشاب، پاخانے کا انتظام نہ ہو اور اس کا گھر دور ہو تو جگہ قریب سے قریب تر ہو وہیں

[1] مسجد میں خواہ جماعت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اعتکاف جائز ہے۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کی یہی رائے ہے اسی کو محققین

جانا چاہیئے۔ البتہ اگر قریب کی جگہ پاخانے جانے میں بے پردگی ہوتی ہو یا کوئی اور رکاوٹ ہو تو پھر اپنے گھر یا دور مقام پر جا سکتا ہے۔

(۲) غسل کے لئے وہ مسجد سے باہر اسی وقت نکل سکتا ہے۔ جب یہ غسل شرعی ہو یعنی اس کو احتلام وغیرہ ہو گیا ہو تو وہ مسجد سے باہر نکل کر غسل کر سکتا ہے۔ لیکن صرف بدن کی صفائی کے لئے غسل کرنے کے لئے باہر نکلنا ناجائز ہے۔

(۳) جمعہ کی نماز کے لئے اگر جامع مسجد جانا ہو تو اسے سنّت پڑھ کر جانا چاہیئے اور خطبہ اور نماز سے فارغ ہو کر فوراً واپس آجانا چاہیئے اور سنّت اپنی مسجد میں پڑھنی چاہیئے۔

(۴) اگر کوئی کھانا پانی لے جانے والا نہ ہو تو وہ اس کے لئے گھر جا کر کھا سکتا ہے اور کنویں سے پانی نکال سکتا ہے۔

(۵) اگر مسجد کے اندر وضو کے پانی کا انتظام نہیں ہے اور کوئی اس کو پانی دینے والا بھی نہ ملے تو وہ وضو کے پانی کے لئے مسجد سے باہر جا سکتا ہے۔

(۶) جس کام کے لئے بھی مسجد سے باہر جائے اس کو پورا کرنے کے بعد ایک منٹ بھی باہر نہ ٹھہرے اور نہ بلاضرورت کسی سے بات چیت کرے بلکہ فوراً واپس آجائے۔

(۷) وضو کرنے کے لئے حتی الامکان ایسی جگہ بیٹھنا چاہیئے کہ جسم مسجد سے باہر نہ ہو اور وضو کا پانی مسجد میں نہ گرے

(۸) بھولے سے بھی اپنے مُعتَکَف کو چھوڑنا مکروہ ہے۔

مسجد سے باہر نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ جتنی جگہ میں عام طور پر نماز پڑھی جاتی ہے اتنا حصہ مسجد میں شامل ہے اور جہاں عام طور پر نماز نہیں پڑھی جاتی ہے بلکہ وہ دوسرے کاموں کے لئے ہے، مثلاً پیشاب خانہ، پاخانہ، غسل خانہ، وضو خانہ، یا وضو کی منڈیر یا جوتہ اتارنے کی جگہ یہ سب مقامات مسجد کے حکم میں نہیں ہیں۔ ان میں بلاضرورت جانا مسجد سے باہر جانا شمار ہو گا اور اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

دوسری قسم۔ دوسری قسم کے جو افعال اعتکاف کی حالت میں حرام یا مکروہ تحریمی ہیں وہ یہ ہیں ۱۔ مباشرت کرنا، خواہ قصداً یا سہواً۔ مسجد کے اندر ہو یا باہر جس صورت میں

بھی ہو اس سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔
۲۔ عورت کا بوسہ لینا، اس سے بغل گیر ہونا، ان افعال سے اعتکاف ٹوٹے گا تو نہیں لیکن ایسا کرنا ناجائز، اور مکروہ تحریمی ہے۔
۳۔ اعتکاف میں دنیاوی کام کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ اگر گھر میں کوئی دوسرا آدمی گھر کی ضروریات کا پورا کرنے والا نہ ہو تو بقدر ضرورت وہ پوری کرسکتا ہے۔
۴۔ عبادت سمجھ کر اعتکاف میں بالکل چپ چاپ بیٹھے رہنا مکروہ تحریمی ہے، یعنی اس کو کچھ نہ کچھ دینی کام کرتے رہنا چاہیئے۔ مثلاً قرآن پڑھے، نفل پڑھے، ذکر و اذکار کرے یا کسی دینی تحریر کے لکھنے میں مشغول رہے۔

لیلتہ القدر رمضان کے آخری دس دنوں میں جو دوسرا ضروری کام کرتا ہے وہ ہے لیلتہ القدر کی تلاش آخری عشرہ میں جو طاق راتیں پڑتی ہیں ان میں ایک بہت ہی متبرک اور باعظمت رات ہوتی ہے اسی کو قرآن اور حدیث میں لیلتہ القدر کہا گیا ہے قرآن میں ایک پوری سورۃ اسی کی فضیلت میں اتری ہے۔ حدیث میں بھی اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔

عربی میں لیلتہ القدر کے معنی قدر اور اندازے کی رات ہے۔ لیلتہ کے معنی رات، اور قدر کے معنی اندازہ لگانے، مقرر کرنے اور عزت و قدر کے ہیں۔ اس رات کو لیلتہ القدر اس لئے کہتے ہیں کہ سال بھر میں جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے اس کا پورا خاکہ اسی رات کو تیار ہو جاتا ہے بندوں کی روزی مقرر ہوتی ہے، زندگی اور موت اور ان کے کاموں کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے اور جو اس رات میں خدا کی عبادت میں مشغول رہتا ہے اس کی خدا کے یہاں بڑی عزت و قدر ہوتی ہے، فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں، قرآن پاک میں ہے کہ یہ رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَآ	بیشک ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا
اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۚ خَیْرٌ مِّنْ	اور تم کو معلوم ہے کہ شب قدر کیا چیز ہے یہ رات
اَلْفِ شَهْرٍ ۚ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ	ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات فرشتے اور
فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ	حضرت جبرئیل خدا کے حکم سے ہر طرح کی بھلی

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ — بات لیکر (زمین پر اترتے ہیں (یہ رات) بالکل سلامتی ہے۔ یہ صبح صادق تک رہتی ہے۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ اسی رات سے قرآن نازل ہونا شروع ہوا (۲) یہ رات ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے

۳۔ اس میں فرشتے خدا کے احکام لے کر نازل ہوتے ہیں (۴) یہ سراسر سلامتی اور خیر و برکت کی رات ہے (۵) یہ صبح صادق کے وقت ختم ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ — اس قدر کی رات کو رمضان کے آخری دس دنوں کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بابرکت رات رمضان کی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ میں سے کسی رات کو پڑتی ہے

حدیث میں ہے کہ اس رات کو حضرت جبریلؑ فرشتوں کی ایک جماعت لے کر زمین پر اترتے ہیں اور اس رات میں جس بندے کو کھڑے یا بیٹھے ہوئے خدا کی یاد میں پاتے ہیں اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ایک بار آپؐ نے رمضان سے دو تین دن پہلے فرمایا کہ رمضان کا مہینہ ہمارے سر پر آگیا، اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو شخص اس رات سے محروم رہا وہ تمام بھلائیوں سے محروم رہا۔

خدا تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس رات کو ضرور تلاش کرے اور اس میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرے۔

لیلۃ القدر کی پہچان

اس کو خدا تعالیٰ نے نہ تو ظاہر کیا ہے اور نہ اس کی پہچان بتائی ہے تاکہ بندے اس کی تلاش و جستجو میں زیادہ سے زیادہ یاد الٰہی میں مشغول رہیں۔ اس کی پہچان بندے کے ذوق وجدان پر ہے۔ اگر خدائے تعالیٰ کسی کو یہ رات میسر کردے اور محسوس کرے کہ یہی لَیْلَۃُ الْقَدْر ہے تو نفل نماز کے علاوہ اس کو یہ دعا کثرت سے پڑھنی چاہیئے۔ حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ — اے اللہ تو سراپا عفو و درگذر کرنے والا ہے

فَاعْفُ عَنِّیْ۔ تو مجھے بھی معاف کر اور بخش دے۔

جو لوگ اعتکاف کرتے ہیں ان کو معلوم ہو یا نہ ہو وہ اس نعمت سے ضرور سرفراز ہو جاتے ہیں خدا اس کی توفیق ہر مومن کو دے۔

روزہ کے سلسلہ کے چند جدید مسائل

چاند کی رویت اوپر چاند کی رویت کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے کہ چاند کی رویت چونکہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی اس لئے علمائے محققین نے اختلاف مطلع کو تسلیم کیا ہے مگر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جہاں کا مطلع ایک ہے، مثلاً ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ وہاں رمضان و عید میں اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ اور علماء ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا ٹیلی فون کی خبر کے مطابق اسے کیوں تسلیم نہیں کر لیتے تاکہ ہر جگہ رمضان اور عید و بقرعید کے منانے میں یکسانیت پیدا ہو بلکہ بعض مرتبہ تو ایک شہر میں بھی دو عیدیں ہو جاتی ہیں جب بھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے تو عام طور پر علما کو مطعون کیا جاتا ہے اور قدامت اور تنگ نظری کا الزام عائد کیا جاتا ہے مگر اس سلسلہ میں چند باتیں ذہن میں رکھی جائیں تو شاید یہ بات بظاہر جتنی وزنی معلوم ہوتی ہے اس کا وزن باقی نہ رہے اور لوگ علماء پر بلا وجہ الزام تراشی نہ کر سکیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چاند کے افق میں موجود ہونے اور پھر قابل اعتماد شہادت کے ذریعہ اس کے ثبوت کے فراہم ہونے میں فرق ہے۔ چاند کسی وقت غروب نہیں ہوتا بلکہ ہر مقام کے مطلع کے اعتبار سے طلوع یا غروب ہوتا ہے جب چاند کے دیکھے جانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مطلع صاف ہے اور بہت سے لوگوں نے چاند دیکھا اور ایک جگہ رمضان کا یا عید کا اعلان ہو گیا اور یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ دوسرے شہر یا صوبہ میں پہنچی کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا ہے تو عام لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس خبر آتے ہی اس پر عمل کر لیا جائے۔ حالانکہ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ریڈیو پر اعلان ہوتا ہے کہ جے پرکاش نرائن کا انتقال ہو گیا، اس خبر کے مطابق پارلیمنٹ میں ان کی تعزیت کی تجویز پاس ہوتی ہے اور پھر چند گھنٹے کے بعد اس کی تردید ہو جاتی ہے، اس لئے محض ریڈیو سے خبر کا آجانا کافی نہیں ہے اگر ریڈیو سے اعلان ہو کہ ہندوستان کے وزیر اعظم کا انتقال ہو گیا تو ہر شخص مان لیگا

مگر کسی عدالت عالیہ کا جج نہیں بلکہ ضلع کا ایک معمولی منصف بھی کسی مقدمہ میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا ٹیلی فون کے ذریعہ کوئی شہادت قبول نہیں کرسکتا آپ اس عدالت کے اس طرز عمل پر تو کوئی اعتراض نہیں کرتے لیکن علماء جب یہی بات کہتے ہیں کہ چاند کی رویت کی حیثیت شہادت کی ہے عام خبر کی نہیں ہے تو آپ علماء پر تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں۔ پھر دوسری بات یہ کہ رمضان عید یا بقرعید کی حیثیت دوسری قوموں کے عام تہواروں کی سی نہیں ہے بلکہ ان کی حیثیت عبادت کی ہے یعنی چاند کے دیکھنے کے بعد ایک عبادت شروع ہوتی ہے اور دوسری ختم ہوتی ہے اور چاند کے اوپر ہمارے نہ جانے کتنے معاملاتی اور معاشرتی شرعی احکام کا دارو مدار ہے اسلئے شریعت کا سادہ حکم یہ ہے کہ

صوموا لرویته وافطروا لرویته — چاند دیکھکر روزہ رکھو اور چاند دیکھکر روزہ توڑ دو

(بخاری و مسلم)

اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مقصود چاند کا موجود ہونا نہیں بلکہ دیکھا جانا ہے اور دیکھے جانے میں یہ بھی خیال رہے کہ عام آنکھوں سے دیکھا جانا مقصود ہے۔ ہوائی جہاز اور دوربین یا موسمیات کے ماہرین کے حساب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے جہاں ان ذرائع سے یکسانیت یا وحدت ملت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔

یہی حکم عام عبادات کا ہے نماز ہی لیجئے، ہمارے ہی ملک میں مغرب اور فجر کی نماز کہیں ایک گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور کہیں ایک گھنٹہ بعد تو اس سے وحدت ملت یا یکسانیت میں کیا فرق آتا ہے اس لئے بلا وجہ یکسانیت پیدا کرنے کیلئے ہمیں اپنی عبادات میں ان شرائط کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جن کا لحاظ ضروری ہے۔ صحابہ کے دور سے ابتک چاند کا یہ اختلاف چلا آرہا ہے مگر کبھی کسی زمانہ نے وحدت ملت کیلئے عیدین وغیرہ میں یکسانیت پیدا کرنیکی کوشش نہیں کی گئی۔ اور نہ اسمیں کوئی اعتراض پیدا ہوا۔

انجکشن اور روزہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اسلئے کہ شریعت میں فم اور فرج ہی کے ذریعہ کسی دوا یا غذا کا دماغ یا معدہ تک پہنچنے کا ذکر ہے اور

انجکشن گوشت یا نس میں لگایا جاتا ہے اس لئے عام طور پر موجودہ دور کے علماء کی یہی رائے ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر قدیم فقہا کی بعض رایوں کی روشنی میں راقم الحروف کو اس سلسلہ میں کچھ ذہنی خلش ہے جسے وہ اہل علم کے سامنے پیش کر رہا ہے مثلاً صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ کی رائے نقل کی ہے ((ولو داوی جائفة او آمة بدواء فوصل الی جوفه اودماغه والذی یصل هو الرطب)) (ج صـ۲۰)

یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دماغ یا پیٹ کے گہرے زخموں میں کوئی دوا ڈال دی جائے اور وہ اس کے دماغ یا معدہ تک پہنچ جائے اور ظاہر ہے کہ کوئی سیال دوا ہی پہنچ سکتی ہے تو یہ مفسد صوم ہے اس کے برخلاف اگر خشک دوا لگائی جائے تو مفسد نہیں ہے، صاحبین اس کو مفطر صوم اس لئے نہیں سمجھتے کہ اس کے معدہ اور دماغ تک پہنچنے کا یقین نہیں ہے ((لعدم التیقن بالوصول لانضمام المنفذ مرة واتساعه اخری صـ۲۰))

اس کے منفذ کبھی بند ہوجاتا ہے اور کبھی کھلا رہتا ہے گویا ائمہ ثلاثہ کے درمیان اختلاف اسمیں نہیں ہے کہ فم وفرج کے علاوہ دوا پہنچنے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں ہوگا بلکہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ سیال دوا کے پہنچنے کا گمان غالب ہے اس لئے مفسد صوم ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ چونکہ پہنچنا یقینی نہیں ہے اس لئے روزہ کو فاسد قرار دینا صحیح نہیں ہے، لیکن اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ فم وفرج کے علاوہ بھی کسی اور ذریعہ سے دوا یا غذا دماغ اور معدہ تک پہنچنے کا گمان غالب ہوجائے تو روزہ فاسد ہوجائے گا، اس وقت صاحبین کی بھی رائے یہی سمجھی جائے گی اس جزیہ کی روشنی میں اب انجکشن کے مسئلہ پر غور کریں تو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ انجکشن کے ذریعہ دوا یا غذا کا دماغ یا معدہ تک پہنچنا ایک مسلمہ امر ہے، پھر اس وقت تو ایسے ایسے انجکشن تیار ہوگئے ہیں کہ آدمی اس کے ذریعہ پوری غذائیت حاصل کرسکتا ہے، راقم الحروف کے خیال میں جو انجکشن مسکولر یعنی گوشت میں لگتا ہے اس سے تو روزہ فاسد نہیں ہونا چاہیئے مگر جو انٹروینس یعنی نسوں میں لگتا ہے وہ تو براہ راست دماغ اور معدہ تک پہنچتا ہے شریعت کے بیشمار مسائل کا مدار گمان غالب پر ہے اس لئے یہاں گمان غالب سے بھی آگے ایک تجربہ اور مشاہدہ موجود ہے اسلئے علماء کو اس مسئلہ پر نظر ثانی ضرور کرنی چاہیئے۔ اسلئے کہ اگر ناک، کان اور

سرین کے ذریعہ جسطرح دوا یا تیل وغیرہ کا اثر پہنچتا ہے اس سے بھی زیادہ یقین کیساتھ انجکشن سے
ان چیزوں کا دماغ اور معدہ تک نہ صرف اثر پہنچتا ہے بلکہ اس سے اصلاح بدن بھی ہوتی ہے
اسی بنا پر فقہا کان میں تیل ڈالنے کو مفسد صوم قرار دیتے ہیں اور کان میں پانی چلے جانے یا
ڈالنے کو نہیں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں ولو اقطر فی اذنیہ الماء او دخلھما لا یفسد صومہ
لانعدام المعنی والصورۃ بخلاف ما اذا ادخلہ الدھن (ج ۱ ص ۲) پانی اور تیل
میں فرق کیوں ہے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ای صب فی اذنہ دھنا ونحوہ مما فیہ
صلاح البدن یعنی پانی اگر کان میں ڈالا جائے تو بدن کو کوئی تقویت نہیں ہوتی برخلاف تیل کے
اس سے بدن کو تقویت ملتی ہے اگر کوئی شخص سرمہ لگائے اور اسکا اثر حلق تک محسوس ہو
تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس لئے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے اس
پر مولانا عبد الحئی صاحب نے لکھا ہے کہ

مفطر صوم وہ چیز ہے جو بعینہ کسی ظاہری منفذ سے باطنی تک پہنچ جائے۔	والمفطر انما وصول شیئ بعینہ من منفذ الی الباطن (ج ۱ ص ۲۲۸)

ظاہر ہے کہ نسیں پورے جسم اور دماغ و معدہ سب کیلئے بہرحال منفذ ہیں اس لئے وہ چیز
جو انجکشن کے ذریعہ داخل کی جاتی ہے وہ اپنی اصلی حالت میں معدہ اور دماغ تک پوری
سرعت کے ساتھ پہنچتی ہے اور اس وجہ سے اس کا اثر بھی جلد ہوتا ہے۔
ان وجوہ سے راقم الحروف کو انجکشن کے مسئلہ میں خاص طور پر جو انجکشن نسوں میں
لگتے ہیں ان کے بارے میں برابر خلش رہی کہ جب اس سے کمتر موثر چیزوں سے روزہ
فاسد ہوجاتا ہے تو پھر انجکشن سے کیوں نہ ہو واللہ اعلم بالصواب

جہاں دن رات غیر معمولی طویل ہوں اوپر ذکر آچکا ہے کہ شریعت میں روزہ نام ہے طلوع
صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ کی نیت سے کھانا پینا چھوڑ دینے اور عورت سے
مباشرت نہ کرنے کا۔ عام طور پر دنیا میں ۹۔۱۰ گھنٹے سے لیکر ۱۴ گھنٹے کا دن ہوتا ہے
اسی طرح صبح صادق سے غروب آفتاب تک زیادہ سے زیادہ ۱۵ ۱/۲ گھنٹے روزہ کی مقدار ہوتی
ہے مگر اس دنیا میں لیپ لینڈ اور ٹنڈرا جیسی جگہیں بھی ہیں جہاں یہ فرق ۲۲ ۲۳ گھنٹے

اور اس سے بھی زیادہ بلکہ مہینوں کا ہوتا ہے ایسی جگہوں کے لوگوں کو روزہ رکھنے میں
ظاہر ہے کہ ناقابل برداشت تکلیف اٹھانی پڑے گی اس لئے ایسی جگہوں کے لوگوں کے لئے اس
کے علاوہ کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ افطار کریں، فقہاء نے روزہ کے توڑنے کے جو اعذار
لکھے ہیں یعنی بھوک پیاس کی شدت، مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو، مرضعہ کے دودھ
پلانے سے بچہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اگر کوئی ایسا بوڑھا یا مریض ہو جو روزہ نہ رکھ سکتا
ہو تو اس کو روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت ہے ایسی جگہوں کے لوگوں کو بھی روزہ
افطار کرنے اور فدیہ دینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ قرآن پاک میں روزہ کا بیان ختم کرتے
کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے ((یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر)) نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر ارشاد فرمایا تھا ان الدین یسر یسروا ولا تعسروا
کتاب وسنت کی روشنی میں فقہائے نے یہ اصول بنایا ہے، ((المشقة تجلب التیسر))
بعض علماء کی تحقیق ہے کہ جہاں کئی کئی دن یا کئی کئی مہینے کے برابر دن رات ہوتی ہے
وہاں پر چوبیس گھنٹے کے بعد دن اور رات کے کچھ اثرات کا ظہور رہتا ہے اگر ایسا ہے تو پھر
ان سے جو قریب جگہیں ہیں ان کے اوقات کے مطابق اندازہ سے نماز وغیرہ ادا کی جاسکتی ہے
البتہ روزہ کا مسئلہ یہاں بھی قابل غور ہے کہ صبح صادق اور غروب آفتاب کے درمیان روزہ
کے اوقات کو تقسیم کرنا آسان نہیں ہے اس لئے ان کے لئے روزہ کے افطار کے علاوہ
کوئی صورت نظر نہیں آئی،

ان کے اوپر قضا کا حکم اس لئے نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ دائمی صورت ہے جیسے
کوئی دائم المریض ہو جائے تو اس کو روزہ افطار کرنے اور فدیہ ادا کرنے کی اجازت ہے اگر
ایسا نہ کیا جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہوگی جس سے قرآن نے منع فرمایا ہے۔ لا یکلف اللہ
نفساً الا وسعها اس سلسلہ میں دوسرے علماء کے ساتھ محترم مفتی عبدالرحیم صاحب مدظلہ گجرات
سے میں گزارش کروں گا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے سے ضرور نوازیں گے۔

محمد بن عبدالوہاب اور ان کی اصلاحی تحریک

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

محمد بن عبدالوہاب کی تحریک خلافت عثمانیہ کے دور میں پہلی اصلاحی تحریک ہے جو مسلمانوں کی انحطاط پذیر حالات سے متاثر ہو کر پیدا ہوئی اور خاص اس مرکز نبوت سے اٹھی جہاں کی سرزمین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا پیغام لوگوں کو دیا تھا۔ یہ تحریک اپنے اثرات کے لحاظ سے مسلمانوں کی جدید تاریخ میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد جتنی بھی اصلاحی تحریکیں ملت اسلامیہ میں وجود میں آئیں وہ کسی نہ کسی پہلو سے وہابی تحریک سے ضرور متاثر تھیں۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کا انحطاط اپنی انتہا کو پہونچ گیا تھا، عثمانی حکومت کو "مرد بیمار" کا فتویٰ مل چکا تھا اور وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی، مسلمانوں کی معاشرتی زندگی بالکل ہی گر چکی تھی اور مذہبی طور پر ہزاروں قسم کی بدعتوں اور گمراہیوں میں وہ مبتلا تھے، حتیٰ کہ خود اس علاقہ میں بدعت و گمراہی عام تھی جہاں سے اسلام کی شمع روشن ہوئی تھی۔
محمد بن عبدالوہاب نے انہی حالات سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ایک تحریک اصلاح شروع کی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے تحریک کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب کی زندگی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

محمد بن عبدالوہاب نجد کے ایک گاؤں "العینیہ" میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے۔ اپنے والد عبدالوہاب سے جو کہ "عینیہ" میں قاضی تھے فقہ حنبلی پڑھی بچپن ہی سے وہ کھیل کود سے الگ رہتے تھے اور خالی اوقات میں حدیث، تفسیر اور فقہ کی کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ مزید تعلیم کے لئے وہ مکہ گئے، حج کیا پھر مدینہ جا کر وہاں کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ اور بھی دوسرے شہر جا کر علماء سے فیوض حاصل کیا، بصرہ میں

چار سال بغداد میں پانچ سال اور کردستان میں ایک سال قیام کر کے اصفہان گئے جہاں تصوف کے فلسفہ میں نظر غائر پیدا کی۔ پھر مدینہ آئے اور اپنے والد کے ساتھ ایک مقام حریملہ میں رہنے لگے۔ اس لئے کہ ان کے والد نے اس وقت "عینیہ" مقام سے ترک سکونت اختیار کر لی تھی۔[1]

جب محمد حریملہ پہونچے تو اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی۔ طویل سفر کے تجربات اور علم کے حصول نے فکر و تخیل میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اسلام کے پیغام وحدانیت پر غور کیا اس لئے کہ اسلام کی بنیادی فکر توحید ہی میں مضمر ہے۔ پھر چونکہ وہ امام احمد حنبلؒ کے پیرو تھے اسلئے قرآن و سنت پر بہت سختی سے عامل تھے اور بدعت کے سخت ترین مخالف۔ انہوں نے جب اپنے معاشرہ پر نظر ڈالی تو نجد و حجاز کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کے علاوہ ہر صحابی کی قبر کو لوگوں نے سجدہ گاہ بنا رکھا تھا۔ ایک مقام جبیلہ ہے جہاں حضرت زید بن خطاب کی قبر تھی۔ وہاں حصول دعا کے لئے ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ منفوحہ شہر میں ایک نر کھجور کا درخت تھا۔ وہاں بڑا اژدحام رہتا تھا۔ اس کے متعلق یہ عام اعتقاد تھا کہ جو عورت وہاں جا کر درخت سے کہے کہ مجھے ایک سال کے اندر جیون ساتھی مل جائے تو اس کی شادی ضرور ہو جاتی تھی۔ اسیطرح درعیہ میں ایک غار تھا۔ جہاں بڑا ہجوم ہوتا اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہاں حضرت علیؓ کی ایک صاحبزادی نے بعض سرکشوں سے بھاگ کر پناہ لی تھی۔[2]

شیخ کی دعوت اسلام کی حقیقی دعوت تھی۔ انہوں نے مشرکانہ عقائد کے خلاف ایک عظیم مہم چلائی۔ ان بدعات و خرافات نے اسلام خالص کی شکل مسخ کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی دعوت کے بنیادی خد و خال مندرجہ ذیل اصولوں پر رکھے، جو قرآن و حدیث سے مستنبط تھے۔

۱۔ شیخ نے اعلان کیا کہ عبادت کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہے، انبیاء و اولیاء کی قبروں سے

---

[1] محاضرات عن الحرکات الاسلامیہ و مراکز الثقافۃ فی الشرق الاسلامی الحدیث ج ۱ ص ۵۶
[2] الشیخ محمد بن عبدالوہاب، مؤلفہ احمد بن حجر بن محمد، ص ۱۸ ۔ ۱۹،

دعا مانگنا، ان کی قسم کھانا، انکے نام کی قربانی کرنا خدا کی وحدانیت کی خلاف ورزی ہے۔ عبادات میں نماز، روزہ، صدقہ، نذر، طواف، استغاثہ اور مدد مانگنا ہے۔ جو شخص غیر اللہ سے یہ امور طلب کرے یا برتے وہ مشرک ہے، اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ	جو خدا کے سوا کسی کو اسکے ساتھ پکاریگا جسکے
لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ	بارے میں کوئی دلیل نہ ہو تو اسکا حساب خدا
عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ	کے پاس ہے۔ اور کافر فلاح نہیں پا سکتے۔

۲۔ توسّل

توسّل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک توسل مرغوب و مطلوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ذریعہ وسیلہ چاہنا یا اپنے عمدہ اعمال کے ذریعہ۔ جیسا کہ بخاری و مسلم میں وارد ہے کہ تین اشخاص پر پتھر کی چٹان گر پڑی اور وہ غار میں بند ہو گئے تو ایک نے زنا سے عفت کے بدلے، دوسرے نے والدین سے حسن سلوک کے ذریعہ اور تیسرے نے مزدور کی اجرت اس کی سے محنت سے کئی گنا زیادہ دینے کے ذریعہ اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ ان اعمال صالحہ کے ذریعہ ان کو اس مصیبت سے نجات دی جائے، چنانچہ خدا نے ان کی یہ مشکل دور فرمادی۔

توسّل کی دوسری قسم ناجائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ میں رسول کی جاہ سے یا کسی ولی کے ذریعہ تجھ سے فلاں چیز مانگتا ہوں۔ بحق انبیاء و اولیاء کچھ مانگنا خلاف شریعت ہے۔ جس کی کوئی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اقوال و اعمال میں وارد نہیں ہوئی۔ قرآن مجید میں جس وسیلہ کا ذکر ہے کہ:۔

یاایہا الدین آمنوا اتقوا اللّٰہ	اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اس کی
وابتغوا الیہ الوسیلۃ۔	طرف وسیلہ چاہو۔

مفسّرین کا نظریہ اس کے بارے میں یہی ہے کہ اعمال صالحہ سے وسیلہ چاہنا مراد ہے۔

۳۔ کسی جگہ کی زیارت کے لئے مذہبی اعتقاد کے ساتھ سفر نہ کیا جائے۔ سوائے مسجد نبوی مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس، مسجد حرام یعنی کعبہ کے۔ یہ بات صحیح احادیث میں وارد

ہوئی ہے۔ حالانکہ خود مسلمان خدا جانے کتنی قبروں اور درگاہوں کے لئے سفر کرتے ہیں۔

۴۔ قبور پر عمارتیں بنانا، کپڑا چڑھانا اور چراغ جلانا حرام ہے۔ ان سے دعائیں مانگنا اور ان کا طواف کرنا سب ناجائز ہے۔

۵۔ توحید اسماء و صفات۔

۶۔ تمام بدعات کا انکار۔[۱]

شیخ کو عربوں میں بے شمار باتیں ایسی نظر آئیں جو قرآن و سنت کیخلاف تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں قبر پرستی پائی اور توحید کے خلاف ایک مکمل نظام بدعت ان کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ نہ صرف قبور بلکہ درخت و نباتات تک سے مسلمانوں کو عقیدت تھی۔ شیخؒ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں نے خدا کی جگہ اولیاء و صالحین کو دے دی ہے اور انہی سے دعائیں مانگتے ہیں، اولاد چاہتے ہیں اور انہیں کو مصائب میں پکارتے ہیں۔[۲]

اس قسم کی مبتدعانہ اور مشرکانہ حرکتوں سے متاثر ہوکر محمد بن عبدالوہاب نے اس کے خلاف تحریک شروع کی جس کا اصل منبع قرآن و حدیث تھا، اسلام کی ابتدا میں جو توحید کا عالم تھا اس تحریک کے لوگ اس کی اتباع کو اپنا ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر شروع میں لوگ ان کو "الموحدین" یعنی توحید والے کہتے تھے۔ مگر بعد میں محمد بن عبدالوہاب کے دشمنوں نے اس تحریک سے ضد کی وجہ سے اس کا نام وہابیت رکھا۔ اس تحریک نے بدعت، زیارت قبر اور اس پر نذر، اولیاء سے شفاعت اور صوفیوں کے حلقوں میں طرح طرح کے عیوب کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کیا۔

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کوئی نئی نہیں تھی۔ ان سے پانچ صدی قبل تقی الدین ابن تیمیہ نے ساتویں صدی ہجری میں اسی قسم کی تحریک بدعات و خرافات کے خلاف چلائی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری میں انہیں کے شاگرد ابن قیم نے بھی انہیں کی اتباع کی،

---

[۱] الشیخ محمد بن عبدالوہاب۔ احمد بن حجر بن محمد۔

[۲] روضۃ الافکار، تالیف ابن غنام۔ ص ۳
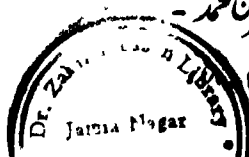
مذکورہ دونوں اصحاب محمد بن عبدالوہاب کی طرح حنبلی مسلک کے پیرو تھے اس وقت مصر و
شام میں ان دونوں بزرگوں نے شرک و بدعت کے خلاف کافی کام کیا تھا۔ اسی طرح
ابن تیمیہ اور ابن عبدالوہاب کی تحریکوں کا مرجع ایک ہی تھا یعنی مذہب امام احمد بن حنبل
محمد بن عبدالوہاب ابن تیمیہ کی تصانیف سے بہت متاثر تھے اور اپنی کتابوں میں ان
کے اقوال سے استشہاد بھی کرتے تھے۔ برٹش میوزیم میں ابن تیمیہ کی کتابوں کے
بعض ایسے نسخے موجود ہیں جن کو محمد بن عبدالوہاب نے اپنے قلم سے نقل کیا تھا۔ [۱]

بہر حال ابن تیمیہ کی تحریک کو عالم اسلام میں وہ قبول عام حاصل نہ ہوسکا جو کہ محمد بن
عبدالوہاب کی تحریک کو حاصل ہوا۔ ابن تیمیہ کی تحریک ایک علمی تحریک تھی جس کا اثر
اگرچہ اس زمانہ میں پوری طرح ظاہر نہ ہوا مگر صدیوں سے اب تک ہر دور کے اہل علم ان
کی تصانیف سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔

شیخ نے جب دعوتِ توحید عام کی تو اللہ تعالیٰ نے محمد بن سعود کے دل کو اسلام
کی اس دعوت کے لئے کھول دیا۔ جس کی طرف شیخ لوگوں کو بلا رہے تھے۔ شیخ جب درعیہ
امیر ابن سعود کے وطن اپنی دعوت لے کر گئے تو امیر اپنے بھائیوں کی ترغیب سے شیخ کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے نظریۂ توحید پیش کیا، خالص اسلامی دعوت ان کے
دل میں جاگزیں ہو گئی اور امیر نے ان شرائط کے ساتھ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لی:۔

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ کامیابی و کامرانی نصیب فرمائے تو شیخ ان کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جائیں۔
۲۔ شیخ امیر کو اس خراج سے منع نہ کریں جو وہ اہل درعیہ سے پھل کی تیاری کے موقع
پر وصول کرتے تھے۔

شیخ نے فرمایا کہ ہاں میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ البتہ جہاں تک خراج کا تعلق ہے
اللہ آپ کو اتنا مالِ غنیمت عطا فرمائے گا کہ آپ خراج سے مستغنی ہو جائیں گے اس کے بعد
امیر کی بیعت مکمل ہو گئی [۲] اور شیخ نے پوری قوت سے اسلام کی دعوت کو عام کرنا شروع کر دیا۔

---

[۱] الحرکات الاصلاحیۃ ص ۵۹-۶۰

[۲] الشیخ محمد بن عبدالوہاب ص ۲۶

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے محض نظریات پر بھروسہ نہ کیا، بلکہ نظریات کے ساتھ قوت کو بھی انہوں نے مجتمع کیا۔ قوت جنگ کے لئے انہوں نے درعیہ کے امیر محمد بن سعود سے معاہدہ کرلیا اور دونوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے اعلان جہاد کیا۔ جس نے زبان سے ان کی دعوت قبول کرلی تو ٹھیک سمجھا۔ نہ پھر تلوار سے اس کو قبول کرایا۔ لوگ جوق درجوق وہابی تحریک میں داخل ہونے لگے، حتیٰ کہ امیر ابن سعود اور شیخ محمد بن عبدالوہاب دونوں کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد دونوں کے صاحبزادوں نے بھی باہم یہی معاہدہ کرلیا اور کوشش کرتے کرتے وہ دن آیا کہ یہ لوگ مکہ اور مدینہ میں داخل ہوگئے۔ اس موقع پر خلافت عثمانیہ کی سمجھ میں اس تحریک کا خطرہ آیا۔ مگر چونکہ دولت عثمانیہ کمزور تھی۔ اس لئے محمد علی والئ مصر سے امداد چاہی۔ محمد علی نے فوج بھیجکر وہابیوں کو پسپا کردیا۔ اس شکست کے بعد حکومت عثمانیہ نے ان کو خلافت کا باغی اور کافر قرار دیا۔ انگریز اپنی تجارت کی وجہ سے ان کے دشمن ہوگئے۔ اس لئے کہ عرب میں اضطراب کی وجہ سے ان کی ہندوستان سے تجارت پر اثر پڑتا تھا۔ جب سعودی مکہ ومدینہ میں داخل ہوئے تو بہت سے قبے اور قبریں انہوں نے منہدم کردیں۔ جس کی وجہ سے عالم اسلام میں کچھ اضطراب پیدا ہوگیا۔

بہرحال ۱۸۰۳ء کی ناکامی ظاہری تھی۔ وہ دوبارہ حرمین شریفین پر قابض ہوگئے اور انہوں نے دنیا کے دوسرے مسلمانوں کو بھی مسلمان تسلیم کیا۔ بعد میں مغربی تہذیب سے بھی متاثر ہوئے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ شیخ کے بھائی شیخ سلیمان محمد ابن عبدالوہاب کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے ایک کتاب "الصواعق الالٰہیہ" تصنیف کی اور بتایا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کو مرتبۂ اجتہاد حاصل نہیں۔ شیخ سلیمان بدعتیوں کو خارج از اسلام نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن ابن عبدالوہاب اس میں غلو کرتے تھے اور ان کے خلاف دعوت جہاد دیتے تھے۔

اس دور میں محمد علی کی تحریک ترقی پر تھی۔ اگر دینی طور پر تحریک وہابیت اور محمد علی کی تحریک ترقی باہم مل کر کام کرتی تو عرب دنیا کو بڑا فائدہ پہونچتا[1]

---

[1] الحرکات الاصلاحیہ ص ۷

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا اصل مرکز توحید تھا۔ وہ توحید جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔ وہ ان تمام تبدیلیوں سے بالاتر ہو کر اسی خالص توحید کو پھر دیکھنے کی دعوت دیتے رہے تھے جو کہ اصل اور اساسِ اسلام ہے۔ شیخ قبر پرستی، اولیاء پرستی اور دوسری بدعتوں پر سخت افسوس کرتے تھے کہ وہ امت جو پوری دنیا کو توحید کا سبق دینے کے لئے بھیجی گئی ہے وہ خود شرک و بدعت کا شکار بن چکی ہے۔ مسلمان دور دور سے سفر کر کے قبروں کی زیارت کرنے جاتے ہیں، نذر و نیاز کرتے ہیں اور خدا کے سوا اس طرح کے ہزاروں خدا انہوں نے بنا رکھے ہیں۔ مسلمانوں کی ہر بستی ایک پوجا گاہ بن گئی ہے۔ گویا کہ خدا اہل دنیا کے بادشاہوں کیطرح ایک بادشاہ ہے جس کے بہت سے درباری ہیں اور ہر درباری و مصاحب اپنے رسوخ سے انسانوں کا کام چلا سکتا ہے اور نفع و نقصان پر قادر ہے۔

شیخ پورے وثوق سے اور خلوص سے سمجھتے تھے کہ امت کی نجات کتاب و سنت پر ان تمام بدعات سے الگ ہو کر عمل کرنے پر منحصر ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ فقہا اور متکلمین کا کلام ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔ حجت تو صرف خدا کی کتاب اور رسول کا فرمان ہے[1]

بدعت بدعت کی برائی کو شیخ عربوں کے سامنے لاتے کہ کس طرح یہ اصل دین کو چھپا دیتی ہے اور اس پر پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے بجائے ایک دوسرا دین سامنے آجاتا ہے جو کہ قرآن و سنت سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ مسلمان کا زوال محض ضعف عقیدہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ شروع اسلام میں مسلمانوں کا عقیدہ درست تھا وہ شرک سے پاک تھے وہ اسلام پر عامل بھی تھے، اس لئے موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ برائی کے خلاف آواز اٹھانے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کی عظمت اس کو حق کی راہ میں استعمال کرنے میں تھی۔ اسی عقیدہ کی بلندی کی وجہ سے وہ بلند ہوئے۔ انہوں نے حکومت کی، اور دنیا کو فتح کیا۔ اب سوائے عقائد کے اور کوئی متاع ہم سے گم نہیں ہوئی۔ امت کی اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ پچھلی زندگی کی طرح روح اور عقیدہ کی طرف پلٹا

---

[1] زعماء الاصلاح، تالیف احمد امین سنہ ۱۹۴۸ء

ہے تو پھر دینی عزت و عظمت کو پھر حاصل ہو جائے گی۔ ان خرافات کو اذہان سے مٹانا
چاہیئے اگر نرمی سے دور نہ ہو سکیں تو پھر طاقت سے ان کو ختم کرنا ضروری ہے۔ [1]
شیخ نے مسلمانوں کی اصلاح مادی کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ ان کی روحانی
اصلاح کو اصل مرکز دعوت قرار دیا۔ اس لئے کہ عقیدہ اور روح اگر درست ہو جائیں تو
پوری زندگی درست ہو جائیگی اس مقصد کے لئے شیخ نے تمام بدعتوں کو گنایا اور
اور صحیح طرز زندگی کو عملاً پیش کیا۔

یہ تھے وہ بنیادی خیالات۔ جن کو لے کر شیخ نے نہ صرف حجاز میں بلکہ پورے
عالم اسلام میں انقلاب پیدا کیا۔ اور ان کی تحریک سے مسلمانوں میں ایک ذہنی
وعملی بیداری پیدا ہوئی۔

اجتہاد | شیخ کی دعوت کا دوسرا جزء ہے۔ وہ اجتہاد کی دعوت عام پیش کرتے ہیں اور
ان کا خیال ہے کہ بغیر اجتہاد کے اسلام میں جمود پیدا ہو گیا ہے۔ ہر شخص کو جو قرآن وسنت
میں بصیرت رکھتا ہے اجتہاد کرنا چاہیئے۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کے زوال کی شرک
و بدعت کے علاوہ دوسری وجہ اجتہاد کے دروازہ کو بند کر دینا ہے۔ اس کی وجہ سے
ان کی دینی صلاحیت کو زنگ لگ گیا ہے اور علماء در اصل نظر محض تقلید آراء میں الجھے
رہتے ہیں جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس جمود کا نتیجہ یہ ہے کہ علماء باہم سخت جنگ
وجدال میں مبتلا ہیں۔ اور قدماء کے خیالات کی مدافعت میں باہم برسرپیکار ہیں جس کی وجہ
سے خود ان کا وقار ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ خود مسائل کو کتاب وسنت کی طرف
رجوع کیا جائے۔ [2]

اثرات | محمد بن عبدالوہاب کی یہ تحریک جو "وہابی" تحریک کے نام سے موسوم ہے اس
نے عالم اسلام پر لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ موسم حج اس دعوت کا خاص موقع تھا
جہاں عالم اسلام سے لاکھوں انسان جمع ہوتے تھے۔ شیخ اور ان کے متبعین اس موقع کا

---

[1] زعماء الاصلاح، ص ۱۴-۱۵

[2] زعماء الاصلاح، ص ۱۲

بھرا فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دعوت عالم اسلام کے کونے کونے تک پہونچ گئی
ہندوستان میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر وہابی تحریک کے اثرات نمایاں ہیں (حیات طیبہ)
سید صاحبؒ نے ۱۸۲۲ء میں حج کیا اور وہاں اس تحریک سے متاثر ہو کر ہندوستان
واپس آئے اور شرک و بدعت نیز غیر اسلامی طاقتوں کے خلاف تحریک جہاد شروع کیا
امام سنوسی حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں وہابی تحریک کو قریب
سے دیکھا اور لوٹ کر اس کے نہج پر اپنے طرز کا ایک مخصوص اصلاح کا کام شروع کیا
یمن میں امام شوکانیؒ نے اسی طرز کی دعوت توحید شروع کی۔ انہوں نے شیخ الاسلام
علامہ ابن تیمیہ کی کتاب منتقی الاخبار کی شرح نیل الاوطار کے نام سے کی۔ انہوں نے بالکل
صاف طور سے قبر پرستوں کو نشانہ بنایا اور شرک و بدعت پر سخت نکتہ چینی کی۔ دوسری
طرف تقلید کی سخت مذمت کی۔ امام شوکانی کا انتقال ۱۲۵۰ھ میں ہوا لیکن محمد بن عبد الوہاب
سوڈان میں شیخ عثمان نے پوری قوت سے شیخ کی دعوت کو عام کیا اور عام جہاد
کیا حضرموت میں سید رشید رضا نے اس دعوت کو مقبول بنایا[1]
مصر میں جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ نے اصلاح کا کام شروع کیا
تو وہ محمد بن عبد الوہاب کے اصولوں سے متاثر ہوئے وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچے کہ اصلاح
کے دو اہم اصول ہیں جن کو اپنائے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

۱۔ اصلاحِ عقیدہ: شرک و بدعت سے عقائد کو پاک کیا جائے۔ زندگی میں توحید
کی روح کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ قبر پرستی۔ مشائخ پرستی اور خرافات کی چیزوں سے
مسلمانوں کی توجہ ہٹا کر توحید خالص کی طرف انہیں متوجہ کیا جائے۔

۲۔ اجتہاد کے دروازہ کو دوبارہ کھولا جائے۔ جس کو اہل جمود نے بند کر رکھا ہے جس
کی وجہ سے امت میں ضعف پیدا ہو گیا ہے[2]

وہابی تحریک نے اہل علم کو جدید دور میں بہت متاثر کیا ہے۔ خود شیخ محمد بن

---

[1] الشیخ محمد بن عبد الوہاب ص ۱۰۰ - ۱۰۲،

[2] زعماء الاصلاح ص ۲۱ - ۲۲ - ۲۳،

عبد الوہاب ایک نہایت ذی علم اور روشن دماغ انسان تھے۔ انہوں نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن سے ان کی علمیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ کتاب التوحید
۲۔ کشف الشبہات
۳۔ ثلاثۃ الاصول
۴۔ مختصر السیرۃ النبویہ
۵۔ مختصر الانصاف و الشرح الکبیر فی الفقہ
۶۔ نصیحۃ المسلمین باحادیث خاتم المرسلین
۷۔ کتاب الکبائر
۸۔ اصول الایمان
۹۔ مختصر زاد المعاد
۱۰۔ مختصر صحیح البخاری
۱۱۔ مسائل الجاہلیۃ
۱۲۔ استنباط من القرآن
۱۳۔ احادیث الفتن،

ان کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سے رسالے تصنیف فرمائے جو عموماً توحید سے متعلق ہیں [1]

چند برس ہوئے محمد بن عبد الوہاب کی تمام تصانیف کے مجموعے "مؤلفات الشیخ محمد بن عبد الوہاب النجدی" کے عنوان سے امام محمد بن سعود یونیورسٹی نے شائع کر دئے ہیں۔ ان میں ایک ضخیم انتخاب احادیث نبوی کا ہے جو اب تک غیر معروف تھا۔

ڈاکٹر طٰحٰہ حسین جو اپنی آزاد خیالی اور بے دینی کے لئے بدنام ہیں انہوں نے وہابی تحریک کے بارے میں نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے اور اس تحریک کی روح اپنے معجزانہ انداز بیان میں پیش کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:۔

جو شخص بھی جزیرۃ العرب کی دینی اور ادبی زندگی کا جائزہ لے گا اس کے لئے اس عظیم تحریک کے مطالعہ کے بغیر چارہ نہیں جو بارھویں صدی ہجری میں اٹھی اور اس نے مشرق و مغرب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا اور ایسے آثار چھوڑے جو جزیرۃ العرب تک محدود نہ رہے بلکہ ان کے اثرات یورپی قوموں پر بھی پڑے۔ یہ وہابی تحریک ہے جس کے بانی

[1] الشیخ محمد بن عبد الوہاب ص ۴۳

محمد بن عبدالوہاب تھے جو نجد کے شیوخ میں سے تھے۔

محمد بن عبدالوہاب ایسے گھرانے میں پروان چڑھے جہاں علم فقہ اور عہدہ قضا وراثتاً چلا آرہا تھا اسی ماحول میں انھوں نے علم و عظمت حاصل کی۔ پہلے اپنے والد سے پڑھا پھر عراق کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے بصرہ کے علما و فقہا سے تعلیم حاصل کی۔ ان مقامات پر بھی انھوں نے اپنے تجدیدی خیالات کا اعلان بھی کر دیا جو دراصل قدیم تھے۔ لوگ ان سے ناراض ہوگئے اور بصرہ سے وہ نکال دیئے گئے۔ وہ شام جانا چاہتے تھے مگر مفلسی کے باعث وہ نہ جاسکے۔ پھر نجد واپس آگئے اور اپنے والد کے ساتھ قیام پذیر ہوگئے۔ اور اسلام کے بارے میں اپنے نظریہ کی اشاعت کرنے لگے۔ اب لوگ دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ ان کا ساتھی بن گیا اور دوسرا گروہ ان کا مخالف ہوگیا چونکہ مخالفین کی تعداد زیادہ تھی اسی بنا پر ان کی زندگی خطرے میں آگئی۔ انہوں نے مختلف رؤسا اور امراء سے پناہ طلب کی۔ انہوں نے درعیہ کے امیر محمد بن سعود کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ خدا کا کرنا کہ ابن سعود نے ان کو پناہ دی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس وقت سے یہ نیا مکتب فکر سرکاری حیثیت اختیار کر گیا جس کی پشت پناہی ایک سیاسی طاقت کر رہی تھی اور نجد کے علاقوں میں اس تحریک کو کبھی نرمی سے اور کبھی تلوار کے زور سے پھیلا رہی تھی۔ اسی دینی اور سیاسی دوستی نے جزیرۃ العرب میں ایک سیاسی تحریک پیدا کر دی جو غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئی۔

مگر یہ نیا مذہب جو درحقیقت قدیم تھا اگرچہ وہ اپنے معاصرین کے لئے نیا تھا مگر اپنی حقیقت کے لحاظ سے قدیم تھا۔ اس لئے کہ وہابی مذہب اسلام کی ایک زبردست دعوت ہے، خالص و پاکیزہ اسلام کی ایسی دعوت جو شرک و بدعت کی آلائش سے پاک ہے یہ وہی دعوت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے۔ جو صرف خدا کے لئے خلوص کا مظہر تھی اور جس نے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سارے واسطے ختم کر دیئے۔ وہابی دعوت دراصل اسلام کی دعوت تھی جس کا مقصد اسلام پر جہالت اور غیر اسلام کے اختلاط کے سبب جو گرد وغبار جم گیا تھا اس سے اس کو پاک کرنا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نے

اہل نجد کے عقائد اور سیرت میں جو جاہلیت کے مظاہر دیکھے ان سب پر انہوں نے نکیر کی۔ اس لئے کہ عوام قبروں کی غیر معمولی تعظیم کرتے تھے۔ بعض مردوں کو اللہ کے نزدیک شفیع قرار دیتے تھے بعض درختوں اور پتھروں کو اہمیت دیتے تھے اور ان کو نفع اور نقصان کا مرجع قرار دیتے تھے۔ دراصل وہ جاہلی دور کی طرف لوٹ آئے تھے اور وہی حرب و ضرب کی زندگی گزارنے لگے تھے۔ نماز و زکوٰۃ کو فراموش کر چکے تھے۔ محمد بن عبدالوہاب نے ان مشرکانہ رسوم رکھنے والے سخت دل لوگوں کو اسلام کی دعوت نئے سرے سے دی قریب قریب اسی طرح جس انداز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے گیارہ سو برس پہلے حجاز میں یہ دعوت عام کی تھی۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعثت محمدیہ کے موقع پر جو حالات حجاز کے تھے وہی حالات اس مذہب کی اشاعت کے زمانے میں نجد کے تھے۔ محمد بن عبدالوہاب نے نرمی سے اپنی دعوت پیش کی۔ بعض لوگوں نے مان لیا۔ پھر دعوت جب معروف ہو گئی تو وہ مخالفین کے نرغے میں آ گئے۔ اس موقع پر انہوں نے امراء اور رؤساء کی مدد تلاش کی، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور قبائل سے استعانت چاہی تھی پھر وہ درعیہ ہجرت کر گئے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی تھی۔ کامیابی کے بعد محمد بن عبدالوہاب نجد کے دنیاوی و سیاسی معاملات ابن سعود کے حوالے کر دیئے اور خود علم و دین کی علمی خدمت میں لگ گئے۔ اکثر تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔

انہوں نے درحقیقت سیاست کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف بلاتے۔ جو لوگ مان لیتے مان لیتے، جو نہ مانتے ان سے جنگ کرتے۔ اہل نجد نے ان کی دعوت قبول کر لی اور خلوص سے اس کی راہ میں جدوجہد کرنے لگے جیسا کہ عربوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تھی اور آپ کے مدینہ ہجرت کی تھی۔ اگر مصر اور ترکی دونوں مل کر اس اسلامی تحریک کی مخالفت نہ کرتے اور اپنی پوری طاقت سے اور اسی اسلحوں سے ان کے خلاف جنگ نہ کرتے جن کا تجربہ نجد کے دیہاتیوں کو نہ تھا تو توقع پیدا ہوتی تھی کہ یہ تحریک سارے عرب کو ایک وحدت اسلام میں پھر سے ۱۲ ویں ۱۳ ویں صدی

پیش جوڑ دیتی، جیساکہ اسلام نے قرن اول میں مسلمانوں میں وحدت پیدا کر دی تھی۔
بہرحال سردست ہم کو اپنی توجہ ان اثرات کی جانب مبذول کرنی ہے جو اس تحریک نے ذہنی اور ادبی زندگی میں عربوں میں پیدا کئے۔ یہ عظیم تحریک اپنے اثرات کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔ اس نے عربوں کو خواب غفلت سے جگایا، ان کے سامنے اسلام کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور اسلام کی راہ میں سیف و قلم جہاد کی دعوت دی، اس تحریک نے تمام مسلمانوں کو عراق، شام اور مصر میں ایک خاص انداز سے جزیرۃ العرب کی جانب متوجہ کر دیا۔
وہابی تحریک کو بدنام کرنے کی جتنی کوشش کی گئی ہے اس میں مستشرقین کو بھی کافی دخل ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے بعض فرقے بھی اس بارے میں مستشرقین سے پیچھے نہیں ڈی۔ ایس مارگولیتھ (D.S. MORGOLOUT) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں لکھتا ہے کہ وہابیوں کے ۵ اصول ہیں۔

۱۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کے جسم، ہاتھ پیر اور چہرہ ہے۔
۲۔ عقل و سبب کو ان کے عقیدہ میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ مذہبی مسائل محض روایت سے طے ہونے چاہئیں۔
۳۔ قانون کا ایک وسیلہ جسکو اجماع (CONSENSUS) کہاجاتا ہے وہ لوگوں نے رد کیا۔
۴۔ وہ طریقہ جسکو تجزیہ (ANALOGY) کہا جاتا ہے، اسکو بھی یہ لوگ نہیں مانتے۔
۵۔ فقہ کی کوئی حیثیت نہیں اس کے ماننے والے کافر ہیں
۶۔ جو لوگ ان کے فرقہ میں شامل نہ ہوں وہ کافر ہیں
۷۔ رسول یا کوئی پیشوا خدا سے سفارش (INTECESSOR) نہیں کرسکتا۔
۸۔ قبروں کی زیارت ممنوع ہے۔
۹۔ خدا کے سوا کسی کی قسم ممنوع ہے۔
۱۰۔ خدا کے سوا کسی کی عقیدت ممنوع ہے۔ مذہبی پیشوا یا خود رسول کی قبر پر کچھ پیش کرنا یا قربانی کرنا حرام ہے۔

یہ مستشرق نمبر ۵ کے بارے میں شبہ کا اظہار کرتا ہے کہ خود وہابی حنبلی ہیں

کیونکہ وہ کو ننا نہیں گے۔ آگے وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونا چاندی اور تمباکو وغیرہ کو استعمال نہیں کرتے داڑھی مونڈتے ہیں، بچوں اور اپنے مسلم مخالفوں کو بے دردی سے قتل کرتے ہیں اور اپنے ہم لوگوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں، یہ طریقہ بالکل خارجیوں کا ہے۔ اسلام پر ان کا جمود اسی انداز کا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ تیسرے خلیفہ عثمان نے قرآن کی شکل بگاڑ دی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اسی خیال کے حامل ہیں جس نے پہلے دور میں خارجی فرقہ کو پیدا کیا تھا ان کا INCONOCLASM اپنے اندر خارجیت سے مشابہت کا حامل ہے۔ یہ لوگ نماز کے پابند ہیں۔ ایک وقت کی غیر حاضری پر ۲۰ کوڑے سزا مقرر ہے ایک شخص کئی دن نہ آیا تو اس کو سزائے موت دے دی گئی۔ مارگولیتھ کہتا ہے کہ یہ لوگ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔

مارگولیتھ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک شہر ایسا بھی ہے جہاں کے لوگ آخرت میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں بہ نسبت اس دنیا کے جس میں وہ رہتے ہیں[1]

اس مستشرق نے مذکورہ خیالات میں سوا چند باتوں کے باقی سب ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ اس کے بیان کردہ دس اصولوں میں ۸ اصول اس کے ذہن کی اختراع ہیں۔ خدا کو مجسم ماننا اس توحید خالص کے ساتھ تضاد ہے جو شیخ امام لے کر اٹھے تھے اسی طرح خارجیت سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں۔

[1] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۱۲ ص ۶۶۰ - ۶۶۱ - ۶۶۲۔ پانچواں ایڈیشن

باب الاستفسار والجواب

ایک سوالنامہ اور اس کا جواب

یہ سوالنامہ بہار کے چند ممتاز علماء اور اہل علم کی طرف سے آیا ہے ان حضرات کے نام سوالنامے کے نیچے درج ہیں

۱۔ کیا ہندوستانی نظام سیاست کے تین بنیادی اساس "انسانی حاکمیت، سیکولرزم اور جمہوریت کو دستور ہند کی روشنی میں جسطرح بروئے عمل لایا جارہا ہے۔ اسے قرآن وسنت کی روشنی میں طاغوت قرار دیا جاسکتا ہے؟

۲۔ کیا اسلامی نظریۂ سیاست کی اساس اللہ کی مالکیت، انسان کی خلافت اور قوانین شریعت کے اصولوں کے پیش نظر ہندوستان کی موجودہ انتخابی سیاست میں مسلمانان ہند کا انفرادی یا اجتماعی طور پر شریک ہونا خلاف دین ہوگا؟

۳۔ مسلمانان ہند چونکہ متحد و متفق نہیں ہیں، ان کا دینی و سیاسی شعور بحیثیت مجموعی بالیدہ ہے اس لئے کیا دینی و ملی مقاصد کے لئے بھی موجودہ انتخابی سیاست میں ان کا حصہ لینا خلاف اسلام ہوگا؟

۴۔ کیا خیر امت کے تصور اور ادخلوا فی السلم کافہ کے نصب العین کے حصول کے لئے انتخابی سیاست کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے؟

۵۔ کیا موجودہ سیاسی ماحول میں فکر اسلامی کی تشکیل و تفہیم، اسلامی اقدار حیات کی ترویج اور سماجی و سیاسی قوت کے حصول کے لئے انتخابی سیاست کو اس طرح استعمال کیا جانا ممکن ہے کہ اس سے فرد کے ارتقاء، معاشرہ کی تعمیر، عدل و قسط کے قیام، آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ فکر، اخوت و مساوات اور مظلوم و محروم طبقات اور گروہوں کے حقوق کی بازیافت کے لئے فضا کو ہموار کیا جاسکے؟

۶۔ کیا دینی و ملی مقاصد اور انسانی صلاح و فلاح کے لئے [illegible] ن بمصلحتاً نظام باطل اور طاغوت سے سمجھوتہ اور تعاون کے مترادف ہوگا؟

۷۔ کیا مسلمانوں کا انتخابی سیاست میں حصہ لینا غیر مسلموں کے شکوک و شبہات میں اضافہ کا سبب بنے گا؟

۸۔ مختلف اوقات میں نظری یا عملی طور پر مسلمانانِ ہند کی انتخابی سیاست کے لئے آپ نے جو رہنمائی یا ہمت افزائی کی ہے اسکی دینی بنیادیں کیا رہی ہیں؟

۱۔ مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب (۲) جناب عبدالغنی عزیزی صاحب

۳۔ جناب حبیب اللہ صاحب (ریٹائرڈ ای۔ اے۔ ایس)

۴۔ جناب سید بخشش حسین صاحب (ریٹائرڈ اے۔ ڈی۔ ایم)

۵۔ جناب ڈاکٹر احمد سجاد صاحب (۶) جناب پروفیسر محمد حسن رضا صاحب

جواب اس سوالنامہ کو پڑھنے کے بعد جو تأثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اور ہمارے ملک میں اس وقت جو سیاسی صورت حال ہے اس کو ایک دائمی حالت تصور کر کے یہ سوالنامہ مرتب کیا گیا ہے، پھر اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے سوالنامہ کے مرتبین مسلمانوں کی زندگی کا محور صرف سیاسی قوت کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس سوالنامہ میں جتنے سوالات کئے گئے ہیں وہ سب اسی ایک بنیادی سوال کی مختلف صورتیں ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی زندگی سیاسی قوت کے بغیر پھل پھول سکتی ہے یا نہیں؟

راقم الحروف کے خیال میں تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری چونکہ مسلمانوں کی سیاسی زوال کی علامت رہی ہے اس لئے اس دور میں جو مفکرین اسلام پیدا ہوئے ان کے سامنے یہ صورت تھی کہ سارا عالم اسلام سیاسی طور پر یورپ کا غلام بنا ہوا تھا، اس بنا پر انہوں نے یہ سوچا کہ اگر یہ موجودہ سیاسی تغلب ختم ہو جائے اور مسلمان سیاسی طور پر آزاد ہو جائیں تو اسلام کی دینی اور اخلاقی قدروں کے فروغ پانے میں جو رکاوٹ ہے وہ دور ہو جائے گی اس تصور کے تحت اس صدی میں مختلف تحریکیں اٹھیں۔ اس کے مطابق لٹریچر تیار ہوا۔ یہاں تک کہ قرآن کی متعدد تفسیریں بھی اس ذہن کے ساتھ لکھی گئیں۔ ہم ان تمام مفکرین کو اس میں معذور سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا چارۂ کار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے کہ ا[illegible] اس سے پہلے کی تاریخ موجود تھی کہ بہت

سی خرابیوں کے باوجود ان کے ذریعہ اسلامی قدروں کو فروغ نہ کے بے شمار مواقع ملے لیکن
ہمیں افسوس کہنا پڑتا ہے کہ یورپ نے اپنے سیاسی تغلب کے ساتھ جو علمی و تہذیبی فتنہ
سامانیاں پیدا کر دی تھیں ان کے اثرات کو وہ پورے طور پر محسوس نہیں کر سکے یا انہوں نے اسے
ثانوی حیثیت دی ہو کہ سیاسی قوت کے ذریعہ اس کے اثرات کو مٹانا آسان ہوگا اس لئے صرف
سیاسی تبدیلی کو انہوں نے اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس سلسلہ میں اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی تو
ہم اسے المجتہد یخطئ ویصیب کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔

اس وقت اگر آپ جائزہ لیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسلامی ملکوں میں سیاسی
آزادی کی جو تحریکیں چلیں انہوں نے نصف صدی کے اندر اس مقصد کو بڑی حد تک حاصل
بھی کر لیا۔ مگر کیا واقعی اسلامی ملکوں کی سیاسی آزادی کے بعد ان ملکوں میں دینی و
اخلاقی قدروں کو فروغ ہوا؟ اور کیا وہاں آزادی کے بعد سیاسی و معاشی نظام میں کتاب
و سنت کی روشنی حاصل کی گئی؟ یہ بات چاہے کتنی ناگوار ہو مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غلامی کے دور
میں وہاں اسلامی و اخلاقی قدریں جتنی زیادہ محفوظ رہیں اور آزادی سے پہلے آج کے
مقابلہ میں اس میں اسلام کے حق میں جتنی زیادہ آزاد فضا موجود تھی وہ آزادی کے بعد موجود نہیں
ہے بلکہ متعدد جگہ اسلامی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے اور اس کی جگہ ملحدانہ خیالات کو بڑھایا
جا رہا ہے اس لئے ان مسائل پر غور کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھ لینی ضروری ہے کہ موجودہ
دور میں چاہے سیاست نے کتنی زیادہ ہمہ گیری اختیار کر لی ہو مگر محض سیاسی تبدیلی نہ تو عام انسانی
زندگی کے لئے کوئی زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے اور نہ اسلامی زندگی کے لئے اس کی کوئی
بڑی افادیت نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کے لئے تو یہ
بات اور زیادہ صحیح ہے۔

خواہ وہ ممالک ہوں جہاں مسلمان دستور سازی میں آزاد ہیں یا وہ ممالک ہوں
جہاں ان کو یہ آزادی مکمل طور پر حاصل نہیں ہے ان کا اصل مسئلہ معاشرہ کی تبدیلی کا ہے
جب تک معاشرہ میں کوئی ذہنی اور عملی تبدیلی نہیں ہوگی سیاسی آزادی کا کوئی فائدہ
نہیں ہو سکتا، یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور میں سیاست کا دائرہ اجتماعی زندگی سے بڑھ کر

[illegible] زندگی تک وسیع ہو گیا ہے اور اس کے نیچے پوری معاشرتی زندگی کو اپنی گرفت میں لے چکے ہیں۔ مگر اس شدید صورت حال کے باوجود انسانیت کی نجات کا راستہ [illegible] کہ سیاسی تبدیلی سے زیادہ افراد و معاشرہ کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ اور ایک صدی کے اندر جو قربانی سیاسی آزادی کے لئے لاکھوں آدمیوں نے دی ہے اگر وہ قربانی معاشرہ میں اخلاقی حس پیدا کرنے کے لئے دی جائے تو یہ ممکن ہے کہ اس کا کچھ اثر ظاہر ہو۔ فیشن پرستی اور ظاہر پرستی جس نے دنیا میں ایک وبا کی شکل اختیار کرلی ہے اسی دنیا میں ہندوستان کے اندر ایک شخص اٹھتا ہے اور اپنے لاکھوں ماننے والوں سے کہتا ہے کہ تم اب کپڑے کا وہ لباس جسے متمدن انسان کئی ہزار برس سے پہنتا آرہا ہے وہ نہ پہنو بلکہ ٹاٹ کا لباس پہنو، تو تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی آواز پر لبیک کہتا ہے اور دفتروں، کچہریوں بازاروں، بسوں، اور ریلوں پر آپ کو اس لباس میں ملبوس بغیر کسی احساس کمتری کے ہزاروں آدمی چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں، اسی کا نام ہے اخلاقی تبدیلی؛

دوسری مثال یہودیوں کی ہے، امریکہ میں جہاں ان کی تعداد ۳۔۴ فی صد سے زیادہ نہیں ہے مگر وہ تمام شعبہائے زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہاں انہوں نے اپنی کوئی سیاسی تنظیم نہیں بنائی ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنی تعلیمی صلاحیت اور اخلاقی و مذہبی پابندی کے ذریعہ سیاست پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے شباب کے زمانے میں گاندھی جی نے چوری چورا میں تشدد کے واقعہ کے بعد اس کا رخ کارکنوں کے اخلاقی سدھار کی طرف پھیر دیا اور جگہ جگہ آشرم قائم کرکے اپنے ڈھنگ سے اخلاقی سدھار کرنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ اثر ہے کہ آج تک ہندوستان کی حکومت میں ایک پائیداری ہے اور اس دور کے ممتاز لیڈروں میں کچھ نہ کچھ اخلاقی بلندی نظر آتی تھی برخلاف پاکستان کی تحریک کے کہ وہ صرف جوش و خروش اور نعروں پر چلی۔ کارکنوں کی کوئی اخلاقی تربیت نہیں کی گئی دنیا کے سیاسی حالات نے پاکستان تو ضرور بنا دیا مگر اسی کی وجہ سے وہاں آج تک کوئی پائیدار عوامی حکومت قائم نہیں ہو سکی اور ان کے لیڈر اپنی خود غرضی کی وجہ سے ملک کے ایک بڑے حصے کو اپنے سے جدا

کرلیا۔ یہی صورت حال سارے اسلامی ملکوں کی ہے کہ بدقسمتی سے جو لوگ وہاں کی سیاست پر قابض ہیں ان کی کوئی اخلاقی و دینی تربیت نہیں ہوئی ہے صرف مغربی سیاسی تربیت ہوئی ہے۔ اس لئے ہر جگہ دین و اخلاق مظلوم ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے بعض ملکوں میں فوج کو نظم استحکام و نظم دینا پڑا، اسی لئے فوج کے اندر بہر حال کچھ اخلاقی پابندی ہوتی ہے۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی تبدیلی یا سیاسی تنظیم اسلامی زندگی کے لئے یا مسلمانوں کے مسائل کے لئے کوئی پائیدار حل نہیں ہے، بلکہ افراد و معاشرہ میں اخلاقی قدروں کا احساس جتنا زیادہ ہوگا سیاسی نظام میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔ ہم نے اب تک علاج بالمثل کا تجربہ کیا ہے یعنی ایک سیاسی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی نظام لانے کی کوشش کی ہے مگر ضرورت علاج بالضد کی ہے۔ انبیاء کا طریقہ یہی رہا ہے۔ انبیاء کرام نے بدترین سے بدترین حالات میں بھی توحید و آخرت کے تصور کے ساتھ اخلاقی تبدیلی کا کام سب سے پہلے کیا مگر اس کے نتیجہ میں کچھ انبیاء کے ذریعہ سیاسی تبدیلی بھی ظہور پذیر ہوئی، ورنہ زیادہ تر انبیاء کرام یہی دعوت دیتے دیتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سب سے پہلے اللہ کی حاکمیت دلوں پر قائم ہونی چاہئے۔ اگر دلوں پر خدا کی حاکمیت قائم نہ ہوگی تو اگر سیاسی سطح سے حاکمیت قائم بھی ہوگی تو وہ باقی نہ رہ سکے گی۔ جیسا کہ آج سارے اسلامی ملکوں میں ہو رہا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے سوالنامہ کا اصل بنیادی سوال یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان سیاسی تبدیلی یا سیاسی جدوجہد اسلامی زندگی کے لئے مفید ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتی ہے تو موجودہ دور میں اس کے کون سے ذرائع مفید ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتے تو پھر اس کا شرعی حکم کیا ہے

ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں یہ سوال ضرور قابل غور ہے کہ ہم کو اپنا سیاسی وزن ڈالنا چاہئے یا نہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں کو اپنا سیاسی وزن ضرور ڈالنا چاہئے، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب تک ہمارا

کوئی اخلاقی وزن نہیں ہوگا اس وقت تک سیاسی وزن بھی دیرپا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ صرف مصلحت پرستی ہوگی۔ اخلاقی وزن سے مراد یہ ہے کہ ہم ذاتی اغراض اور ذاتی مصلحت کے بندے بن کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں ہمیں ملی مفاد زیادہ عزیز ہو۔ ہم میں بلندی، قوت ارادی کی مضبوطی اور اجتماعی فیصلہ کا احترام ہو اور اپنے اصولوں کے لئے نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ ہو، اگر یہ چیز ہوگی تو ہمارا سیاسی وزن بھی محسوس کیا جائے گا اور یہ وزن ہمیں ان تمام ملکوں میں جہاں اس کا موقع موجود ہے ڈالنا چاہیئے، اور ہمیں سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہیئے۔ ایسا کرنا نہ تو طاغوت کے ساتھ تعاون ہوگا اور نہ اللہ کی حاکمیت پر اس سے کوئی ضرب پڑ سکتی ہے۔؟ اس بات کو بعض مفکرین نے بھیانک انداز میں پیش کیا ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، اگر ہم اس سے اتفاق کر لیں تو اسلامی تاریخ کے بہت بڑے حصے سے ہمیں دست بردار ہو جانا پڑے گا یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عام طور پر فقہا دارالاسلام اور دارالحرب کے ساتھ دارالعہد پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ اب جہاں مسلمان سیاسی طور پر آزاد ہیں اور دستور سازی کی پوزیشن میں ہیں وہاں ان کو دارالاسلام کے احکامات پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور جہاں مسلمان مکمل طور پر دستور سازی کی پوزیشن میں نہیں ہیں وہاں ان کو دارالحرب کے بجائے دارالعہد اور دارالامن کے احکام پر عمل کرنا چاہیئے۔ دنیا میں جہاں اس وقت دستوری طور پر سیکولر حکومت قائم ہے وہ ملک کم از کم دستوری طور پر دارالعہد کے زمرہ میں آتا ہے اس لئے یہاں پرامن سیاسی جدوجہد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے پہلے اخلاقی تبدیلی ضروری ہے۔ اگر وہ ایک صدی تک نہ حاصل ہو جب بھی سیاسی آزادی یا سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اخلاقی بلندی اگر پچیس فی صد بھی پیدا ہو سکے تو اس سے کچھ کچھ اچھے نتائج کی ہم امید کر سکتے ہیں۔ دارالحرب کا اطلاق اس وقت اسرائیل جنوبی افریقہ وغیرہ جیسے ممالک پر کرنا زیادہ مناسب ہے، اتنا اشارہ اس لئے کر دیا گیا ہے کہ عموماً سیاسی جدوجہد کے سلسلہ یہ مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم
ملت کا ایک چراغ اور بجھا

ہماری پرانی نسل کے جو دو چار علماء رہ گئے ہیں انہیں ایک مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم بھی تھے افسوس ہے کہ ہماری یہ یادگار نسل آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور ان کی جگہ لینے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں، مفتی صاحب مرحوم نہ صرف ایک بڑے صاحب علم باپ کے بیٹے تھے بلکہ خود بھی ملک میں ان کا مقام اور وقار تھا، پچاس برس سے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی زندگی میں دخیل رہے ہیں اور اس مدت میں مشکل سے کوئی ملی کام ایسا ہوئے ہوا ہو جس میں مفتی صاحب شریک نہ رہے ہوں۔

مفتی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز درس انتاء سے کیا مگر ان کا اصل کارنامہ ندوۃ المصنفین کا قیام ہے ندوۃ المصنفین پہلے دلی کے محلہ پہاڑ گنج میں تھا ۱۹۴۱ء میں راقم الحروف ایک تبلیغی وفد کے ساتھ رمضان کی چھٹیاں دلی میں گذار رہا تھا تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہم لوگوں کو ایک ہفتہ کیلئے اسی محلہ میں بھیج دیا تھا۔ ندوۃ المصنفین کے بالکل قریب ایک پتھر کی نئی بنی ہوئی خوبصورت مسجد تھی اسی میں ہم لوگوں کا قیام تھا، اس درمیان کئی بار مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا، بڑی محبت سے ملتے تھے، میں نے ایک بار عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ حضرات نے ندوۃ المصنفین کا قیام ندوۃ کا قرض اتارنے کے لئے کیا ہے۔ مسکرا کر بولے عزیزم! جب آدمی کوئی ادارہ قائم کرتا ہے یا کوئی نیا کام شروع کرتا ہے تو جس حلقہ کے لوگوں کو متوجہ کرنا ہوتا ہے ان کے لئے اسی طرح کی کوئی بات کہتا یا لکھتا ہے ورنہ قرض ورض کیا کوئی اتارے گا۔ ۱۹۴۷ء میں ندوۃ المصنفین برباد کر دیا گیا اور ایک مدت تک اس کا کام بند رہا پھر مفتی صاحب اسے جامع مسجد کے قریب لے آئے ادارہ سے اب تک درجنوں علمی و دینی کتابیں شائع ہو چکی

ہیں اور اس کا ماہانہ رسالہ بھی اب تک مولانا اکبر آبادی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔
مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ایک مدت تک جمیعۃ علماء کے ممتاز لوگوں میں رہے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے انتقال کے بعد وہ اس کے صدر ہو گئے تھے، وہ طبعاً اعتدال پسند تھے۔ اس لئے جمیعۃ کے نوجوان طبقہ کو ان کی پالیسی سے اختلاف ہو گیا اور وہ کچھ دن ایسے ورکنگ صدر رہے اور پھر جمیعۃ کی اس نئی ٹیم سے ان کا نباہ نہ ہو سکا اور وہ علحدہ ہو گئے۔
۱۹۶۴ء میں جب جبل پور وغیرہ میں بھیانک فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو ملت کے دردمند لوگ بے چین ہو گئے جن میں مفتی صاحب بھی تھے۔ اور پھر ڈاکٹر محمود کے مشورہ سے مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، مجلس مشاورت کے ارکان نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے دورے کئے۔ جس سے مسلمانوں کے اندر ایک نئی زندگی اور اعتماد کی فضا پیدا ہوئی افسوس ہے کہ جمیعۃ العلماء کی نئی قیادت کی وجہ سے اسمیں کچھ رخنہ پڑ گیا اور پھر مجلس مشاورت آہستہ آہستہ خلافت کمیٹی بن کر رہ گئی۔
مفتی صاحب پر تقریباً دو برس پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا، گو وہ کسی قدر سنبھل گئے تھے۔ مگر یہ سنبھالا تھا اور ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور ان کے قائم کردہ ادارہ کو چلانے کی توفیق عطا فرمائے

بمبئی اور اسکے اطراف کے فسادات

آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمانوں کو جانی، مالی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے فرقہ پرست افراد جسکی ایک بڑی حکومت میں دخیل ہے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اسکا سلسلہ ابتک بند ہونے کو نہیں آرہا ہے اور شاید خود حکومت اپنی سیاسی مصلحت کے تحت اسکے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہے بمبئی اور اس کے اطراف کا موجودہ فساد اسکی زندہ مثال ہے بھیونڈی اور بمبئی میں مسلمانوں کی تجارتی ترقی فرقہ پرست افراد کو سالوں سے کھٹک رہی تھی اور انکی ریشہ دوانیاں ایک سال سے مسلسل جاری تھیں اور حکومت کو اسکا پورا علم تھا مگر اسنے اسکی روک تھام کا کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا اسکے نتیجہ میں سیکڑوں آدمی بیدردی کیساتھ مارے گئے اور کروڑوں روپے کا مالی نقصان ہوا اور ہزاروں آدمی خانماں برباد ہو گئے۔ فرقہ پرستوں اور حکومت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان مظلوموں کا خون ناحق رائگاں نہیں جائیگا، اللہ تعالیٰ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی ہے کاش اس خاموش آواز کو انکا کان

الرشاد کی ڈاک

معمر بن راشد کی کتاب "الجامع" اور عبدالرزاق بن ہمام کی کتاب "المصنف" کا باب "کتاب الجامع"

پیرس ۲۸ جمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم ومحترم سلام مسنون۔ خیر و عافیت کے لئے دعا گو

اپریل ۱۹۸۲ء اور جون و جولائی ۱۹۸۲ء کے الرشاد میں آپ نے میرے عریضوں کو عزت اشاعت عطا فرمائی تھی۔ صحیفۂ ہمام بن منبہ پر کچھ کام کے سلسلے میں معمر بن راشد کی کتاب کے متعلق کچھ نئی چیزیں پائیں۔ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

الرشاد کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ میری دانست میں مصنف عبدالرزاق کی جلد ۱۱ کا باب "کتاب الجامع" اصل میں ان کے استاد معمر بن راشد کی کتاب الجامع کی من وعن نقل پر مشتمل ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب کو اس سے اختلاف تھا اور ان کا خط الرشاد میں بھی چھپا اور الفرقان میں بھی میرا جوابی عریضہ الرشاد میں تو چھپا لیکن الفرقان کی کسی مصلحت سے اس کے ناظر اس جواب سے محروم رہے۔ مگر آپ کے یہاں مولانا اعظمی صاحب کا جواب الجواب نہ چھپنے سے گمان ہوتا ہے کہ میرا جواب قابل پذیرائی رہا۔

اب نئی چیز ایک تو یہ عرض کرنی ہے کہ کسی اور کی کتاب کو من وعن اپنی کتاب میں شامل کر دینا اوروں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق کے شاگرد امام احمد بن حنبل کی مسند میں عبدالرزاق کے دادا استاد (معمر کے استاد ہمام بن منبہ) کا صحیفہ بھی من وعن نقل ہوگیا ہے (دیکھو مسند احمد میں مسند ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) وہی صحیفۂ ہمام بعد میں ابن کثیر کی جامع المسانید (مخطوطہ مصر) میں بھی من وعن نقل ہوا ہے۔ فرق ہے تو وہی جو ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے لیکن میں یہاں تفصیل میں نہیں جاؤنگا عرض کرنا صرف یہ ہے کہ عبدالرزاق نے جامع معمر کو نقل کیا تو یہ انوکھی چیز نہیں اس کا کافی رواج رہا ہے۔

دوسرے یہ عرض کرنا ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں معمر کی کتاب کو نقل کرتے ہوئے

عنوان "کتاب الجامع" دیا گیا ہے، "الکتاب الجامع نہیں اور نہ الباب الجامع اگر یہ حصہ مصنف ہی کا ایک جز یا ایک باب ہوتا تو شاید عنوان ترجمۃً "الکتاب الجامع" دیا جاتا یا الباب الجامع،

واللہ اعلم بالصواب

ناچیز
محمد حمید اللہ

گوشۂ ترقی۔ سر سید نگر
علی گڑھ

۸۶ء

۱۶ اپریل ۱۹۸۴ء

گرامی قدر، سلام مسنون،

محبت نامہ موصول ہوا بچوں کی طرف سے اطمینان ہو تو کہیں باہر نکلوں دیکھئے کب عظم گڈھ آنا ہوتا ہے آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ میری ایک کتاب "ذبیح اللہ صفا" ترقی اردو بورڈ دہلی نے شائع کردی ہے میں نے ڈائرکٹر بورڈ کو لکھا ہے کہ یہ کتاب الرشاد میں تبصرہ کے لئے ضرور بھیجی جائے اگر وہ بھیجتے ہیں تو مجھکو مطلع کر دیجیئے گا تاکہ ان کو شکریہ کا خط لکھدوں۔ تبصرہ لکھتے وقت یہ خیال رکھیئے گا کہ تبصرہ بہت مختصر نہ ہو تاکہ بورڈ کی ساری کتابیں تبصرہ کے لئے آنے لگیں پتہ نہیں اقبال انسٹی ٹیوٹ والوں نے "جدید دنیا میں اسلام" کی کاپی آپ کو بھیجی یا نہیں اگر نہ بھیجی ہو تو ان کو نہیں بلکہ مجھکو لکھ دیجیئے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

کبیر احمد جائسی

---

۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء

محترمی و معظمی السلام علیکم

آپ کا گراں قدر مضمون "ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل"۔ روزنامہ سیاست، حیدرآباد مورخہ ۶ اپریل ۸۶ء شائع ہوا ہے اس شمارہ کی ایک کاپی روانہ خدمت ہے۔

امید ہے کہ سیاست کے لئے آئندہ بھی آپ اپنے مضامین مرحمت فرماتے رہیں گے۔ مخلص

عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست"، حیدرآباد

12-5-86

حضرت تسلیم

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۹ مارچ مجھے بروقت مل گیا تھا لیکن اس کے فوراً بعد میں کئی ہفتوں

کے لئے پٹنہ سے باہر رہا ورنہ آپ کے جواب میں اتنی تاخیر نہ ہوتی اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔
آپ کے دیئے ہوئے عنوانات میں "فقہ اسلامی کا دائرہ کار اور اس میں اجتہاد کی حیثیت"
میرے خیال میں سب سے زیادہ مفید رہے گا۔ خصوصاً اس لئے کہ آپ نے اس موضوع کے متعلقات
پر جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس موضوع پر بھی آپ کے خطبات خاصے
کی چیز ہوں گے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا

عابد رضا بیدار

خدابخش پبلک لائبریری پٹنہ

۹۔ مئی ۱۹۸۴ء

جناب مجیب صاحب السلام علیکم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو۔ آپ کا ماہنامہ پرچہ "الرشاد" پابندی کے ساتھ مل رہا ہے
پرچہ کے معیار کے سلسلے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ آج کے پُر خطر دور
میں اس قسم کے دینی اور اصلاحی پرچوں کی سخت ضرورت ہے خدا کرے یہ پرچہ دن دوگنی
رات چوگنی ترقی کرے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم دیں گے اور مجھے اپنی دعاؤں
میں یاد رکھیں گے۔ فقط والسلام

آپ کا امیدوارِ کرم

(کلیم الدین شمس ڈپٹی اسپیکر۔ بنگال اسمبلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مولانا مجیب اللہ صاحب!

سلام مسنون و مزاج گرامی

عنایت نامہ ۲۹ مارچ نظر نواز ہوا۔ آپ کا مضمون روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے
یکشنبہ ایڈیشن ۸ اپریل میں شائع ہوچکا ہے۔ مضمون کے آغاز میں آپ نے راقم الحروف
کا بھی تذکرہ فرمادیا ہے۔ یہ آپ کی مجھ پر شفقت و عنایت کا ثبوت ہے۔ آپ نے حیدرآباد

؎ اخبار کی ایک کاپی ارسال خدمت ہے یہ صرف یکشنبہ ایڈیشن ہے صفحہ ۲ پر آپ کا مضمون چھپا ہے (وحیدالدین)

آنا منظور کرلیا اور ہمارا قوی ارادہ آپ کو حیدر آباد بلانے کا ہے۔ آپ کے دورۂ حیدر آباد کے لئے کون تاریخیں موزوں رہیں گی؟ اس پر آپ غور فرمائیں۔ سفر حیدر آباد کے سلسلہ میں جناب شبنم سبحانی کو بھی لکھیے اور اگر موصوف کا ساتھ ہو جائے تو یہ سفر آپ کے لئے بڑا پُر لطف ہو جائے گا۔ میں انھیں لکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ اب آپ دونوں کی یکساں فرصت کا ہے۔ اس بات پر غور فرمایا جائے کہ سفرِ حیدر آباد قبل از رمضان یا بعد از رمضان، کس وقت بہتر رہے گا؟

حیدر آباد علمی و ادبی محفلوں کے لئے ابھی بھی ایک بلند ذوق و معیار شہر ہے۔ فقہ اسلامی کے مصنف کی حیثیت سے یہاں کے مسلمان نہ صرف متعارف بلکہ آپ کے علم و فضل کے وارفتہ ہوں گے۔ میری رائے میں اس سفر کو تین حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۱۔ مختلف موضوعات (اسلامی قانون اور معاشیات) پر لیکچرس کا اہتمام

۲۔ کتب خانوں اور علمی اداروں کا معائنہ

۳۔ شہر کے تاریخی و تفریحی مقامات کی سیر

کم از کم دس دن آپ کو فارغ کرنے پڑیں گے۔ مزید تفصیلات بعد میں ہو جائیں گی

ہندوستان میں، میں نے پہلی مرتبہ آپ ایسے Dynamic عالم دین کو دیکھا ہے ملاقات کے قبل یہ گمان تھا کہ عام طور پر فقہ کے اساتذہ اور عالموں کی طرح آپ بھی چوب خشک ہوں گے لیکن واقعہ اس کے برعکس نکلا فضیلتِ علم و بزرگی کے ساتھ ساتھ آپ کی پربہار شخصیت پر شاخ گل کا گمان ہوتا ہے۔

مجھ اجنبی مسافر پر آپ کے الطاف بے پایاں کے نقوش مدتوں قائم رہیں گے۔ آپ کی مہمان نوازی حضرت حسین رضؓ کے دسترخوان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر روز کوئی نہ کوئی آپ کا مہمان ہوتا ہوگا۔ آپ کے دسترخوان پر ہر وقت کسی نہ کسی میٹھے کا ہونا اپنے ملنے والوں اور فیض یافتگان میں آپ کی محبت بھری شخصیت کا رس گھولتا رہےگا۔ تمنا ہے کہ دل نوازی و سیر چشمی کی ایسی مثالیں ملت کے طبقۂ علماء میں عام ہوں۔ والسلام

محتاجِ دعا و منتظرِ جواب

وحید الدین

۱۴ اپریل ۱۹۸۲ء حیدرآباد

جامعۃ الرشاد کی اپیل

جامعۃ الرشاد کو قائم ہوئے بہت زیادہ مدت نہیں گذری ہے مگر بحمد اللہ اس قلیل مدت میں اسکے ذریعہ ہندوستان میں علم دین کی ترویج کا جتنا کام ہوا ہے وہ لائق صد شکر ہے۔ اسوقت تک اسکے سات شعبے قائم ہو چکے ہیں اور ہر شعبہ اپنے دائرہ میں کام کر رہا ہے (۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجۂ حفظ و قرأت (۳) مکتب درجہ چھ تک (۴) اسلامی ماحول کیساتھ انگلش میڈیم نرسری اسکول (۵) شعبۂ کتابت و جلد سازی (۶) شعبۂ نشر و اشاعت (۷) الجماعۃ الشرعیۃ

بحمد اللہ جامعۃ الرشاد کی عالمیت و فضیلت کی سند کو ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں نے تسلیم کر لیا ہے، اور عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے بھی اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے، اور متعدد طلبہ کو انمیں داخلہ بھی مل چکا ہے، متعدد طلبہ وہاں سے اختتام تعلیم کے بعد ہندوستان سے باہر اور اندر مختلف علمی و دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ درجہ حفظ و قرأت سے ابتک چار درجن سے زیادہ مجود حافظ فارغ ہو چکے ہیں مکتب اور نرسری اسکول سے اسوقت ۳۔۴ سو بچے فائدہ اٹھا رہے ہیں شعبۂ کتابت اور جلد سازی سے بھی ابتک کئی درجن لڑکے فائدہ اٹھا چکے ہیں، درجۂ حفظ کے لئے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ شعبہ نشر و اشاعت کیطرف سے ابتک کئی مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور تین سال سے ایک علمی و دینی ماہنامہ الرشاد بھی اسکی طرف سے نکل رہا ہے، الجماعۃ الشرعیہ کیطرف سے سیکڑوں فتووں کے علاوہ نکاح و طلاق اور خلع وغیرہ کے معاملات میں اسنے ابتک کئی درجن فیصلے کئے گئے ہیں

اس سال اسکی آمدنی تین لاکھ اٹھاسی ہزار بھی اور خرچ 387000 ~~387000~~ ہوئے ہیں اس سال غریب طلبہ پر تقریباً ایک لاکھ روپئے صرف ہوئے ہیں بحمد اللہ مسجد اور درسگاہ کی عمارت اور ایک ہال تیار ہو گیا ہے اسی ہال میں اسوقت کتبخانہ ہے، دار الاقامہ کے بھی کچھ پختہ کچھ نیم پختہ کمرے تیار ہو گئے ہیں، مگر ابھی مسجد کے صحن کا کام باقی ہے اور دار الاقامہ کے لئے فی الحال آٹھ کمروں کی شدید ضرورت ہے اور مکتب اور نرسری اسکول کیلئے بھی علحدہ مستقل عمارت کی ضرورت ہے، بحمد اللہ ایک انڈر گراؤنڈ ہال ۷۰ فٹ لمبا لڑکوں کے کھانے کیلئے تیار ہو گیا ہو مگر مطبخ کی عمارت کی ضرورت باقی ہے، ان تمام عمارتوں کاموں کی تکمیل کیلئے کم سے کم دس لاکھ روپئے کی ضرورت ہے

درد مندانہ گزارش | ہم آپ سے درد مندانہ گزارش کرتے ہیں کہ آپ اعانت کرتے وقت ادارہ کی اہم ضرورتوں کو ضرور مد نظر رکھیں گے اور یہ بھی گزارش ہے کہ اچھے سفرا کی کمی کی وجہ سے ہمارے سفرا بہت کم جگہوں پر پہنچ پاتے ہیں اسلئے آپ اپنی اعانت براہ راست مدرسہ کو بھیج دیں مدرسہ بہت سے اخراجات سے بھی بچ جائیگا انشاء اللہ آپ دہرے اجر کے مستحق ہوں گے آپ منی آرڈر یا ڈرافٹ بر صرف ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ لکھیں۔

کوائف جامعۃ الرشاد

بحمد اللہ سالانہ امتحانات ۲۳ شعبان کو ختم ہو گئے۔ مکتب کے بچوں کے نتائج سنا دیئے گئے اور عربی درجات کے نتائج طلبہ کے گھر بھیجے جائیں گے۔ عربی درجات میں ۲۴ شعبان سے ۹ شوال تک چھٹی رہے گی اور مکتب ۳ جولائی کو کھل جائے گا۔ حفظ کے درجہ میں عموماً ۲۰ رمضان سے ۹ شوال تک چھٹی رہتی ہے مگر اس سال بعض وجوہ کی بنا پر پہلے ہی چھٹی کر دی گئی۔ نرسری اسکول میں ۴ مئی کو چھٹی ہو گئی اور وہ اب ۵ جولائی کو کھلے گا۔

جامعۃ الرشاد کے قریب مسلم آبادی نہ ہونے کے برابر ہے اسلئے یہاں مسجد اور مدرسہ کی ساری رونق باہری طلبہ اور اساتذہ سے رہتی ہے۔ ان کے چلے جانے کے کچھ دنوں کیلئے یہ رونق ختم ہو جاتی ہے، لیکن دو چار طلبہ جو رہ گئے ہیں ان کی وجہ سے بحمد اللہ نماز با جماعت وغیرہ کے اہتمام میں کوئی فرق نہیں آیا ہے ان شاء اللہ رمضان المبارک میں کچھ چہل پہل اور بڑھ جائیگی اسلئے کہ نماز با جماعت اور تراویح کیلئے قریبی محلہ کے کچھ لوگ بھی آ جایا کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سال دارالاقامہ کے دو نئے کمرے اور بن گئے ہیں، اسلئے آئندہ سال کچھ اور طلبہ کے داخلہ کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ ان شاء اللہ اس سال دو تین کمرے اور بن جائینگے جسکے لئے ایک صاحب خیر نے کچھ رقم عنایت کی ہے۔

جامعۃ الرشاد کے دکھن جانب ایک نالہ ہے جو ندی میں جا کر گرتا ہے برسات کے زمانہ میں ندی میں جب بھی پانی بڑھتا ہے تو اس نالہ کے ذریعہ مدرسہ کے تینوں طرف پانی بھر جاتا ہے اور بسا اوقات مدرسہ کے صحن تک پانی پہنچ جاتا ہے۔ چند سال قبل جناب مسعود صاحب سابق منسٹر پی۔ ڈبلو۔ ڈی کی توجہ سے نالہ اور مدرسہ کے درمیان ایک بند گورنمنٹ کیطرف سے بن گیا تھا، جسکی وجہ سے کچھ عافیت ہو گئی تھی مگر ہر سال کچھ نہ کچھ کٹ جاتا ہے اس لئے آنے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اسکے رس رس کر مدرسہ میں پانی بھی آ جاتا ہے اس کیلئے ہمنے اریگیشن منسٹر صاحب اور کلکٹر صاحب کو درخواست دی کہ نالہ کے کنارے پر دو سو فٹ لمبی دیوار بنا دیجائے اریگیشن منسٹر کی توجہ سے بند ھا ڈپارٹمنٹ نے اس کے لئے کچھ رقم منظور کر لی ہے مگر اسپر کم سے کم ۵ لاکھ روپئے کا خرچ ہے جو تنہا ڈپارٹمنٹ پورا نہیں کر سکتا اسلئے کلکٹر صاحب کے یہاں بھی درخواست دی گئی ہے کہ اسمیں کچھ مدد کریں مگر ابتک انہوں نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا ہے اگر یہ دیوار نہ بنی تو نہ صرف آنے جانے والوں اور رہنے والوں کیلئے پریشانی ہوگی بلکہ مدرسہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے

نئی کتابیں

مسئلہ ایصال ثواب از مولانا جمیل احمد صاحب نذیری صفحات دو سو۲۰۰ کتابت و طباعت عمدہ پتہ مکتبہ صداقت ۔ مبارک پور اعظم گڑھ قیمت عہ۱۲

اس سے پہلے ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی کی کتاب "رد ایصال ثواب" پر الرشاد میں مختصر تبصرہ ہو چکا ہے یہ کتاب اصل میں مولانا جمیل احمد صاحب نذیری کے فتوی کے جواب میں لکھی گئی تھی مگر اب تک ان کا فتوی چھپا نہیں تھا اسلئے بعض لوگ اس مسئلہ میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے مگر اب اس فتوی کو نظر ثانی کے بعد شائع کر دیا گیا ہے جس سے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری روشنی پڑتی ہے اور اس کی شرعی حیثیت واضح ہوتی ہے، اس کے بعض پہلو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر نفس ایصال ثواب کو بدعت کہنا یا اسے غیر شرعی فعل قرار دینا صحیح نہیں ہے،

جہاں تک مالی صدقہ کے ثواب کے پہنچنے اور حج بدل وغیرہ کے کرنے کا تعلق ہے وہ صریح حدیث سے ثابت ہے اسلئے اسمیں تمام ائمہ کا اتفاق بلکہ اجماع ہے البتہ بدنی عبادات کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے مگر مردہ کے لیے دعا و استغفار پر سب کا اتفاق ہے اس لئے قرآن پاک پڑھکر یا نفل نماز پڑھکر دعا و استغفار کرنے میں کیا شرعی قباحت ہے؟

اس موضوع پر عربی میں بھی ایک رسالہ "القرأۃ للاموات ہل یصل ثوابہا الیہم" وزارت اوقاف مصر کی طرف سے چھپ کر آیا ہے اس میں بدنی عبادات کے ذریعہ ثواب پہنچانے کا انکار کیا گیا ہے لیکن دعا و استغفار کا ان کو اقرار ہے۔

بہرحال یہ رسالہ مفید اور مطالعہ کے لائق ہے اور مصنف کی محنت لائق تحسین ہے

ہمارے اسلاف از مولانا عبد العلی فاروقی صفحات ۱۵۲ کتابت . طباعت بہتر، پتہ مکتبہ البدر کاکوری قیمت ؎

مصنف کی اس سے پہلے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس کتاب میں انہوں نے

تیس ممتاز صحابہ کے سوانح حیات سادہ زبان میں جمع کر دیئے ہیں، جس سے متوسط پڑھے لکھے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن صحابہ کرام کا اس میں تذکرہ ہے اگر جنگوں اور غزوات میں ان کی شرکت نے واقعات کے ساتھ ان کی عبادات، اللہ اور رسول سے والہانہ تعلق اور ان کی زندگی کے دوسرے اخلاقی پہلو کو بھی ذرا زیادہ نمایاں کیا جاتا تو اس کی افادیت اور زیادہ بڑھ جاتی بہرحال رسالہ مفید اور مطالعہ کے لائق ہے

کتابچہ اسرائیل از ایس اے ہاشمی صاحب صفحات ۱۱۱ کتابت و طباعت متوسط پتہ سلیم پور ڈاک خانہ محمد آباد۔ ضلع غازی پور قیمت ۵۰

اس کتاب میں سید ابو نظر ہاشمی صاحب نے یہودیوں جو اپنے کو بنو اسرائیل کہتے ہیں کہ قوم کی مختصر طور پر پوری تاریخ بیان کردی ہے اور ساتھ ہی یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں جتنے معاشی یا سیاسی فتنے ہیں جیسے اشتراکیت، ماسونیت وغیرہ یہ سب یہودی ذہن کی پیداوار ہیں اس موضوع پر اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں مگر اس میں بعض گوشہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

جامعۃ الرشاد

جامعۃ الرشاد کا سالانہ خرچ اب چار لاکھ روپے کے قریب ہو گیا ہے اور عام مسلمانوں کی اعانت کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے ہمارے ضلع کے بہت سے مدرسے الہ آباد بورڈ کے امتحانات دلا کر لاکھوں روپے گورنمنٹ سے حاصل کرتے ہیں مگر بحمد اللہ جامعۃ الرشاد بزرگوں کی سنت کے مطابق اس کو صحیح نہیں سمجھتا اس لئے اسے ہمیشہ مالی دقت کا سامنا رہتا ہے۔ ادارہ کے پاس سفرا کی بھی کمی ہے اس لئے آپ براہ راست اس کی مدد فرمائیں، انشاء اللہ آپ دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے۔

خطبۂ نکاح نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ قیمت [illegible]

اہل دل کی باتیں یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اسکا بہت سا حصہ ماہنامہ "الفرقان" میں بھی شائع ہوا ہے، اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد - رشاد نگر شہر اعظم گڈھ - یوپی

Regd No. AZM / N. P. 42 / 84 . Phone:- 461
Regd. No. R. N. 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad
Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرات (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب، جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جسکے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپے کے قریب ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کیساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے، مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۷۳

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

جامعۃ الرشاد

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

دار التالیف و الترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ حافظ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادت کے اہتمام کے ساتھ ہمارا رجحان عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو نفرت اور حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰/

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ ... میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک مجمع میں پڑھوا کر سنوایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ سائز ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۱۰۰، قیمت ۹/

اسلامی تعلیم

حصہ اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۲۶ قیمت حصہ اول عہ/ ، دوم ۸/ ، سوم ۳/ ، چہارم ۳/

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی، اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں اُن صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحات کا ایک تحقیقی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

محمد ... مہدی ... نے ... شاہ ... پرنٹنگ ... سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد سرائے میر اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

جامعہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۲۵/=
خصوصی نمبر ۱۰۰/=
قیمت فی پرچہ 2/50

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/=

جلد نمبر ۸ | اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء مطابق محرم سنہ ۱۴۰۵ھ | شمارہ نمبر ۳۹

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مطبوعہ نشاط پریس ٹانڈہ

کاتب محمد ارشد ٹانڈوی

رشحات

ہم اس سے پہلے ایک بار نہیں بلکہ بار بار اس سنگین صورتحال کا ذکر کر چکے ہیں جس سے ہندوستان کے مسلمان دوچار ہیں۔ ایک طرف ۸۶ فی صد آبادی کو پوری چھوٹ دے دی گئی ہے کہ وہ وشو ہندو پریشد، رام جنم یاترا اور ہندو احیائے پرستی کی تحریکوں کے ذریعہ جتنا چاہیں زہر پھیلائیں اور ملک کی یک جہتی کی فضا کو جتنا چاہیں خراب کریں۔ مگر حکومت کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے، بلکہ حکومت کے بڑے بڑے ذمہ دار مختلف طریقوں سے اس کی ہمت افزائی کر رہے ہیں، یہ ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ حکومت اپنے کو سیکولر کہہ رہی ہے مگر سرکاری عمارتوں، تھانوں اور کچہریوں کے ہر ہر کونے میں مندر بھی تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ پلوں اور کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھنے کے وقت پوجا پاٹ اور خالص ہندوانہ رسموں کے ذریعہ ان کا افتتاح کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے ایک ایک امتیاز کو مٹانے اور ان کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دینے کی پوری کوشش جاری ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ کوشش اکثریت کے افراد کے اندر احیائے پرستی کی ذہنیت پیدا کر کے بھی کی جا رہی ہے اور حکومت کی پالیسی کے ذریعہ بھی اس کو پوری تقویت دی جا رہی ہے۔ ۲۷ برس سے مسلمانوں کی زبان و تہذیب کے مٹانے اور ان کی جان و مال کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کی جو کوشش شروع ہوئی ہے اس کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اسے ایک ہیجانی صورت کہا جا سکتا تھا مگر اس کے بعد سے منظم اور منصوبہ بند طریقہ پر جو کچھ ہو رہا ہے، خاص طور پر بڑی صنعتی یا تجارتی جگہوں پر جہاں مسلمان کسی حد تک خوشحال ہیں ان سب کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ صرف ایک سال کے اندر بھیونڈی حیدرآباد اور مئو میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اس کا اندازہ راقم الحروف کے نام جناب وحید الدین سلیم صاحب کے حیدرآباد سے آئے ہوئے خط سے لگایا جا سکتا ہے جس کا کچھ حصہ نیچے ہے اور پورا خط الرشاد کی ڈاک میں نقل کیا جاتا ہے۔

"محترم! آپ اپنی دعاؤں میں شہر حیدرآباد کو بھی شامل فرمالیں کیونکہ یہاں ۹ ستمبر سے شروع ہونے والے فساد میں جس عظیم پیمانہ پر جانی و مالی نقصان

ہوا ہے اس کی مثال فسادات کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں کے سب سے
بڑے بازار عابد روڈ پر مسلمانوں کی دوکانات کو چن چن کر جلا کر خاک بنا دیا گیا
ان میں سے بعض دوکانیں ایک ایک کروڑ روپئے کی تھیں ،،

ہمارے ضلع میں قصبہ مئو میں جو ایک صنعتی اور تجارتی جگہ ہے، جہاں مسلمان قدرے معاشی اعتبار سے بہتر حالت میں تھے اس پر ایک مدت سے اکثریت اور حکومت کی نگاہ لگی ہوئی تھی، یہاں ہماری سرکاری پولیس، پی اے سی اور مقامی پولیس نے تلاشی کی ایک نئی ٹکنک جس کی ابتدا پنجاب سے ہوئی تھی مسلمانوں کو برباد کرنے کے لئے استعمال کی ہے۔ یہاں گھر گھر تلاشی کے بہانے لوگوں کی جان و مال کو جسطرح برباد کیا گیا اور کیا جا رہا ہے، اور ان کی عزت و آبرو پر پولیس اور پی اے سی کے درندوں نے جس طرح حملے کئے ہیں اس کی مثال اس سے پہلے کم ہی ملتی ہے ایک انصاف پسند پولیس افسر جسے اکثریت کے لوگ برداشت نہ کر سکے اور ان کو پولیس کی سازش سے کسی دیوانہ نے قتل کر دیا تو اس کا انتقام مسلمانوں سے لیا جا رہا ہے، حالانکہ اس افسر کو سلمان انتہائی پسند کرتے تھے کیونکہ وہ انصاف سے کام لے رہے تھے اور یہ چیز اکثریت کے افراد کو پسند نہیں تھی، آج وہاں سارے سلمان سیاسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے ہیں، مگر کھانڈی دال اور منو جیسے فسادی لوگ جو فساد کے بانی مبانی ہیں آزادی سے گھوم رہے ہیں بلکہ وہ آئی کانگریس کے لوگوں کی پناہ میں ہیں۔ اب تک مئو کے تین سو سے زیادہ مسلمان نہ صرف گرفتار کئے گئے ہیں بلکہ ان کو مار پیٹ کر بدحال کر دیا گیا ہے۔ درجنوں آدمی لاپتہ ہیں اور نہ جانے کتنے آدمی پولیس کے ہاتھوں قتل کئے جا چکے ہیں۔ کئی لاشیں شہر اعظم گڈھ کے مسلمان اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکے ہیں۔ مگر اس تباہی کے بارے میں ہمارے لائق اور وفادار چیف منسٹر صاحب سے جب انکوائری کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ صرف چار آدمی مرے ہیں اس لئے انکوائری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گویا پورے قصبہ میں تلاشی کے نام سے جو پولیس، پی اے سی وغیرہ نے تباہی مچائی ہے اور سیکڑوں آدمیوں کو مار پیٹ کر بے کار کر دیا گیا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں بس ہم ان لوگوں کے حق میں یہی دعا کر سکتے ہیں۔ اللھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذ بک من شرورھم

حکومت اور اکثریت مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے اسکی تھوڑی سی تفصیل ہم نے اوپر کردی ہے۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ اس صورتحال سے نجات پانے کا راستہ کیا ہے۔ ایک راستہ تو وہ ہے جسے دلی کے ایک خود ساختہ اسلامی مرکز کے سربراہ صاحب موت و آخرت کا نام لیکر پیش کر رہے ہیں، یعنی یہ کہ مسلمانوں کو بس ہر کشمکش سے کنارہ کش ہوجانا چاہیئے۔ خاص طور پر کسی اقتدار سے ٹکراؤ کو شجر ممنوعہ سمجھنا چاہیئے۔ اور جمال الدین افغانی سے لیکر موجودہ دور کے رہنماؤں سے سب سے بڑی غلطی یہی ہوئی کہ وہ اقتدار سے ٹکرا گئے جس سے اسلام کو سخت دھکا پہونچا اسی لئے وہ فسادات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان خود رو رہنماؤں سے محفوظ رکھے۔ جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو ہر طرح کی کشمکش بلکہ مقدمہ بازی کو بھی جائز سمجھتے ہیں مگر ملی مفاد کیلئے شیطان اخرس بنجانا پسند کرتے ہیں۔ دوسری رائے جمعیۃ العلماء کے موجودہ راہنما حضرات علاً پیش کر رہے ہیں کہ بزرگوں کی یادگار کانگریس کا ساتھ کسیطرح نہ چھوڑا جائے، خواہ آزادی کے دور کی نیشنل کانگریس اب آئی کانگریس کیوں نہ بن کر رہ گئی ہو، خواہ اسکے لئے اگر پوری ملت کے مفاد و اتحاد کو داؤ پر لگانے کی نوبت آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اسلئے کہ ۳۷ برس سے ہندوستان کے مسلمان اسکی وجہ سے زندہ ہیں ابھی وقف ایکٹ کے مسئلہ پر پوری ملت نے اس ایکٹ کی مخالفت میں آواز اٹھائی مگر جمعیۃ العلماء کے صدر اور سکریٹری نے پارلیمنٹ میں جو رویہ اختیار کیا اور تقریر کی وہ ہم "بلٹز" سے یہاں نقل کر رہے ہیں:۔

"سید شہاب الدین نے تو وقف ترمیمی بل کو مسز گاندھی کا الکشن اسٹینٹ کہتے ہوئے اسکو ایک ایسے خول سے تعبیر کیا ہے جسمیں کوئی مغز نہیں ہے انکے علاوہ بھی کانگریس آئی کے مسلم ممبران پارلیمنٹ کو چھوڑ کر تمام غیر کانگریسی مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ نے ۶۷ دفعات میں اس ترمیمی بل پر کڑی نکتہ چینی کی اور بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ترمیمی بل کے ذریعہ کمشنر کو جو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں وہ وقف بورڈ پر تباہ کن ضرب ثابت ہونگے اور وقف بورڈ کی خود مختاری متاثر ہوگی،،

ممبرانکو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وزیر قانون نے کمشنر کے اختیارات کو محدود کرنیکے متعلق ترمیمات کو مسترد کر دیا۔ لیکن کانگریس آئی کے ممبرانِ پارلیمنٹ بشمول مولانا اسعد مدنی اور مولانا اسرار الحق نے اس ترمیمی بل کی حمایت کی۔

مولانا اسرار الحق صاحب نے بل کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بل ترقی پسندانہ سمت

میں ایک صحیح قدم ہے۔ اس بل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار ایمانداری سے ان تمام جائیداد وں اور املاک کو انہی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے جن مقاصد کے تحت واقف نے انہیں وقف کیا ہوگا۔ یہ سرکار کا تاریخی کارنامہ بھی ہوگا اور تمام زندوں اور دنیا سے گذر جانے والوں کی ارواح کی طمانیت کا سبب بھی ۔" (ہفتہ وار "بلٹز" بمبئی، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۴ء)

اب اس خارجی اور داخلی سنگین صورتحال میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے جس کے ذریعہ انکو دوسرے بلکہ تیسرے درجہ کا شہری بنا دینیکی کوشش کیجارہی ہے؟ ہندوستان ایک سیکولر جمہوری ملک ہے، جہاں حق و ناحق کے میعار کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہے، بلکہ اسمیں حق و ناحق کا فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہوتا ہے۔ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جسمیں :: افراد کو گن لیتے ہیں تولا نہیں کرتے

ظاہر ہے کہ جو لوگ جمہوریت کا پھل کھانا چاہتے ہیں وہ اقلیت کے مقابلے میں اکثریت کی مرضی کو زیادہ پیش نظر رکھیں گے۔ وہ کسی قیمت پر اقلیت کی خاطر اکثریت کو ناخوش نہیں کر سکتے اسوقت ہندوستان میں ہندوؤں میں جسطرح کی فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا کیجارہی ہے۔ اسکے پیش نظر دونوں کو بیک وقت خوش رکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اسلئے لامحالہ انکا جھکاؤ اکثریت کی طرف ہوگا۔ جیساکہ کشمیر اور پنجاب وغیرہ میں مرکزی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ اس کا کھلا ثبوت ہے یہ سیاسی لوگ اگر اقلیت سے کسی تعلق یا ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں یا کریں گے تو اسمیں سیاسی مصلحت یا دوسرے الفاظ میں منافقت ہوگی یہ بات خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر صورت حال یہی ہے اس لئے موجودہ صورت حال میں ان سے خلوص یا واقعی خیر خواہی کی توقع ممکن نہیں ہے۔ اکثریت کا ایک طبقہ ہے جس سے واقعی خلوص اور خیر خواہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ مگر ان شریف لوگوں کو سیاسی بازی گردوں نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ خاص طور پر سنجے قسم کے لوگوں کے سیاست میں آنے کے بعد سیاست میں جو سطحیت اور بازاریت آگئی ہے وہ اب دن بدن بڑھتی جارہی ہے، اب سفہائے قوم نے سنجیدہ لوگوں کی زبانیں بند کردی ہیں اور جو زبانیں کھول سکتے ہیں وہ اپنی عافیت خاموشی میں سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں سلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے اسکے بارے میں احقر اپنے خیالات انشاءاللہ اگلے مہینے پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔"

نماز اور خشوع

(۲)

(مجیب اللہ ندوی)

خشوع کے منافی اعمال اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسکا تعلق خشوع کی اہمیت اور فضیلت سے تھا، آئندہ سطروں میں خشوع کے مظاہر بیان کئے جاتے ہیں، اور یہ کہ کون کون سے افعال منافی خشوع ہیں کہ انکے کرنے سے نماز کی اس کیفیت میں فرق آجاتا ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہیکہ انھوں نے مرض الموت میں نزع سے کچھ دیر پہلے لوگوں سے کہا کہ مجھے بٹھاؤ، مرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک امانت رکھ گئے تھے۔ اسے میں تملوگوں تک پہونچانا چاہتا ہوں پھر آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

لایلتفت احدکم فی صلاتہ فان کان	نمازی کو چاہیے کہ نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو اگر اسے
لابد بہ فاعلا ففی غیرما افترض اللہ	مجبوراً ایسا کرنا پڑے تو غیر فرض نماز میں کرسکتا ہے
تعالی علیہ ترك العبث ثوباً او شیأً	اور کپڑے یا بدن سے نہ کھیلے اور اس کے علاوہ جتنی چیزیں
من جسدہ وانکانہ منافاتہ للخشوع	خشوع کے منافی ہیں ان سے گریز کرے۔

مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ابتداء سے نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھایا کرتے تھے، اس پر آیت نازل ہوئی۔

الذین ھم فی صلاتھم خاشعون	جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں

اسکے بعد سے آپ اور صحابہ کرام نظریں سجدہ گاہ پر رکھنے لگے، اور سر کا اٹھانا، کمر پہ ہاتھ رکھنا وغیرہ بھی چھوڑدیا۔
مستدرک حاکم اور بیہقی میں ایک دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آیت خشوع کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

الخشوع فی القلب وان تلین کنفك	خشوع کا مقام قلب ہے، اور خشوع کا مظہر یہ
للمرء المسلم ولا تلتفت فی صلاتك	بھی ہے کہ تمہارے ہاتھ سے کسی مسلمان کو
	تکلیف نہ پہنچے، اور نماز میں اِدھر اُدھر نہ دیکھو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا، کسی چیز سے شغل کرنا، اور اپنی توجہ کو دوسری طرف منعطف کرنا یہ سب خشوع کے منافی افعال ہیں اور اسی کے برعکس نگاہ نیچی رکھنا اپنی توجہ اللہ کی

جانب رکھنا، اعضاء پر سکون کی کیفیت طاری کرنا، یہ سب اس کے مظاہر ہیں،

ام رومان فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر نے ایک روز مجھے نماز میں ادھر ادھر مائل ہوتے دیکھا تو اتنے زور سے ایک کو نچادیا، اور ڈانٹا کہ قریب تھا کہ میں اپنی نماز توڑ دیتی، پھر انھوں نے کہا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام احدکم فی الصلاۃ فلیکن اطرافہ لا یتمیل تمیل الیھود فان سکون الاطراف فی الصلاۃ من تمام الصلاۃ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم سے کوئی نماز کیلئے کھڑا ہو تو چاہیئے کہ اپنے اعضاء کو پرسکون رکھے یہود کی طرح نماز میں ادھر اُدھر مائل نہ ہو، اس لئے کہ سکون اعضاء مکملات نماز میں سے ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ایک روز فرمایا

انی احب لك ما احب لنفسی لا تفرقع اصابعك وانت تصلی

میں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، وہ تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں، نماز میں اپنی انگلیاں نہ چٹخایا کرو

صاحب البدائع والصنائع اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں،

لان فیہ ترك الخشوع

اس لئے کہ یہ فعل خشوع کے منافی ہے

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ خشوع کا تعلق تو قلب سے ہے مگر چونکہ اعضاء وجوارح سے اس قلبی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے اعضاء وجوارح سے بھی کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہونا چاہیئے کہ جو اس قلبی کیفیت کے خلاف ہو، بلکہ نماز میں سارے اعضاء پر وہی کیفیت طاری ہونی چاہیئے جو ایک غلام پر اپنے آقا کے حضور میں عرض حاجت کے وقت ہوتی ہے، ذہن حاضر، نظریں نیچی، اعضاء پر سکون وسکوت، غرضیکہ سارے بدن سے ذلت ومسکنت، عاجزی وخاکساری کے آثار نمایاں ہونے چاہئیں، عرض حاجت کے وقت تضرع وزاری، الحاح والتجا کا پیکر بن جائے، روتے، گڑگڑاتے، اگر کسی شخص پر یہ کیفیت نہ بھی طاری ہو، تو وہ بہ تکلف اس کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

علماء وصوفیہ کے نزدیک خشوع کی تعبیر

اوپر قرآن وحدیث اور آثار صحابہ سے خشوع کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ آیندہ یہ دیکھنا ہے، کہ علماء وصوفیہ

خشوع کا تعلق پوری زندگی سے

صحابہؓ کے نزدیک خشوع کا مفہوم کیا ہے، خشوع کا تعلق صرف نماز ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر لمحۂ حیات سے ہے۔ تسلیم و رضا انابت و خشیت، عاجزی و انکساری، تواضع و تذلل، کی جو کیفیت نماز کے وقت ہوتی ہے۔ وہی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہونی چاہئیے، اور اس کا ثبوت اسوۂ نبوی اور آثار صحابہ سے بھی مل سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک صحابیہ بیان فرماتی ہیں۔

رأیتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المتخشع فی الجلسۃ ارعدت من الفرق — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجزانہ گوٹ مارے بیٹھے دیکھا تو رعب سے کانپ اٹھی،

اس سے معلوم ہوا کہ خشوع صرف نماز ہی میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے ہر ہر لمحہ سے ہے۔ صحابۂ کرام کے متعلق بھی احادیث و آثار میں کان خاشعًا علیہ اثر الخشوع وغیرہ کا جو لفظ آیا ہے، اس سے بھی خشوع کا یہی عام مفہوم مراد ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ صحابی بیان کرتے ہیں، کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلام کو دیکھا کہ وہ مجلس میں بہت ہی تواضع و انکسار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، ابو ہریرہ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ جالسًا فی حلقہ متخشعًا علیہ سیما الخیر[1]

حضرت علی ھم فی صلاتھم خاشعون[2] کی تفسیر میں فرماتے ہیں

ھو الخشوع فی القلب وان تلین کنفك للمرء المسلم وان لا تلتفت فی الصلاۃ — خشوع یہ ہے کہ قلب میں خوف و خشیت اور مسلمانوں سے نرم خوئی رکھو (اور اس کا ایک گوشہ یہ ہے کہ) نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھو،

تمام محققین صوفیائے کرام نے جو اس صفت کے عملی نمونہ ہیں، خشوع کی اس عمومی حیثیت پر بہت زور دیا ہے، اور اس کی روح کو سمجھ کر اس کی ایسی تعبیر کی ہے، کہ اس کے اندر زندگی کا ہر کام خواہ حقوق اللہ سے متعلق ہو خواہ حقوق العباد سے آجاتا ہے، لیکن چونکہ اس کا اصلی محور نماز ہی ہے اور اس کی پوری مشق دربار الٰہی کی حاضری کے بعد ہی ہوتی ہے، اس لئے اس کی تشریح بھی اسی کے

[1] اصابہ ذکر عبداللہ بن سلام۔ [2] وہ اپنی نمازوں میں خشوع رکھتے ہیں،

ضمن میں ہوتی ہے،

اس لئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اگر کوئی شخص خشوع کی اس عام تشریح سے دھوکا کھاکر بغیر نماز ادا کئے ہوئے اس کے پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے، تو وہ اس صفت سے متصف نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ضروری ہے، کہ پہلے نمازوں میں یہ کیفیت پیدا کی جائے، اس کے بعد آگے قدم بڑھایا جائے، ورنہ اس کی مثال اس شخص کی ہوگی، جو بغیر کسی زینہ اور سہارے کے مکان کی اوپری منزل پر جانے کی کوشش کرتا ہے،

اب علماء، وصوفیہ اور ائمہ کے اقوال اور ان کی عملی زندگی سے اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

امام احمد بن حنبل اپنے رسالہ الصلوٰۃ مایلزم فیہا میں تحریر فرماتے ہیں

ویستحب للرجل اذا اقبل الی المسجد ان یقبل بخوف و وجل وخشوع وخضوع

جب کوئی شخص مسجد میں آنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ خوف وخشیت، تواضع وانکسار کیساتھ آئے،

پھر اسی رسالہ میں دوسری جگہ اس کی اور تصریح فرماتے ہیں۔

ان العبد اذا خرج من منزلہ یرید المسجد انما یاتی الجبار الواحد القہار العزیز وان کان لا یغیب عن اللہ حیث کان ولا یعزب عنہ تبارک وتعالی مثقال حبۃ من خردل واصغر من ذالک ولا اکبر فی الارضین السبع ولا فی السموٰت السبع ... وانما یاتی بیتا من بیوت اللہ یجب ان ترفع ویذکر فیہا اسمہ .... فاذا خرج من منزلہ فلیحدث نفسہ تفکرا وادبا غیر ما کان فیہ قبل ذالک .... ویخرج بوقار فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بذالک ... فانہ کان من

جب کوئی بندہ اپنے گھر سے مسجد آنے لگے تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدائے وحدہ لاشریک لہ کے سامنے آرہا ہے اور یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ جہاں بھی ہوگا خدا سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا اور نہ آسمان وزمین کا کوئی ذرہ یا اس سے بڑی یا چھوٹی چیز اس کی قدرت وعلم سے باہر ہوسکتی ہے.... (اور اسے یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ) وہ اللہ کے گھروں میں سے ایک گھر میں آرہا ہے، جسمیں ضروری ہے کہ اسی کا ذکر اور اسی کا چرچا کیا جائے..... جب وہ ایسے پرعظمت مقام پر جارہا ہے تو اسے اپنے مکان سے نکلتے ہی اپنے دل ودماغ کو دنیاوی تفکرات سے جسمیں وہ اس سے پہلے پڑا تھا ہٹالینا چاہیئے، (اور اپنے تمام ارادوں اور اپنی توجہات کو اسی ذات قدوس کی طرف

تواضع لله عزوجل وخشع وخضع و ذل لله عزوجل كان اذكى صلاته واحرى لقبولها

وکمال میں لگانا چاہیئے) اور ارشاد نبوی کے مطابق پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ وہاں پہنچنا چاہیئے اسلئے کہ جو جتنا ہی خشوع و خضوع کیساتھ اس کی دربار میں حاضری دیگا اتنی ہی اسکی نماز بہتر اور قبولیت سے قریب تر ہوگی۔

فاذا قام احدکم فی صلاته فلیعرف الله عزوجل فی قلبه بکثرة نعمه علیه واحسانه الیه وان الله عزوجل قد وقره نعماً وانه اوقر نفسه ذنوباً فلیبالغ فی الخشوع و الخضوع لله عزوجل

اور جب وہ نماز کیلئے کھڑا ہو تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان واکرام سے اسے سرتاپا ڈھانک لیا ہے، اور اسے ہر نعمت سے نوازا ہے، گو اسنے گناہوں سے اپنے نفس کو نہایت کثیف اور بوجھل کر دیا ہے پس ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہی اسے خشوع وخضوع، تواضع وانکسار کا پیکر بنکر اس سے مغفرت طلب کرنا چاہیئے،

وقد جاء فی الحدیث ان الله اوحی الی عیسی بن مریم اذا قمت بین یدی فقم مقام الحقیر الذلیل الذام لنفسه فانها اولی بالذم فاذا دعوتنی فادعنی واعضائك تنقض کذالك جاء فی الحدیث ان الله اوحی الی موسی نحو ذالك۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ جب تم میرے سامنے عبادت کے لئے کھڑے ہو تو اپنے نفس کو پورے طور پر حقیر و ذلیل سمجھو، اور جب مجھ سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤ تو اس وقت سارے اعضا تواضع کیوجہ سے گویا بے حس وحرکت ہو جائیں اسیطرح موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ایک حدیث میں آیا ہے،

ابو اسمٰعیل ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) نے منازل السائرین میں اور حافظ ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) نے اس کی شرح مدارج السالکین میں "خشوع" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں،

حافظ ابن قیم منازل السائرین کی ایک عبارت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

قلب میں حس کی عظمت و ہیبت ہوتی ہے، اس کے سامنے طبیعت کی ہر خواہش ختم اور نفس کا ہر انبساط اسی میں فنا ہو جاتا ہے، بس خشوع اسی کا نام ہے، کہ بندہ کی ہر خواہش اللہ کی عظمت اور اس کی مرضی کے تابع ہو جائے،

اس خشوع کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ اپنے کو ہر وقت عاجز و مسکین سمجھے اور حکم الٰہی شرعی ہو خواہ قدری، اس کے سامنے سر نیاز خم کر دے اور وہ یہ بھی محسوس کرتا رہے کہ قلب کی ہر کیفیت اور اعضاء کی ہر حرکت کو اللہ تعالےٰ دیکھ رہا ہے، اس استحضاری کیفیت کو وہ جتنا ہی زیادہ کرے گا، صفت خشوع سے متصف ہوتا جائے گا،

دوسرا درجہ یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے نفس کے عیوب اور اعمال کے نقائص پر نگاہ رکھے، اور اس بات کی پروا نہ کرے، کہ لوگ اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں وہ لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ اور ان کے حقوق ادا کرتا رہے، یہی کیفیت اسے درجۂ فنا تک لیجانے کا سبب بن جائے گی۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب بندہ کو مکاشفہ وغیرہ کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے، تو اس کی طبیعت میں بڑا انبساط اور بعض وقت عجب پیدا ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں اسے پورے طور پر نفس کی دیکھ بھال رکھنی چاہیئے، تاکہ اس کا آئینہ دل عجب و ریا کے گرد و غبار سے میلا نہ ہونے پائے، اس لئے کہ ایسے موقع پر ان عیوب کے پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ ہوتا ہے، پھر اس تصور کو بھی ذہن میں جاگزیں رکھے، کہ فضل و کرم بخشش و مغفرت سب اسی ذات قدوس کے دست قدرت میں ہے، وہ بندوں پر بغیر کسی سبب کے بھی فضل و کرم کی بارش کر سکتا ہے، [1]

اوپر خشوع کی جو عمومی تشریح کی گئی ہے، صاحب منازل کی اس عبارت سے اس کی مزید توضیح ہو گی، کہ خشوع کی کیفیت صرف نماز ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ پوری زندگی میں للہیت پیدا کرنے کا ایک معیار ہے،

---

[1] مدارج، ج ۱ ص ۱۹۶

حکیم امت امام غزالی نے احیاء العلوم میں خشوع پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے، اور اس کے شرائط و ارکان، اس کے پیدا کرنے کی صورتیں، اس کے باطنی اثرات اور مظاہر وغیرہ کو علٰحدہ علٰحدہ بہت واضح طور سے بیان کیا ہے ہم مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں، فرماتے ہیں،

اللہ تعالیٰ سے خشوع کی تعبیر تعظیم سے کی جاتی ہے، لیکن جب تک جلال الٰہی کی معرفت کے ساتھ اپنے نفس کی حقارت کی معرفت بھی شامل نہ ہو، اس وقت تک خشوع و تعظیم کی حالت منتظم نہیں ہوتی، [1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں،

اللہ تعالےٰ نے اس آیت قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون [2] میں ایمان کے بعد ایک مخصوص نماز کی وجہ سے مومنین کی مدح کی ہے، اور یہ مخصوص نماز وہ ہے، جو خشوع کے ساتھ پڑھی گئی ہو، پھر ان فلاح یافتہ مومنین کے اوصاف گنانے کے بعد بھی ایک مخصوص نماز کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرمایا والذین ھم علی صلاتھم یحافظون [3]، پھر ان صفات کے نتیجہ میں فرمایا کہ وہی لوگ ہیں، جو جنت الفردوس کے وارث اور مالک ہوں گے، غرضیکہ نماز میں خشوع رکھنے والے مومنین کو پہلے فلاح یافتہ بنایا، اور پھر اس کے نتیجہ میں انہیں جنت الفردوس کے وارث بنانے کا وعدہ فرمایا۔

پھر ایک دوسری جگہ خشوع کی عمومی تشریح کرنے کے بعد صوفیہ اور ائمہ کے اقوال و اعمال سے بھی اس پر استدلال کرتے ہیں، فرماتے ہیں

جاننا چاہیئے کہ خشوع ایمان کا ثمرہ اور جلال الٰہی کے تصور سے جو یقین حاصل ہوتا ہے، اس کا نتیجہ ہے، جو شخص اس کیفیت سے لطف اندوز ہوجاتا ہے وہ نماز میں خواہ نماز سے باہر ہر وقت اس پر خشوع و خضوع کی حالت طاری رہتی ہے

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۱۸

[2] بے شک وہ لوگ فلاح یافتہ ہیں، جو اپنی نماز میں خشوع رکھتے ہیں،

[3] اور وہ لوگ جو نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں،

بلکہ وہ تنہائی اور رفع حاجت کے وقت بھی اس حالت سے علحدہ نہیں ہوتا،
اس لئے کہ خشوع کا اصلی سبب خدا کی عظمت و توقیر کی معرفت اور اپنی ذلت و تقصیر
کا علم ہے، اور اسی علم و معرفت کے تصور سے خشوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،
اور ظاہر بات ہے کہ یہ چیز صرف نماز کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ہر وقت اور ہر
آن اس کا حصول ممکن ہے،

ربیع بن خیثم (مشہور تابعی ہیں) ۶۳ھ یا ۶۱ھ میں وفات پائی،
ان کے بارے میں مذکور ہے کہ غض بصر اور اعضاء کے جھکاؤ کی وجہ سے بعض لوگ
ان کو اندھا سمجھتے تھے، وہ چالیس برس تک ابن مسعود کے مکان پر آتے جاتے
رہے، جب وہ آتے، تو ابن مسعودؓ کی لونڈی ان سے کہتی، کہ آپ کا اندھا دوست
آگیا، ابن مسعودؓ جب ان کی طرف دیکھتے تو آیت کا یہ ٹکڑا پڑھتے وبشر المخبتین
(احکام الٰہی کے سامنے سر نیاز خم کر دینے والے کو خوشخبری دیجئے) اے ربیع
خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیکھتے تو خوش ہوتے، دوسری
روایت میں ہے کہ تم سے محبت کرتے۔

ایک روز وہ ابن مسعود کے ساتھ لہاروں کے محلہ میں گئے جب انھوں نے
بھٹی کو جلتے دیکھا اور آگ کو بھڑکتے دیکھا تو جہنم کا تصور سامنے آگیا لرزہ
براندام ہوگئے، اور غش کھا کر وہیں گر پڑے

عامر بن عبداللہ بھی ان لوگوں میں سے تھے، جو نہایت ہی خشوع وخضوع
اور توجہ الی اللہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، ان پر خشوع کے غلبہ کا یہ حال
تھا، کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو بسا اوقات ان کی لڑکی دف بجایا کرتی
اور عورتیں گھر میں بے تکلفی سے گھریلو باتیں کرتی رہتی تھیں اور انھیں بالکل
خبر تک نہ ہوتی،

ان لوگوں نے کہا کہ کیا آپ کو نماز میں وسوسہ اور پراگندہ خیالی ہوتی ہے
انھوں نے فرمایا مجھ پر نیزوں کی پیہم بارش مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہے

کہ جس طرح تم لوگ نماز کے وقت پراگندہ خیال رہتے ہو میں بھی رہوں، مسلم بن یسار بھی انہی لوگوں میں تھے کہ مسجد کا ایک ستون گر پڑا اور وہ نماز پڑھتے رہے، انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی، بعض صوفیہ کا قول ہے کہ نماز کا تعلق آخرت سے ہے، جب تم اس میں داخل ہو گے، تو دنیا کی باتوں سے علٰحدہ ہو جانا چاہیئے،

پھر چند حکایات نقل کرنے کے بعد امام غزالی آخر میں فرماتے ہیں کہ

اوپر جس کیفیت کیساتھ نماز پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے خاشعین فی الصلوٰۃ کی یہی کیفیت ہوتی ہے یہ تمام حکایات و روایات اور اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں اصل چیز خشوع و حضور قلب ہے، حضور قلب کے بغیر یعنی غفلت قلب کے ساتھ محض اعضاء کی حرکت سے نماز پڑھنے کا آخرت میں بہت کم اجر و ثواب ہے،

شیخ عبدالقادر جیلانی (سنہ ۴۷۰ - سنہ ۵۶۱ھ) نے غنیۃ الطالبین میں ابو حازم تابعی سے ایک روایت نقل کی ہے، جس سے خشوع کی پوری حقیقت سامنے آجاتی ہے،

ابو حازم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے ایک صحابی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے مجھسے اور چیزوں کے علاوہ نماز کے بارے میں بھی بہت سے سوالات کئے، اور میں ان کو جواب دیتا گیا آخر انھوں نے پوچھا کہ

عبادت کے وقت تمہاری کیا نیت ہوتی ہے میں نے کہا عبودیت، انھوں نے کہا کس چیز سے نماز کی ابتدا کرتے ہو، میں نے کہا تکبیر سے، انھوں نے کہا کہ نماز کی دلیل و برہان کیا ہے، میں نے کہا اس کی قرأت، انھوں نے کہا نماز کا اصل جوہر کیا ہے، میں نے کہا تسبیحات جو اسمیں پڑھی جاتی ہیں انھوں نے کہا نماز کو زندہ کرنے والی کون سی چیز ہے، میں نے کہا خشوع و خضوع، پھر انھوں نے پوچھا کہ اس کا وقار کیا ہے، میں نے کہا کہ سکون و طمانیت، تمام سوالات کے بعد ان صحابی نے فرمایا کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز ادا کرتے تھے،"[1] امام ابوالقاسم

[1] غنیۃ ج ۲ ص ۱۰۹ [2] ایضاً ص ۹۵

قشیری (متوفی ۴۶۵ھ) اپنے رسالہ قشیریہ میں لکھتے ہیں

خشوع نام ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا۔ ۔ ۔ ۔ بعض صوفیہ سے خشوع کے متعلق دریافت کیا گیا، تو انھوں نے کہا کہ اللہ تعالےٰ سے دل کے لگے رہنے کو خشوع کہتے ہیں۔ ۔ ۔ سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں، کہ جس کا دل خشوع سے لبریز ہوجائے، اس کے قریب شیطان نہیں آسکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بندہ میں خشوع کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ جب اس پر غصہ کیا جائے، یا اس کی مخالفت کی جائے یا اس کی کسی بات کو رد کیا جائے، تو اس وقت وہ خندہ پیشانی اور حلم و ضبط کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرے۔ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ نگاہ کو ادھر ادھر دیکھنے سے روک دینا ہی خشوع ہے، محمد بن علی الترمذی فرماتے ہیں کہ خاشع وہ شخص ہے جس کی خواہشات کا آتش کدہ ٹھنڈا اور اس کے قلب کا دھواں (بیجا ولولہ) سرد ہوجاتا ہے، اور اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کی تعظیم کا نور چمک جائے، جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے گی، تو اس کی خواہش مردہ اور دل زندہ ہوجائے گا، اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کے اعضاء پر بھی تواضع و خاکساری طاری ہوجائے گی، حسن بصری فرماتے ہیں کہ دل میں پورے طور پر اللہ تعالےٰ کے خوف کے بیٹھ جانے کو خشوع کہتے ہیں[1]

ابن رجب حنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) نے ایک چھوٹا سا رسالہ "الخشوع فی الصلوٰۃ" لکھا ہے اس کی ایک عبارت اوپر آچکی ہے، کچھ یہاں نقل کی جاتی ہے،

وہ خشوع جو قلب میں پیدا ہوتا ہے، اس کا ذریعہ ذات الٰہی کی معرفت اس کی عظمت، اور اس کے جلال و کمال کا عرفان ہے، پس جتنی ہی یہ معرفت حاصل ہو گی، وہ اللہ تعالےٰ سے اتنا ہی خاشع ہوگا۔

لیکن جن لوگوں کو یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان میں سے ہر شخص کا حال یکساں ہو، اس لئے کہ خدا کے جن صفات کے تصور سے قلب میں خشوع و خضوع کی

---

[1] رسالہ قشیریہ

کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صفتیں مختلف ہیں، اب ان میں سے قلب کو جس صفت کا مشاہدہ اور عرفان زیادہ ہوگا، اس کے اوپر اسی صفت کا عکس زیادہ نمایاں ہوگا، چنانچہ اس تمہید کے بعد وہ لکھتے ہیں،

بعض لوگوں میں خشوع اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ قوت مطالعہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندہ سے بالکل قریب ہے، اور اس کے ہر بھید اور راز کی اطلاع رکھتا ہے۔ (اللہ تعالےٰ کی اس صفت کا مطالعہ) اس سے شرم وحیا اور (بندہ کے تمام حرکات وسکنات میں اس کی دیکھ بھال رکھنے (کے تصور پیدا کرانے کا باعث ہوتا ہے اور بعضوں میں خشوع اس کی صفت جمال وکمال کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی محبت میں محویت اور اس کی ملاقات و دیدار کا شوق پیدا ہو،

بعضوں میں خشوع کا باعث اس کے قہر وغضب اور جزا وسزا کا تصور ہوتا ہے، جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس سے خوف و دہشت پیدا ہو۔

اس اختلاف حال ہی کی وجہ سے مختلف علماء وصوفیہ نے خشوع کی مختلف تعبیریں کی ہیں ورنہ مآل ونتیجہ کے اعتبار سے سب کی تعبیرات کا مقصد ایک ہی ہے،

نماز میں خشوع مستحب ہے یا واجب؟ نماز اور نماز کے علاوہ شرعی کام میں کیفیت خشوع کی موجودگی اور اس کی اہمیت وفضیلت پر تمام محدثین اور صوفیہ کا اتفاق ہے، لیکن نماز میں فقہی تقسیم فرض، واجب اور مستحب کے لحاظ سے اس کو کون سا درجہ حاصل ہے، اور بغیر خشوع کی پڑھی ہوئی نماز کا اعادہ کیا جائے گا یا نہیں، اس بارے میں ان کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے عام فقہاء محدثین تو خشوع کے استحباب ہی کے قائل ہیں، لیکن بعض علماء اور متکلمین کا رجحان اس کے وجوب[۱] کی طرف ہے، ہم دونوں کے بیانات اور دلائل نقل کرنے کے بعد ان میں تطبیق دینے کی کوشش کریں گے،

---

[۱] وجوب سے معنی شرط ہے

جو لوگ استحباب کے قائل ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں:

(۱) جس طرح ہم منافق و ریاکار کی نماز کو باطل قرار نہیں دیتے بلکہ سب متفقہ طور سے کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ سے فرض ادا ہوگیا اور وہ شرعی تعذیر کا مورد نہیں رہا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان خشوع و خضوع اور حضور قلب کے بغیر نماز پڑھے، تو بدرجۂ اولیٰ اس کی نماز کو فاسد نہیں قرار دیا جاسکتا، اور نہ اس کو تارک صلوٰۃ قرار دے کر سزا دی جاسکتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ نماز عند اللہ مقبول ہوگی، یا نہیں، ہم اس کے مکلف نہیں ہیں،

(۲) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تو شیطان اس کے دل میں مختلف قسم کے وسوسے اور برے برے خیالات ڈالتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس آدمی کو یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں جب ایسا محسوس ہو! تو اس کو سجدۂ سہو کر لینا چاہئے،

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے، کہ خشوع اور حضور قلب نماز میں مستحب ہے، شرط و واجب نہیں، ورنہ اگر یہ شرط و واجب ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کے اعادہ کا حکم دیتے نہ کہ صرف سجدۂ سہو کا،

جو لوگ وجوب کے قائل ہیں، مثلاً ابوطالب مکی، سفیان ثوری، حسن بصری، امام غزالی امام رازی وغیرہ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں،

(۱) قرآن نے اس آیت اقم الصلوٰۃ لذکری میں امر (حکم) کا صیغہ استعمال کیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ نماز ذکر الٰہی کے لئے ہی پڑھنی چاہئے، اور ذکر الٰہی کے لئے حضور قلب ایک ضروری شرط ہے اب جو غفلت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے وہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے،

(۲) قرآن نے ان آیات ولا تکن من الغافلین (غافلین میں سے نہ ہو) اور فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون (ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے، جو نماز کے بارے میں سستی اور غفلت سے کام لیتے ہیں) میں نماز کے اندر غفلت سستی اور عدم حضور سے روکا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے لئے وعید فرمائی ہے، کیونکہ یہ چیزیں خشوع کے منافی ہیں،

(۳) اس آیت الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (کیا اسکا وقت نہیں آیا

کہ لوگوں کے دل اللہ کے ذکر کے لئے جھک جائیں) میں ان لوگوں پر مزید وعید کی گئی ہے، جو خشوع وخضوع کے بغیر نماز پڑھتے ہیں، اس آیت کے شان نزول کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں من جملہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا، کہ صحابہ کرام سے خشوع کے خلاف کچھ افعال سرزد ہو گئے تھے، اس پر یہ آیت اتری اگر خشوع نماز میں کوئی ضروری شرط نہ ہوتی، تو یہ وعیدیں کیوں کی جاتیں،

(۴) حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یخشع (جس کی نماز خشوع سے خالی ہے اس کی نماز کچھ نہیں ہے) میں صاف طور سے اس نماز کو جو خشوع سے خالی ہو، بے حقیقت بتلایا گیا ہے،

سفیان ثوری سے منقول ہے، من لم یتخشع فسدت صلاتہ (جو نماز خشوع کے ساتھ نہ پڑھے اس کی نماز فاسد ہے) حسن بصری سے مروی ہے،

کل صلاۃ لایحضر فیہا القلب فہی الی العقوبۃ اسرع

ہر وہ نماز جو حضور قلب کے بغیر پڑھی گئی ہو وہ انعام واکرام کے بجائے سزا وعقوبت کیطرف زیادہ تیزی سے لے جانے والی ہے،

نقلی دلائل کے علاوہ ان کے پاس عقلی وذوقی دلائل بھی ہیں وہ کہتے ہیں

اعضاء کی ظاہری حرکت نماز کا جسم اور خشوع اس کی روح ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ بغیر روح کے جسم کا قیام ناممکن ہے،

(۲) حافظ ابن قیم فرماتے ہیں، کہ نماز بندہ کی طرف سے ایک نیاز اور تحفہ ہے، جسے وہ بارگاہ رب العزت میں پیش کرتا ہے، اس لئے اسے چاہیئے کہ وہ بہتر سے بہتر صورت میں پیش کرے ورنہ اس کی نماز اعزاز واکرام کے بجائے عتاب وعقاب کا سبب بن جائے گی۔

(۳) اللہ تعالٰی نے ان آیات قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون میں مومنین کی فلاح اور وراثت جنت کو جن صفات پر معلق ومشروط رکھا ہے، ان میں سے ایک خشوع بھی ہے، اگر یہ کوئی بہت ہی اہم صفت نہ ہوتی تو فلاح وصلاح کو ایک ساتھ مشروط کیوں کیا جاتا۔

(۴) امام غزالی فرماتے ہیں، کہ تمام عبادات میں نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں حضور قلب مع حضور ذہن اور طمانیت وسکون ایک ضروری ولازمی شرط ہے، مثلاً اگر کوئی شخص

حضورِ قلب کے بغیر بھی زکوٰۃ ادا کر دے تو اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور اس میں کوئی خرابی نہیں آئے گی، اسی طرح روزہ و حج بھی لیکن نماز بغیر اس صفت کے ادا نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ نماز میں عبد اپنے معبود سے ہم کلام ہوتا ہے، اور ہم کلامی قلب و ذہن کے حضور و ظہور (جس کا دوسرا نام خضوع و خشوع ہے) کے بغیر ناممکن ہے،

لیکن وجوب و استحباب کا اختلاف بالکل نزاعِ لفظی کے مرادف ہے فقہا جو بغیر خشوع نماز کے جواز کے قائل ہیں، اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جس نے بغیر خشوع نماز پڑھی ہے وہ قانون کی گرفت سے بری ہو گیا، اب ہم اسے تارک الصلوٰۃ نہیں کہہ سکتے، یہ اور بات ہے کہ اس کی نماز مقبول ہوئی یا نہیں، یا اسے اس کا اجر و ثواب ملے گا یا نہیں، اور جو لوگ اس کے وجوب کے قائل ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر نماز میں وہ روح ہی مفقود ہے تو گو وہ قانون کی زد سے نکل جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی اجر و ثواب کا مستحق کیسے ٹھہر سکتا ہے اور اس لئے بے روح عبادت کو عبادت کیسے کہا جا سکتا ہے تو دونوں وجوب کے قائل دو حیثیتوں سے ہیں، ایک کے پیش نظر صحت عند العباد ہے اور دوسرے کے پیش نظر صحت عند اللہ اس لئے مختصر الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے، کہ خشوع شرط قبولیت ہے، شرط جواز نہیں،

افتاء ومفتی کیلئے اصول وآداب

مولانا عبدالمجید ندوی - ایم اے علیگ

(۲)

قاعدہ ۳: اقوال وآراء کے اختیار کرنے میں وجوہِ ترجیح کا علم رکھنا اور ترتیب مقررہ کا لحاظ رکھنا۔

مسائل پیش آمدہ میں اگر امام المذہب (ابوحنیفہؒ) کا قول پایا جاتا ہے تو اسی پر فتویٰ دیا جائے گا، پھر امام ابویوسفؒ پھر امام محمدؒ پھر امام زفرؒ پھر امام حسن بن زیاد وغیرہ تلامذۂ صاحب المذہب امام ابوحنیفہ کے اقوال کو اختیار کیا جائے گا اور پھر آگے بھی اکبر سے اصغر کی طرف بڑھتے چلے چلنا ہوگا، اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اس ضمن میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر امام صاحب (ابوحنیفہؒ) ایک طرف ہوں اور صاحبین ایک طرف تو کیا کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں تین رائیں ہیں:۔

(۱) امام صاحب کے قول کو ترک کیا جائے گا اور صاحبین کے قول کو اختیار کیا جائے گا

(۲) دونوں میں سے کسی ایک فریق کے قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(۳) جس قول کی پشت پر دلائل مضبوط اور قوی ہوں اس کو اختیار کیا جائے گا، لیکن یہ اختیار اس مفتی وقاضی کے لئے جو مجتہد ہو، اگر وہ مقلد محض ہے تو اسے ترتیب مذکورہ بالا کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام صاحب ہی کی رائے کو اختیار کرنا چاہیئے۔

لیکن اختلاف کی صورت میں صحیح رائے یہ ہے کہ تعبدات مثلاً نماز روزہ وغیرہ میں امام صاحب کے قول کے مطابق عمل ہوگا اور معاملات مثلاً مزارعت ومعاملات وغیرہ میں صاحبین کے قول پر عمل ہوگا۔ متأخرین احناف کا اسی پر اجماع ہے۔ البتہ عبداللہ بن مبارکؒ کی رائے میں ہر صورت میں امام صاحب (ابوحنیفہ) ہی کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔ ہاں اگر صاحبین میں سے بھی ایک امام صاحب کے ساتھ ہوں تو بالاتفاق اسی قول کو ترجیح دی جائے گی۔

اسی ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر مشائخ نے امام صاحب اور صاحبین کے اقوال کے علاوہ کسی تیسرے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی تصریح کردی ہے تو اسی کو اختیار کیا جائے گا، چنانچہ فقیہ ابواللیث سمرقندی نے بعض مسائل میں امام زفر بن ہذیل کے قول کو ترجیح دی اور اختیار کیا ہے، تتبع سے پتہ چلا ہے کہ علماء احناف

کے درمیان سترہ [۱۷] مواقع ایسے ہیں جہاں امام زفر کے قول کو اختیار کیا گیا ہے[۱]

لیکن ہمارے اس زمانہ میں جب کہ مفتیانِ کرام اہل اجتہاد و بصیرت نہیں رہے، احتیاط اسی میں ہے کہ ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے مذکورہ بالا فقہاء کے طبقات میں تیسرے طبقہ تک مجتہدین کا وجود ملتا ہے، پھر چوتھے طبقہ سے ساتویں طبقہ تک تمام فقہا، مقلدین شمار ہوتے ہیں۔ اور مقلدین کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اصول و ضوابط کے پیش نظر نیا فتویٰ تخلیق کریں، انھیں محض صریح قول کو حوالہ کے ساتھ بیان کر دینا چاہئے۔ علامہ ابن نجیم[۲] "الفوائد الزینیۃ" میں لکھتے ہیں "مفتی مقلد پر واجب ہے کہ وہ صرف صریح قول کو حوالہ کے ساتھ بیان کر دیا کرے، اصول و قواعد کو سامنے رکھ کر نیا فتویٰ نہ گھڑے"

اسی ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ (۱) عبادات و تقربات میں امام صاحب کے قول کو غیر مشروط طور پر ترجیح دی جائے اِلّا آنکہ امام صاحب سے کوئی اور روایت منقول ہو جس کی مشائخ نے تصریح و تصحیح کر دی ہو جیساکہ نبیذ سے وضوء اور پھر رجوع الی التیمم کی روایت ہے[۳]، (۲) اور معاملات و قضاء و شہادت میں امام ابو یوسف کے قول کو اور (۳) توریث ذوی الارحام کے مسائل میں امام محمد کے قول کو اور (۴) استحسان کو قیاس پر اور (۵) قول متأخر کو قول متقدم پر، اور (۶) متون کو شروح پر، اور (۷) شروح کو فتاویٰ پر، ترجیح دی جائے گی۔

اسی ترتیب میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ہے کہ فتاویٰ کی کتابوں میں سے فتاویٰ خانیہ اور ملتقی الابحر میں جو اقوال متقدم ہیں انھیں متأخر پر ترجیح دی جائے گی، کیونکہ تتبع سے معلوم ہوا ہے کہ ان کتابوں میں قوی اقوال کو مقدم رکھا گیا ہے اور ضعیف کو مؤخر، ان دونوں کتابوں کے علاوہ دیگر کتب فتاویٰ مثلاً شروح ہدایہ، شروح کنز، کتاب الکافی اور کتاب البدائع وغیرہ میں راجح اقوال کو بالخصوص امام صاحب (ابو حنیفہ) کے اقوال کو

---

[۱] ان تمام سترہ مواقع کو رسالہ ھذا کے مولف علامہ ابن العابدین نے رد المختار کے حاشیہ میں "باب النفقہ" کے تحت درج کیا ہے۔

[۲] ابن نجیم علماء حنفیہ میں بڑے مرتبہ کے فقیہ ہیں مشہور کتاب "الاشباہ والنظائر" کے مصنف ہیں

[۳] وفی روایۃ عن ابی حنیفۃ التیمم فقط عند عدم غیر نبیذ التمر، وھذہ روایۃ قد صححوھا۔

مؤخر کیا گیا ہے اس لئے اِن کتابوں کے مؤخرالذکر اقوال کو ترجیح دی جائے گی۔

اسی ضمن میں ایک اصول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب دو۲ اقوال مذکور ہوں، ایک کی تعلیل کی گئی ہو اور دوسرے کے بارے میں خموشی ہو تو جس کی تعلیل کی گئی اس کو ترجیح دی جائے گی۔

اسی ضمن میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ اگر تین اقوال ذکر کیے گئے ہوں تو درمیانی قول مرجوح متصور ہوگا اور اول و آخر میں سے ہی کسی ایک کو ترجیح دی جائے گی۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ سب وجوہِ ترجیح کسی کتاب کے مصنف کے علمی احوال وا سالیب بیان سے واقفیت کے بعد ہی متعین کئے جا سکتے ہیں، البتہ اگر بالکل واقفیت نہ ہو تو کسی مسئلہ کے بارے میں تین اقوال پائے جانے کی صورت میں یہ اصول صحیح ہے کہ درمیانی قول مرجوح متصور ہوگا اور اول یا آخر میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جائے گی۔

اسی ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ وقف سے متعلق مسائل میں اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو " أنفع للوقف " ہو، یعنی جس پر عمل کرنے سے منشاءِ وقف کو زیادہ تقویت حاصل ہو۔

قاعدہ ۸: کلمات وعلاماتِ مرجحات کی رعایت رکھنا | کسی قول یا رائے کی ترجیحی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے کچھ کلمات وعلامات ہیں جو ہمارے علماءِ احناف کی کتابوں میں متداول و مستعمل ہیں، مفتی کیلئے ضروری ہے ان سے واقف ہو اور فتویٰ کے وقت انھیں ملحوظ رکھے، فتاویٰ خیریہ میں ان کلمات کے متعلق مذکور ہے کہ یہ کلمات راجح اور مفتیٰ بہ اقوال کی علامات میں سے ہیں مثلاً:-

" وعلیہ الفتویٰ "، " وبہ یفتیٰ "، " وبہ نأخذ "، " وعلیہ الاعتماد "، " وعلیہ عمل الیوم "، " وعلیہ عمل الأمۃ "، " وھو الصحیح "، " وھو الأصح "، " وھو الأظہر "، " وھو المختار فی زماننا وعمل مشائخنا "، " وھو الأشبہ "، " وھو الأوجہ "، وغیرہ وغیرہ بہت سے کلمات ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ہے کہ ان کلمات میں سے بھی بعض کو بعض

پر ترجیح حاصل ہے مثلاً الفاظِ فتویٰ کو غیر الفاظِ فتویٰ پر ترجیح ہے، لیکن جب الفاظِ فتویٰ میں تعارض ہو جائے تو جس میں "حصر" کا اسلوب استعمال کیا گیا ہوگا اس کو ترجیح دی جائیگی مثلاً "والفتویٰ علیہ" پر "وعلیہ الفتویٰ" ترجیح دی جائے گی۔

اسی طرح اگر کہیں کلمہ "وعلیہ عمل الأمۃ" وارد ہو تو اس کو سب پر ترجیح دی جائے گی۔ کیونکہ اس میں "اجماع" کی بو پائی جاتی ہے۔

اسی ضمن میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ کلمۂ "صحیح" اور "اصح" میں سے کس کلمہ کو ترجیح دی جائے گی، اور اسی طرح "احتیاط" اور "احوط" میں سے کس کو ترجیح دی جائے گی؟

جواب اس کا یہ دیا گیا ہے کہ جہاں تک کلمات "احتیاط" اور "احوط" کا مسئلہ ہے، بالاتفاق کلمہ "احوط" کو ترجیح حاصل ہے، لیکن "صحیح" اور "اصح" میں ترجیح کا قاعدہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر یہ کلمات کسی ایک مسئلہ میں ایک ہی عالم و مفتی کے ہیں تو "اصح" کو ترجیح دی جائے گی، اسی طرح اگر ایک بڑا جید عالم "اصح" کہتا ہے اور چھوٹا "صحیح" کہتا ہے تو "اصح" کو ترجیح حاصل ہوگی[1] البتہ اگر ایک عالم "اصح" اور دوسرا "صحیح" کہتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہو کہ کس قول کا قائل اصاغر میں سے اور کس کا اکابر میں سے ہے تو کلمہ "صحیح" کے مقابلہ میں بھی صحت موجود ہے اور "صحیح" کے مقابلہ میں صحت مفقود ہے، یعنی اصح تو صحیح کے بالمقابل ہے جب کہ صحیح فاسد کے بالمقابل ہے، لہٰذا ترجیح "صحیح" کو دی جائے گی۔

اسی ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ زمانہ کے حالات و تغیرات کی رعایت کی جائے گی، لہٰذا جس قول کو "أدفق لأہل الزمان" کہا گیا ہو، اسی پر عمل کیا جائے گا، مثلاً "تزکیۃ الشہود" کے مسئلہ میں صاحبین کے قول پر عمل کیا جائے گا، یعنی ظاہرِ عدالت کو کافی نہ سمجھا جائے گا۔

اسی ضمن میں یہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے اور اس کو کافی اہمیت دی گئی ہے کہ اگر مفتی مقلد محض نہیں ہے تو اسے ہمیشہ اس قول کو ترجیح دینی چاہیئے جو دلائل و براہین کے اعتبار سے قوی ترین ہو۔

---

[1] مثلاً فتاویٰ خانیہ کو فتاویٰ بزازیہ پر ترجیح حاصل ہے

مگر اس زمانہ میں جب کہ مفتیان کرام بیچارے محض دفع حرج کیلئے مقرر کئے جاتے ہیں اور فہم وبصیرت سے تہی دامن ہوتے ہیں، دلائل وبراہین کی بنیاد پر ترجیح دینے کا نہایت قیمتی اصول اپنانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

قاعدہ ع۵: مفہوم موافق کے مطابق عمل کرنا کلمۂ "مفہوم" ایک شرعی اصطلاح ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) مفہوم موافق جسکو دلالۃ النص بھی کہتے ہیں، اس کی تعریف اسطرح کی جاتی ہے کہ مفہوم موافق، محض لغت کی دلالت سے بلا کسی اجتہاد وقیاس کے، منطوق بہ کے حکم کو مسکوت عنہ کیلئے ثابت کرنے کا نام ہے، مثلاً قرآن مجید میں والدین کے سلسلے میں آیا ہے ((ولا تقل لہما أف)) اس نص میں تأفف کیلئے نہی وارد ہوئی ہے مگر اسی سے لغۃً بلا کسی قیاس واجتہاد کے یہ بھی حکم ثابت ہوتا ہے کہ ضرب وشتم بدرجۂ اولی منہی عنہ ہے، کیونکہ "اُف" کی ممانعت کی علت ایذا رسانی کی قباحت ہے اور یہ قباحت ضرب وشتم میں اُف سے زیادہ ہے، لہذا اس قرآنی نص کی لغوی دلالت سے ہی ضرب وشتم بھی منہی عنہ قرار پائے، حالانکہ یہ مسکوت عنہ ہیں۔

(۲) مفہوم مخالف، یہ مفہوم کی دوسری قسم ہے، بعض فقہاء نے اسی کو "فحوائے خطاب" اور "دلیل خطاب" بھی کہا ہے مفہوم مخالف کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم منطوق بہ کا ہے اس کا مخالف حکم مسکوت عنہ کا ہوگا، اس کی کل مختلف پانچ قسمیں ہیں:۔

(۱) مفہوم الصفت جیسے ((فی السائمۃ زکوٰۃ)) کا مفہوم مخالف ((لا زکوٰۃ فی غیر السائمۃ)) ہے

(۲) مفہوم الشرط جیسے ((إن کن أولات حمل فانفقوا علیہن)) کا مفہوم مخالف ((ان لسن أولات حمل فلا تنفقوا علیہن)) ہے۔

(۳) مفہوم الغایت جیسے ((فإن طلقہا فلا تحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ)) کا مفہوم مخالف ((إذا تزوجت المطلقۃ غیر مطلقہا حلت)) ہے۔

(۴) مفہوم العدد جیسے ((فمن لم یجد فصیام ثلاثۃ ایام)) کا مفہوم مخالف ((اقل ثلاثۃ ایام أو اکثر)) ہے۔

(۵) مفہوم اللقب جیسے ((فی الغنم زکوٰۃ)) کا مفہوم مخالف ((لا زکوٰۃ فی غیر الغنم)) ہے۔ مفہوم اللقب

کا مطلب یہ ہے کہ کسی نص کا حکم اس میں وارد شدہ کسی جامد لفظ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔
مفہوم مخالف کو حجت شرعی ماننے نہ ماننے میں فقہاء کے اختلافات کی تین صورتیں ہیں:۔
(۱) مفہوم اللقب کے مفہوم مخالف کی عدم حجیت پر تمام فقہاء متفق ہیں۔
(۲) مفہوم اللقب کے مفہوم مخالف کے علاوہ دیگر مفاہیم اربعہ کے مفاہیم مخالفۃ غیر شرعی نصوص (ماسوائے قرآن وحدیث) میں باتفاق فقہاء حجت ہیں۔
(۳) علاوہ فقہاء احناف کے جمہور فقہاء کے نزدیک شرعی نصوص میں بھی مفاہیم مخالفۃ حجت ہیں۔ جمہور فقہاء کے دلائل یہ ہیں:۔
(۱) عبارات و اسالیب عرب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکم کو کسی وصف و شرط سے مشروط یا کسی غایت وعدد سے محدود کیا گیا ہو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس حکم کے ثبوت کے لئے اس قید وحد کا وجود ضروری ہے، لہٰذا اگر وہ قید وحد نہیں پائی جاتی تو وہ حکم بھی نہیں ثابت ہوگا مثلاً کسی نے کہا ((هب إبنك ساعة إذا نجح)) اپنے بیٹے کو کامیابی پر ایک گھڑی دو۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ ناکامی پر گھڑی نہیں دینی ہے۔
اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان ((أو دماً مسفوحاً)) سے مفہوم مخالف یعنی دم غیر مسفوح کی حلت ثابت و مسلم ہے۔
(۲) نصوص شرعیہ میں جو قیود وحدود وارد ہیں، وہ مبنی برحکمت و مصلحت ہیں، عبث اور بے سود نہیں ہیں مثلاً افادۂ تخصیص وغیرہ اور ظاہر ہے، تخصیص وغیرہ کا تقاضا یہی ہے کہ جہاں نہ پایا جائے وہاں حکم کا ثبوت بھی نہ ہو، ورنہ احکام شرعیہ میں اہمال و اختلال واقع ہوگا، ہاں اگر کسی اور قرینہ سے معلوم ہو کہ یہ حدود و قیود کسی اور غرض کیلئے ہیں جیسے مدح و ذم یا تفخیم وغیرہ تو وہاں مفہوم مخالف سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔
یہ تو تھے فقہاء جمہور کے دلائل، فقہاء حنفیہ جیساکہ اوپر کہا گیا ہے نصوص شرعیہ میں مفہوم مخالف سے استدلال کے قائل نہیں ہیں۔ البتہ عامۃ الناس کے عرف و عادات اور معاملات وغیرہ میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں، روایات صحابہ میں بھی مفہوم مخالف کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ روایات مدرک بالعقل مضامین پر مشتمل ہوں کیونکہ

ایسی صورت میں ان کی حیثیت مرفوعات کی نہیں بلکہ ان کے اپنے اجتہادات کی ہوگی۔

فقہاء حنفیہ کے دلائل یہ ہیں :۔

(۱) عبارات و اسالیب عرب سے تمام تر یہی ثبوت نہیں ملتا کہ کوئی حکم کسی وصف، شرط، عدد یا غایت سے مقید و مشروط ہو کر وارد ہوتا ہے تو جہاں وہ موجود ہو حکم ثابت ہوتا ہے اور جہاں معدوم ہو وہاں حکم کی نفی ہو جاتی ہے، بلکہ یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مخاطب ہر جگہ مفہوم مخالف سے استدلال پر اکتفاء نہیں کرتا ہے بلکہ مطلق حکم کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور اس استفسار و سوال کو کوئی غیر مانوس و معیوب نہیں سمجھتا، مثلاً ایک شخص کسی سے کہتا ہے ((اذا سألك فلان صباحاً فاقض حاجته)) اس پر مخاطب سوال کرتا ہے ((و إذا سألني مساءً)) تو متکلم اسے غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس وضاحت طلبی کی ضرورت کا اعتراف کرتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات مفہوم مخالف سے عدم استدلال کی صورت ہی میں صحیح ہو سکتی ہے، ورنہ یہ سوال ہی فضول ہوتا ہے، لہذا اس سے ثابت ہوا کہ مفہوم مخالف کا ثبوت کلام عرب میں بھی قطعی اور یقینی نہیں ہے اور شریعت کے معاملہ میں غیر یقینی شے کو دلیل و حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

(۲) نصوص شرعیہ میں اگرچہ بہت سے احکام کسی قید سے مقید ہو کر وارد ہوئے ہیں لیکن جہاں وہ قید نہیں موجود ہوتی وہاں بھی حکم ثابت و باقی رہتا ہے مثلاً بیوی کی لڑکی (ابیبہ) محرمات میں سے ہے خواہ "فی حجورکم" کی شرط پائی جائے یا نہ پائی جائے، اس سے ظاہر ہے کہ قید کے ساتھ وارد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ جہاں قید نہ ہو وہاں کی نفی ہوگی، مزید براں دیکھا جا رہا ہے کہ ایک مقام پر حکم نص کو قید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور پھر اس کا مفہوم مخالف بھی بیان کیا گیا ہے ((من نساءکم اللاتی دخلتم بهن فإن لم تكونوا دخلتم بهن فلا جناح عليكم)) یا مثلاً ((ولا تقربوهن حتى يطهرن فإذا تطهرن فأتوهن من حيث أمركم الله))

اس سے ظاہر ہے کہ نصوص شرعیہ میں مفہوم مخالف کو قطعیت و لزوم نہیں حاصل ہے ورنہ خود نصوص ہی میں مفہوم مخالف کو بیان کی ضرورت نہ تھی، لہٰذا شریعت کے

معاملہ میں غیر یقینی وغیر لازمی امر کو دلیل و حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

قاعدہ ع۶: عرف و عادت کا پاس و لحاظ رکھنا عُرف کے معنی لوگوں کے درمیان کسی امر کے جاری وساری اور معروف ومشہور ہو جانے کے ہیں، عرف کو عادت بھی کہتے ہیں، عرف قولی بھی ہوتا ہے جیسے "ولد" کا لفظ ہے، یہ وضعاً لڑکا، لڑکی دونوں کے لئے ہے لیکن عرفاً صرف لڑکے کیلئے مستعمل ہے، اسی طرح لفظ "لحم" اپنی اصل وضع کے اعتبار سے مچھلی کے گوشت تک کو شامل وحاوی ہے لیکن عرف میں مچھلی اس سے خارج ہے۔

عُرف عملی بھی ہوتا ہے جیسے بیع کا انعقاد اصلاً تو صیغۂ عقود سے ہونا چاہیئے لیکن عُرف میں غیر صیغۂ عقود سے انعقاد و تحقق تسلیم ہے۔

عرف و عادت اسی امر کو کہیں گے جس کی عرفیت ہر خاص و عام کو تسلیم ہو، محض خواص کا اعتراف کافی نہیں ہے۔ عرف و اجماع میں یہی بنیادی فرق ہے، یعنی اجماع تو خواص اہل علم کے اعتراف و اتفاق کا نام ہے جب کہ عرف کیلئے ہر خاص و عام کا اعتراف ضروری شرط ہے۔

عرف کی تقسیم جسطرح قولی و عملی کی گئی ہے اسی طرح اس کی ایک تقسیم خاص و عام ہے "عرف خاص" سے خاص حکم ثابت ہوتا ہے، یعنی یہ کسی عموم کی تخصیص کی صلاحیت نہیں رکھتا جب کہ "عرف عام" سے قیاس واثر کی تخصیص کی جا سکتی ہے، مثلاً بیع المعدوم کی عمومی نہی سے استصناع[۱] کو مخصوص کر کے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے

عرف کی ایک تقسیم صحت و بطلان کے اعتبار سے کی گئی ہے یعنی عرف صحیح یا عرف فاسد قرار دیا گیا ہے اور در اصل یہی حقیقی تقسیم ہے۔

"عرف صحیح" وہ عرف ہے جو نہ کسی دلیل شرعی سے متناقض ومتضاد ہو، نہ کسی حلال کو حرام اور کسی حرام کو حلال بنا دینے والا ہو۔ عرف صحیح کا پاس و لحاظ ہر مفتی و قاضی کیلئے ضروری ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے صحیح عرف کو باقی رکھا ہے۔ مثلاً دیت کو

---

[۱] استصناع کی مثال موچی وغیرہ سے جوتے وغیرہ کا معاملہ کرنا اور دام وغیرہ طے کرنا ہے حالانکہ جوتا معدوم ہوتا ہے، مگر عرفاً جائز ہے۔

عاقلہ[1] پر برقرار رکھا، اسی طرح نکاح وزواج میں کفاءت[2] اور ولایت ووراثت میں عصبیت[3] کو برقرار رکھا۔

عُرف فاسد وہ عرف ہے جو اگرچہ لوگوں کے درمیان جاری وساری ہو لیکن شریعت سے متصادم ہو مثلاً شراب خوری، سود اور جوا وغیرہ۔

عرف فاسد کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، وہ سراسر مردود وغیر معتبر ہے

عرف پر مبنی احکام تغیرات زمانہ کے ساتھ خود بھی متغیر ہوتے رہتے ہیں اور اس کی حیثیت عصروزمان کی تبدیلی ہے نہ کہ حجت وبرہان کی۔ دراصل عرف کوئی مستقل شرعی دلیل نہیں ہے، بلکہ "مصالح مرسلہ" کی ایک فرع ہے یعنی جس طرح مصالح مرسلہ ایسی مصلحتوں کو کہتے جن کا لحاظ رکھنا اگر شریعت میں منصوص نہیں ہے تو ممنوع بھی نہیں ہے اور مقصود اس سے جلب منفعت یا دفع مضرت ہے، اسی طرح عرف صحیح بھی ہے کہ شریعت سے متصادم بھی نہیں ہے اور دفع ضیق وضرر میں مؤثر ہے۔

فقہا نے عرف کو خاص اہمیت دی ہے چنانچہ بطور اصول یہ مقولہ مشہور ہے کہ ((تترک الحقیقۃ بدلالۃ الاستعمال والعادۃ[4] یعنی عرف (مجاز عرفی) کے مقابلہ میں حقیقت کو چھوڑ کر عرف پر عمل کیا جائے گا۔

قاعدہ ۷: دینی ودنیوی مصلحت کے تقاضے پر ضعیف روایت اختیار کرنا امام برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ سے خون وپیپ کے مسئلہ میں دو[5] اقوال مروی ہیں:۔

(۱) اگر تھوڑا تھوڑا ابس طور خارج ہو کہ سیلان نہ پایا جائے تو مانع طہارت نہیں ہے خواہ کثیر ہو جائے۔

---

[1] والدیۃ مغلظۃ علی العاقلہ، ان عمر بن الخطاب قضی بالدیۃ علی العاقلہ فی ثلث سنین رواہ ابن ابی شیبہ فی مصنفہ والمروی عنہ کالمروی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہ مما لایعرف بالرای (ہدایہ ج ۴ ص ۵۴۵) [2] قال علیہ السلام الا لایزوج النساء الا الاولیاء ولا یزوجن الا من الاکفاء، (ہدایہ ج ۲ ص ۲۹۹ ایضاً ۲۹۶) [3] قال علیہ السلام النکاح الی العصبات (دارقطنی بحوالہ ہدایہ) [4] الأشباہ والنظائر السادسۃ العادۃ محکمۃ وأصلہا قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ((مارآہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن)) ص ۷۷

(۲) اگر اس طور پر ہو کہ چھوڑ دیا جائے تو جمع ہو کر یہ پڑے تو مانع ہے [1]

علامہ موصوف کے نزدیک اصول کے مطابق پہلا قول قوی ہے دوسرا ضعیف، لیکن فی الواقع دوسرا قول قوی ہے، پہلا ضعیف، پس اگر مستفتی معذور ہے یعنی مصلحت اس کی آسانی میں ہے تو ضعیف قول پر فتویٰ دینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اُولیٰ ہے، لیکن اگر مستفتی معذور نہیں ہے تو قوی قول پر عمل واجب ہے۔

صاحب البحر [2] نے حیض کے الوان کی بحث میں متعدد ضعیف اقوال نقل کئے ہیں اور پھر لکھا ہے :۔

((وفی المعراج عن فخر الائمۃ لو أفتی مفت بشیٔ من ھذہ الأقوال فی مواضع الضرورۃ طلباً للتیسیر کان حسناً))	معراج میں فخر الائمہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی مفتی ان اقوال میں سے کسی قول پر ضرورت و مصلحت کے وقت سہولت و آسانی پیدا کرنیکے لئے فتویٰ دے تو بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معذور کو ضعیف روایت پر عمل کرنا اور اس کے حق میں ضعیف روایت پر فتویٰ دینا درست ہے ضعیف روایت پر عمل وافتاء کی ممانعت معتدل حالات کے وقت ہے، یعنی جب کوئی دینی و دنیوی ضرورت مصلحت، ضعیف روایت کو اختیار کرنے کی متقاضی نہ ہو۔

قاعدہ ۸ حاکم و قاضی کے ضعیف روایت پر مبنی حکم و فیصلہ کا عدم نفاذ علامہ قاسم تلمیذ رشید علامہ ابن الہمام صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں کہ ((اگر حاکم و قاضی مقلد ہے تو اسے اپنے مسلک و مذہب کے قوی اور مشہور قول کے مطابق ہی قضاء و فیصلہ کا اختیار ہے، اگر اس نے عمداً اپنے مذہب کے مشہور مفتیٰ بہ قول کے خلاف حکم کیا ہے تو اس کا حکم نافذ نہ ہوگا۔ البتہ اگر بھول کر ایسا کر دیا ہو تو ایک روایت کے مطابق امام صاحب (ابو حنیفہ) کے نزدیک نافذ ہوگا، لیکن صاحبین کے نزدیک اس صورت میں بھی نافذ نہ ہوگا))۔

---

[1] مختارات النوازل للمرغینانی

[2] البحر الرائق فی شرح کنز الدقائق ۔ از علامہ زین العابدین بن ابراہیم معروف بابن نجیم

معراج میں محیط کے حوالہ سے مذکورہ ہے کہ "فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے یعنی دونوں صورتوں میں عدم نفاذ ہے"

فتح القدیر میں ہے کہ "اس مسئلہ کی بابت فتووں میں اختلاف ہے، لیکن اس زمانہ میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جانا اولیٰ ہے، کیونکہ مفتیٰ بہ اور مشہور و قوی قول کو عمداً ترک کرنے والا اتباع نفس کا مجرم ہے اور بھول کر ایسا کرنے والا اپنے مقلدین مذہب کی رہنمائی میں خطا کا مرتکب ہے، لہٰذا اگر قاضی و حاکم مقلد محض ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کا حکم نافذ نہ ہوگا، بلکہ اسے اس حکم خاص میں معزول بھی تصور کیا جائے گا، کیونکہ اس کا تقرر اسی لئے کیا گیا تھا کہ مقلدین مذہب کو مذہب کے مشہور، قوی اور مفتیٰ بہ اقوال و آراء پر عمل کرائے گا"۔

بزازیہ میں شرح طحاوی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ "جب قاضی مقلد ہو اور کوئی فیصلہ کرے، پھر اسے معلوم ہو کہ اس کا فیصلہ خلاف مذہب ہے تو اسے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ پہلا فیصلہ نافذ ہو جائے گا"

اس قول کی تائید میں امام محمدؒ سے بھی ایک روایت بیان کی جاتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، قنیہ میں محیط کے حوالہ سے مذکور ہے کہ "قاضی مقلد اگر اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ صادر کرے گا تو وہ نافذ نہ ہوگا"

علامہ ابن الہمام صاحب فتح القدیر اور علامہ قاسم صاحب تصحیح فتح القدیر کا قول بھی یہی ہے کہ ایسا فیصلہ نافذ نہ ہوگا، درمختار میں ہے:۔

"ہمارے اس زمانہ میں خاص طور پر خلاف مذہب فیصلہ نافذ نہ ہوگا"۔

اس مسئلہ میں فیصلہ کن علامہ قاسم کے فتاویٰ کی یہ عبارت ہے:۔

"ولیس للقاضی المقلد أن یحکم بالضعیف لأنه لیس من اهل الترجیح فلا یعدل عن الصحیح الا لقصد	مقلد قاضی کیلئے جائز نہیں ہے کہ ضعیف قول پر فتویٰ و فیصلہ صادر کرے، کیونکہ وہ اہل ترجیح میں سے نہیں ہے، لہٰذا اس کا صحیح (قوی) سے

غير جميل، ولو حكم لا ينفذ لأنّ قضاءه قضاء بغير الحق لأنّ الحق هو الصحيح)).

انحراف ہی اس کی بدنیتی پر محمول ہوگا اور اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، ناحق قرار پائے گا کیونکہ حق صحیح (قوی) کو اختیار کرنے کا نام ہے۔

ختم شده

والحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات وصلی اللّٰه تعالے علے سیدنا محمد وعلیٰ آله واصحبه وسلم والحمد لله رب العالمین تجز ذالك بقلم جامعه الفقیر محمد عابد بن غفران اللّٰه تعالیٰ له ولوالدیه ومشائخه وذدیته والمسلمین ۔

ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ

رَبِّ إنّی لما رزقتنی من خیر فقیر

ترجمہ کتاب الاذکار

مولانا قمر الزماں صاحب، مدرسہ بیت المعارف، الہ آباد

(فصل) ذکر قلب سے ہوتا ہے، اور زبان سے بھی ہوتا ہے، مگر افضل وہ ذکر ہے جو قلب اور زبان دونوں سے ہو۔ اور اگر ان میں سے کسی ایک سے ہو تو پھر ذکر قلبی افضل ہے اور یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ذکر قلبی کے ساتھ زبان سے ذکر کرنے کو اس خوف سے ترک کر دے کہ لوگ ریا کا گمان کریں گے بلکہ زبان وقلب دونوں ہی سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا قصد وارادہ کرے اور ہم اس سے پہلے حضرت فضیل ابن عیاض رح کا ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ لوگوں کے خوف سے عمل کا ترک کرنا ریا ہے۔ اور اگر انسان اپنے اوپر اعمالِ خیر کے کرنے میں لوگوں کے ملاحظہ کا باب اور ان کے بدگمانیوں سے احتراز کا دروازہ کھولے گا تو یقیناً اس کے لئے اعمالِ خیر کے بہت سے ابواب مسدود ہو جائیں گے۔ اور مہمات دین کے بڑے حصہ کو ضائع کر دیگا اور یہ عارفین کا طور وطریقہ نہیں ہے۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ یہ آیت:

ولا تجہر بالصلوتك ولا تخافت بہا

دعا ہی کے بارے میں نازل ہوتی ہے۔

(فصل) اس بات کو بخوبی سمجھ لو کہ ذکر کی فضیلت تسبیح[1] وتہلیل وتحمید وتکبیر وغیرہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی بھی عمل کرنے والا ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ذاکر ہے۔ ایسا ہی سعید ابن جبیر وغیرہ علماء نے فرمایا ہے۔ اور حضرت عطاء رح نے فرمایا کہ وہ جگہیں بھی مجالسِ ذکر ہیں جنمیں حلال وحرام کا بیان ہوتا ہو کہ کیسے خرید وفروخت کی جائے، کیسے نماز روزہ اور حج کی ادائیگی ہو، اور نکاح وطلاق وغیرہ کے کیا احکام ومسائل ہیں۔

---

[1] سبحان اللہ، لا الٰہ الا اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر۔ کہنا

(فصل) اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا

(إن المسلمين والمسلمات) الیٰ قوله تعالےٰ وَالذّاكرين الله كثيرا والذاكرات اعد الله لهم مغفرة واجرا عظيما۔

(یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد تک۔ اور کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنیوالی عورتیں ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مفردون سبقت لے گئے۔ تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مفردون کون سے حضرات ہیں؟ فرمایا: وہ مرد جو کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہوں اور وہ عورتیں جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والی ہوں:۔ میں کہتا ہوں کہ مفردون۔ راء کی تشدید و تخفیف دونوں کے ساتھ مروی ہے مگر مشہور جس کو جمہور نے فرمایا ہے وہ تشدید ہے۔

جان لو کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس آیت "الذاکرین الله کثیرا والذاکرات" کے مفہوم کی معرفت میں غور و خوض کرے اس لئے کہ اسمیں علماء کے اقوال مختلف ہیں —— چنانچہ امام ابوالحسن واحدی نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو نمازوں کے بعد۔ صبح و شام، بوقت منام، جب بھی سو کر بیدار ہوں، اور جب صبح ہو یا شام اپنے گھروں سے نکلیں تو اللہ تعالےٰ کا ذکر کریں:۔

اور حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ الذاکرین الله کثیرا والذاکرات میں سے آدمی اس وقت ہوگا جبکہ اٹھنے، بیٹھنے، لیٹنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے:۔

اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ جو شخص نماز پنجگانہ ان کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ پڑھے تو وہ الذاکرین الله کثیرا والذاکرات میں داخل ہے۔ اس کو واقدی نے نقل فرمایا ہے۔ اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب مرد نے اپنی بیوی کو رات میں جگایا پس دونوں نے نماز پڑھی یا دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو ان کا شمار الذاکرین الله کثیرا والذاکرات میں ہو جائیگا:۔ یہ حدیث

مشہور ہے اس کو ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ نے اپنے اپنے سنن میں روایت کیا ہے
اور شیخ امام ابوعمر ابن صلاح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ آدمی کتنا ذکر کرے
کہ الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات میں داخل ہوجائے۔ تو ارشاد فرمایا کہ صبح وشام
اور شب وروز کے مختلف احوال میں جو اذکار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و ماثور ہیں
ان پر مواظبت کرے تو کثرت سے ذکر کرنے والوں میں اس کا شمار ہوجائے گا۔ اور یہ
اذکار عمل الیوم واللیلہ میں مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

(فصل) محدث، جنبی، حائضہ، نفساء کے لئے ذکر خواہ قلبی ہو یا زبانی اس کے جائز ہونے
پر علماء کا اجماع ہے اور ذکر سے مراد سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر
درود شریف اور دعا وغیرہ ہے۔ لیکن قرأت قرآن پاک جنبی، حائضہ اور نفساء کے لئے اگرچہ
بعض آیت[1] ہی کی کیوں نہ ہو حرام ہے ہاں کلمات قرآن کا اپنے قلب پر بغیر اس کے تلفظ کے
جاری کرنا جائز ہے۔ اسی طرح قرآن میں نظر کرنا اور اسکا قلب پر جاری کرنا جائز ہے۔ اور
ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ جنبی اور حائضہ[2] کے لئے جائز ہے کہ مصیبت کے وقت انا للہ
وانا الیہ راجعون کہے اور سواری پر سوار ہوتے وقت سبحان الذی سخر لنا ھذا
وما کنا لہ مقرنین اور دعا کے وقت ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ
حسنۃ وقنا عذاب النار۔ کہے مگر جب کہ اس سے قرآن کا قصد نہ کرے۔ اور ان
دونوں کو بسم اللہ اور الحمد للہ کہنا جائز ہے، جب قرآن کا قصد نہ کریں خواہ ذکر کا قصد کریں یا
نہ کریں۔ غرض یہ لوگ جبتک قرآن کا قصد نہ کریں گے گنہ گار رہونگے۔ ان دونوں یعنی جنبی

---

[1] جامع ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا "لا تقرء الحائض ولا الجنب شیئاً من القرآن" (قرآن سے کچھ نہ پڑھیں)
تحقیق یہ ہے کہ قرآن کی حقیقت کلام ہے اور کلام مرکب ہوا کرتا ہے اس لئے حروف اور کلمات
اس حکم میں داخل نہیں ہوں گے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے کلمات کو الگ الگ کاٹ کر تعلیم بالقرآن
کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ (حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بھی یہی جواب دیا ہے)

[2] لفظ حائضہ کے تحت نفساء بھی تغلیباً داخل ہیں۔

وحائضہ کو منسوخ التلاوت آیت کی تلاوت جائز ہے ۱؎

جیسے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما ۔ یعنی جب بوڑھا بڑھیا زنا کریں تو رجم کرو اور اگر ان دونوں میں سے کسی نے کہا خُذِ الکتابَ بقوۃٍ (یعنی اس کتاب کو قوت سے پکڑو) یا کہا ادخلوھا بسلامٍ آمنین یا اس قسم کا کوئی اور کلام ہو (جو قرآن میں موجود ہو) تو اس سے کوئی کلام کرے اور قصد قرآن کا نہ ہو تو حرام نہیں ہے ۲؎

اور اگر ان دونوں نے پانی کے نہ پانے ۳؎ کی وجہ سے تیمم کیا تو قرأت قرآن جائز ہے بس اگر اس کے بعد حدث لاحق ہوا یعنی وضو ٹوٹ گیا تو قرأت قرآن حرام نہیں ہے ۴؎ جیساکہ اگر وہ غسل کرتا پھر حدث لاحق ہوتا (تو قرأت قرآن جائز ہوتا) پھر اس معاملہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے کہ پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے غسل کا تیمم حضر میں کیا ہو یا سفر میں ۔ اسکے بعد قرأت کرنا صحیح ہے اگرچہ اسکے بعد حدث لاحق ہوا ہو ۔ (یعنی ناقض وضو کوئی چیز پائی گئی ہو)

اور ہمارے بعض نے اصحاب نے فرمایا کہ اگر تیمم حضر ۵؎ میں ہو تو اس سے نماز پڑھے اور نماز میں قرأت قرآن پاک بھی کرے ۔ اور نماز سے خارج قرأت جائز نہیں ہے مگر صحیح اس کا جواز ہے جیساکہ پہلے ہم نے بیان کیا ۔ اس لئے کہ تیمم غسل کے قائم مقام ہے

۱؎ کتب منزلہ بجمیع اجزائہا کلام اللہ ہیں اس لئے آیات کا منسوخ ہونا حکم سے خارج نہیں کر سکتا چنانچہ جنبی اور اس کی اخوات کے لئے آیات منسوخہ کی بھی تلاوت حرام ہی رہے گی ۔

۲؎ صاحب ہدایہ نے بھی ایک جامع اصول یہ لکھا ہے کہ اگر قصد قرآن نہ ہو تو قرآن کے جملوں کا استعمال ناجائز نہیں ہے ۔ ۳؎ اس سے مراد عدم وجدان اور عدم قدرت دونوں ہیں ۔

۴؎ جب تیمم سے طہارت کبری (غسل) اور صغری (وضوء) دونوں کا فائدہ حاصل ہوا تو ناقض وضوء (حدث اصغر) سے طہارت باطل نہیں ہوگی اسی لئے ناقض وضوء پائے جانے کے بعد بھی بغیر مس مصحف قرأۃ قرآن جائز ہے ۔

۵؎ سفر اور حضر دونوں کا حکم اس مسئلہ میں یکساں ہے ۔

اور اگر جنبی نے تیمم کیا اس کے بعد اس نے پانی دیکھ لیا[1] تو اس کا اب استعمال لازم ہے۔ اسلئے اب اس پر قرأتِ قرآن اور ہر وہ عمل جو جنبی کے لئے حرام ہے حرام ہو گیا۔ یہاں تک کہ غسل کرے اور اگر تیمم کیا اور نماز پڑھی اور قرأت کیا پھر حدث کی وجہ سے یا دوسرے فریضہ[2] کے لئے یا اس کے علاوہ کسی سبب سے تیمم کا ارادہ کیا تو اس پر قرأت حرام نہیں ہے۔ یہی مذہب صحیح و مختار ہے۔ اور ہمارے بعض اصحاب کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں قرأتِ قرآن حرام ہے مگر یہ ضعیف ہے۔

بہرحال جب کہ جنبی نہ پانی پائے اور نہ مٹی[3] تو حرمتِ وقت کی بناء پر جس حال میں ہے اسی میں نماز پڑھ لے[4] مگر قرأت ایسے شخص کے لئے خارجِ نماز حرام ہی رہے گی۔ نیز اس کے لئے نماز میں بھی سورہ فاتحہ[5] سے زائد پڑھنا حرام ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا تو حرام نہیں ہے تو اسمیں دو وجہ ہے۔ ان میں[6] صحیح تر یہ ہے حرام نہیں ہے بلکہ واجب ہے اس لئے کہ نماز بغیر قرأت فاتحہ کے صحیح نہیں ہوتی۔ تو جیسے نماز بضرورت صحیح ہے ویسے ہی قرأت بھی جائز ہوگی۔ اور دوسری[7] وجہ یہ ہے کہ قرأت حرام ہے بلکہ ان اذکار کو پڑھے جن کو قرآن کو نہ پڑھا ہوا آدمی اپنی نماز میں پڑھتا ہے۔

---

[1] دیکھنے سے مقصود ضرورت کی مقدار پانی کے استعمال پر قدرت ہے اگر استعمال پر قدرت نہ ہو یا قدرت تو ہو لیکن ضرورت کے مطابق پورا پانی نہ ہو تو صرف دیکھ لینے سے تیمم کے احکام ختم نہیں ہو جاتے۔

[2] مخبر صادق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا التراب طہور المسلم ولو الی عشر حجج مالم یجد الماء الخ اسے طرح جامع ترمذی وسنن ابو داؤد وغیرہ میں۔ الصعید الطیب وضوء المسلم وان لم یجد الماء عشر سنین الخ بعض روایتوں میں مالم یجد الماء او یحدث بھی ہے بہرکیف ان روایات کی روشنی میں احناف تیمم کے بارے میں طہارت ممتدہ ہونے کے قائل ہیں اسی طرح مطلقاً غسل کا قائم مقام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک ہی تیمم سے جتنے فرائض ونوافل چاہے پڑھ سکتا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ اختلاف سے بچنے کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ تیمم کر لے۔ فقہاء یہی لکھتے ہیں۔ [3] ایسے شخص کو فقہ کی اصطلاح میں فاقد الطہورین کہتے ہیں۔ [4] علامہ ابن حجر نے خود علامہ نووی کا ایک قول اسطرح نقل کیا ہے "تجب الصلوٰۃ ویجب الاعادہ" نماز ادا کرلینی مستحب تو ہے لیکن اسکا اعادہ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا آخری اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ وقت کے احترام میں مصلیوں کی رکوع وسجود میں نقل کریگا پھر اصل ادائگی بعد میں کریگا جیسے وسط یوم رمضان میں وہ مسافر جو مقیم ہو جائے یا وہ حائضہ جو پاک ہو جائے (ملاعلی قاری) رحمۃ اللہ فرماتے ہیں فاقد الطہورین نماز کی نیت بھی نہیں کریگا حضورؐ نے فرمایا لا صلوٰۃ الا بطہور۔ [5] سورہ فاتحہ بھی نہیں پڑھے گا مرفقاً ہم المصلین کی اجازت ہے۔ ۱۲

چونکہ ان جزئیات کا تعلق مذکورہ مسائل سے تھا اس لئے میں نے ان کو مختصراً ذکر کر دینا مناسب سمجھا ورنہ تو ان کے لئے بہت سے احکام و دلائل ہیں جن کا ذکر کتب فقہ میں بالتفصیل درج ہے۔ واللہ اعلم

(فصل) مناسب ہے کہ ذاکر اکمل صفات پر ہو اگر بیٹھا ہو تو استقبال قبلہ کا لحاظ کرے اور بنہایت فروتنی، خاکساری، سکینہ اور وقار کے ساتھ سر جھکا کے بیٹھے اگر کوئی اسطرح نہ بیٹھے تو مکروہ نہیں ہے جائز ہے، لیکن بغیر عذر کے ایسا کرنے والا تارکِ افضل ہے[1]۔

اور اس کے عدمِ کراہت پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف الیل والنهار لآیات لاولی الالباب۔ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعوداً وعلی جنوبهم ویتفکرون فی خلق السموٰات والارض — بیشک زمین و آسمان کی خلقت میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو لوگ کہ حالت قیام و قعود میں اور لیٹ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں۔

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری گود میں ٹیک لگائے رہتے تھے اور میں حائضہ رہتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کا سر میری گود میں رہتا تھا اور میں حیض کی حالت میں رہتی تھی۔ اور حضرت عائشہ ہی سے مروی ہے کہ میں اپنے وظیفہ کو تخت پر لیٹے لیٹے پورا کیا کرتی تھی۔

(فصل) مناسب ہے کہ ذکر کئے جانے کی جگہ دل کو مشغول کرنے والی چیزوں سے خالی ہو اور پاک صاف ہو۔ اس لئے کہ اس میں ذکر و مذکور (یعنی اللہ تعالیٰ) کا زیادہ احترام ہے۔ اسی لئے مساجد[2] اور مقامات متبرکہ میں ذکر کی مدح وارد ہے۔

چنانچہ امام جلیل ابو میسرہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ذکر اللہ تعالیٰ پاک جگہ میں کرنا چاہیئے۔ اور مستحب ہے کہ ذاکر کا منہ صاف ستھرا ہو پس اگر اس میں ذرا تغیر ہو (یعنی بدبو ہو) تو اس کو مسواک کے ذریعہ دور کرلے۔ اور اگر نجاست لگی ہو تو پانی سے دھوئے۔

---

[1] یہ حکم مخصوص اوراد و اذکار کا ہے۔ [2] مساجد سے مراد نماز کی جگہیں ہیں مسجد عرفی نہیں صاحب مرقاۃ المفاتیح نے مسجد کی تعریف یہی ذریعہ الصلوۃ بھی کی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے۔ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببناء المسجد فی الدور۔ اگر مسجد عرفی مراد ہو تو ذکر میں تخصیص اس کی ہوگی ترتی کے ساتھ۔ عام تھا کی بھی زمرے ہے۔

ورنہ ایسی حالت میں ذکر کرنا مکروہ ہے، ہاں حرام نہیں ہے۔ اگر منہ کی نجاست کی حالت میں قرأت قرآن کیا تو مکروہ ہے۔ مگر اس کی تحریم میں ہمارے اصحاب کے دو قول ہیں۔ ان میں اصح یہ ہے کہ حرام نہیں ہے۔

(فصل) یہ بات ذہن نشین کر لو کہ ذکر ہر حال میں محبوب ہے مگر جس کے استثناء کی شریعت نے تصریح فرمادی ہے۔ یہاں ان میں بعض کو ہم ذکر کرتے ہیں اور اس کے ماسوی کی طرف اشارہ کر دیں گے جو عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ ان کے ابواب میں مذکور ہوں گے۔

پس مستثنیات میں سے ایک موقع یہ ہے کہ جب قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہو تو ذکر کرنا مکروہ ہے۔ نیز مباشرت کی حالت میں ذکر اللہ مکروہ ہے۔ اور خطبہ کے وقت جب کہ وہ خطیب کی آواز کو سن رہا ہو اسی طرح نماز میں بحالت قیام ذکر مکروہ ہے اس لئے اس وقت اس کو قرأت قرآن میں مشغول ہونا چاہیئے[الف]۔ نیند آنے (اونگھ) کے وقت ذکر[ب] مکروہ ہے۔ ہاں راستہ میں یا حمام میں ذکر مکروہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(فصل) ذکر کا مقصود حضور قلب ہے۔ پس ذاکر کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تحصیل کی حرص کرے[۱] اور ذکر کے لفظ و معنی میں تدبر کرے اور اس کے معنی[۲] کو سمجھے۔ پس ذکر میں تدبر مطلوب ہے جیسا کہ قرأت میں مطلوب ہے اس لئے کہ دونوں مقصود کے لحاظ سے مشترک ہیں۔ اسی لئے مذہب صحیح اور مختار یہ ہے کہ ذاکر کے لئے لاالٰہ الا اللہ کے کہنے میں مد کا[۳] کرنا مستحب ہے اس لئے کہ اس طرح کہنے میں تدبر کا موقع ہے۔ اس کے بارے میں سلف اور ائمہ خلف کے اقوال مشہور ہیں۔ واللہ اعلم

الف اگر منفرد یا امام ہے تو خود قرأت کرے ورنہ امام کی قرأت حکماً مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی۔ بہرصورت ذکر نہ کرے۔

ب ذکر سے مراد ذکر لسانی ہے۔ ۱ یہ اس لئے کہ ذکر کامل نصیب ہو یعنی جو جامع ہو ذکر لسانی و قلبی ہر دو کو۔

۲ تاکہ ذکر کا کامل فائدہ حاصل ہو۔ اس لئے کہ ذکر کا ثواب موقوف ہے اس کے معنی کے سمجھنے پر بخلاف قرآن پاک کے۔

۳ الحرز الثمین میں فرمایا ہے کہ ایسی جگہ مد کرے جہاں مد کرنا جائز ہو جیسے لا کا الف۔ اس کو بھی پانچ الف سے زیادہ نہ کرے (الخ از حاشیہ اذکار)

(فصل) جس شخص کا رات میں یا دن کے کسی وقت میں، یا کسی نماز کے بعد یا کسی حال میں کوئی ذکر کا معمول ہو اور وہ فوت ہو جائے تو اسکا تدارک کرنا چاہیئے اس کو بالکل چھوڑنا نہیں چاہیئے بلکہ جب قدرت ہو اسکی قضا ضرور کر لینی چاہیئے اس میں سستی نہ کرے پس اس قضا کی ملازمت و عادت کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس وظیفہ کے فوت کرنے کی طرف اس کا قطعاً میلان نہ ہوگا۔ اور اگر قضا کا اہتمام نہ کریگا تو پھر وقت پر بھی وظیفہ ذکر کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور بے دریغ اس کو فوت کردیگا۔

صحیح مسلم میں حضرت عمر ابن خطاب سے روایت ہے کہ جو شخص اپنے کل یا بعض وظیفہ سے سو گیا پس اس نے فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان قضا کر لیا تو اللہ تعالے کے یہاں گویا رات میں ہی اس کو پڑھا ہے۔ لکھا جائے گا۔

(فصل) ان احوال میں جن کی وجہ سے ذکر کو منقطع کرنا مستحب ہے۔ اور ان کے زوال کے بعد ذکر کی طرف لوٹ آنا چاہیئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس کو سلام کہا جائے۔ تو اس کا جواب دے، پھر ذکر میں لگ جائے۔ اسی طرح اگر کوئی اس کے پاس چھینک دے تو (اور وہ الحمد اللہ کہے) تو اس کا جواب (یرحمک اللہ سے) دے کر ذکر میں مشغول ہو جائے اسی طرح جب خطیب سے خطبہ سنے یا موذن سے اذان یا اقامت سنے تو اذان و اقامت کے کلمات کا جواب دے پھر اپنے ذکر میں لگ جائے۔ اسی طرح اگر بحالت ذکر کسی منکر کو دیکھے تو اس کو زائل کرے یا معروف دیکھے تو اس کی طرف رہبری کرے۔ یا کوئی طالب رشد و ہدایت آجائے تو اس کا جواب دے کر ذکر کرنے لگے اسی طرح اگر نیند یا اس کے مثل کسی شی کا غلبہ ہو جائے تو ذکر کو موقوف کر دے۔

(اذکار ص۱۵)

کفالت

مجیب اللہ ہادی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس کو کوئی چیز ادھار خریدنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور وہ لے لیتا ہے مگر اس کو ادائیگی کی استطاعت نہیں ہوئی۔ قرض خواہ پریشان کر رہا ہے تو اس تقاضے سے بچنے کے لئے دوسرے آدمی کو بطور ضمانت پیش کرتا ہے اور وہ دوسرا آدمی یہ ذمہ داری لے لیتا ہے، کہ اگر اس نے نہ دیا تو میں دونگا، اب قرض خواہ کو کچھ اطمینان ہو جاتا ہے کہ میرا روپیہ مارا نہیں جائے گا، اسیطرح ایک مجرم ہے جسکو عدالت اس وقت تک قید رکھنا چاہتی ہے جبتک اسکے جرم کی تحقیق نہ ہو جائے، اب وہ مجرم ایک آدمی کو بطور ضمانت پیش کرتا ہے اور عدالت اسکی ضمانت مان کر اسکو رہا کر دیتی ہے کہ جب ضرورت ہوگی ضامن حاضر کر دیگا۔ اس طرح کچھ دنوں کے لئے وہ آزاد ہو جاتا ہے،

ایک شخص کا انتقال ہوتا ہے اور وہ اپنے بال بچوں کی نگہداشت اپنے کسی دوست یا عزیز کے سپرد کر دیتا ہے، اب کفیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسکی کفالت کا حق پورا پورا ادا کرے۔ اسیطرح کی ضمانت لینے کو شریعت میں کفالت کہتے ہیں، کفالت کا ذکر قرآن و حدیث دونوں میں ہے[1]۔ قرض کے سلسلہ میں آچکا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے ایک مقروض صحابی کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ مگر جب بیت المال میں فراخی آگئی تو آپؐ نے فرمایا کہ ہر مقروض کے قرض کی کفالت بیت المال کے اوپر ہے۔

تعریف | کسی مال کی ادائیگی یا کسی شخص کے وقت پر حاضر کر دینے کی ذمہ داری لینے کو کفالت کہتے ہیں۔

اصطلاحات | ا۔ کفیل:۔ ذمہ داری لینے والے شخص کو کہتے ہیں۔ اسکی حیثیت امین کی ہوتی ہے (۲) اصیل یا مکفول عنہ:۔ جسکے ذمے رقم باقی ہو اور وہ کسی کو کفیل بنائے۔ (۳) مکفول لہٗ:۔ جسکا مطالبہ یا قرض باقی ہو (۴) مکفول بہ:۔ وہ مال یا وہ شخص جسکی کفالت کی گئی ہو۔

---

[1] قرآن میں ہے وکفلھا زکریا۔ اور حدیث میں ہے الزعیم غارم یعنی کفیل ضامن ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انا وکافل الیتیم فی الجنۃ کہاتین۔ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ساتھ ہوں گے

کفالت کا طریقہ کفالت کا طریقہ یہ ہے کہ کفیل، مکفول لہٗ یعنی حقدار سے کہے کہ آپ کی جو رقم یا جو مال فلاں کے ذمّہ باقی ہے اس کا میں ذمّہ دار ہوں تو اب اس کی ذمہ داری ہو گئی اب اگر اصیل یعنی قرضدار اس کو ادا نہ کرے تو اس کے ادا کرنے کی ذمّہ داری کفیل پر ہو گی اس کی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ مطلقاً یہ ذمّہ داری لے لے کہ میں اس کو ادا کروں گا، تو اب حقدار چاہے کفیل سے مطالبہ کرے یا اصیل سے اس کو دونوں کا حق ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کہا کہ اگر اس نے نہ دیا تو میں دوں گا تو مکفول لہٗ یعنی حق دار پہلے اصیل سے مطالبہ کرے اگر وہ ادا نہ کرے تو اس کے بعد پھر کفیل سے مانگے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مکفول لہٗ نے اصیل کو ایک ماہ کی مہلت دی ہے یا ایک سال کے وعدہ پر اس نے قرض دیا، تو وہ ایک ماہ تک یا ایک سال کفیل سے مطالبہ نہیں کر سکتا، اس مدّت کے بعد تو وہ کفیل سے مطالبہ کر سکتا ہے۔

کفالت کے صحیح ہونیکے شرائط (۱) کفالت اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے، جب کفیل اور اصیل دونوں عاقل اور بالغ ہوں۔

۲۔ اگر مکفول بہ کوئی شخص ہے تو اس کا نام پتہ اچھی طرح معلوم ہونا چاہئیے، لیکن اگر مکفول بہٖ مال ہے تو اس کی مقدار کا معلوم ہونا اور بتانا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ میں فلاں کے قرض کا ذمہ دار ہوں یا فلاں مال کا ذمہ دار ہوں۔

۳۔ مکفول بہ یعنی وہ مال ایسا ہو کہ اصیل خود اس کا ضامن بن سکے، اب اگر کوئی رہن رکھی ہوئی چیز یا عاریۃً لی ہوئی چیز میں کفالت کرے تو صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مرتہن اور مستعیر پر اس کے تلف ہو جانے کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے، راہن اور عاریت دینے والے کو خود سمجھ بوجھ کر دینا چاہیئے کسی کو کفیل بنانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح امانت و ودیعت میں بھی کفالت صحیح نہیں ہے۔ (المجلہ ص ۹۲)

کفیل کی ذمّہ داریاں (۱) اگر کفیل نے کسی شخص کی ضمانت لی ہے تو وقت مقررہ پر اس کو حاضر کرنا ضروری ہو گا، اگر اس نے حاضر نہ کیا تو اس وقت تک وہ قید کر لیا جائیگا۔

جب تک وہ اس کو حاضر نہ کرا دے، یہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہا اللہ کی رائے ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے حاضر نہ کیا تو اس کو سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اس سے کچھ مال بطور تاوان لیا جائے گا۔

۲۔ اگر کفیل یا اصیل یعنی جس کی کفالت کی ہے وہ مر جائے تو کفالت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔

۳۔ لیکن اگر مکفول لہٗ یا مدعی مر جائے تو اس کی کفالت ختم نہیں ہو گی۔

۴۔ حدود و قصاص اور سزا میں کسی کی نیابت و کفالت صحیح نہیں ہے، یعنی کسی کی سزا دوسرا نہیں بھگت سکتا۔

مالی کفالت کے سلسلہ میں کفیل کی ذمہ داریاں

(۱) کفیل کفالت کے مال کا ضامن ہوتا ہے یعنی اصیل ادا نہ کرے گا تو اس کو دینا پڑے گا۔

۲۔ حقدار یعنی مکفول لہٗ چاہے اصیل سے مطالبہ کرے چاہے کفیل سے چاہے دونوں سے کسی ایک کے مطالبہ کرنے میں اس کا حق دوسرے کے بارے میں ختم نہیں ہوتا۔

۳۔ اگر چند آدمیوں نے مل کر قرض لیا مگر اسمیں کوئی ایک آدمی ذمہ دار ہے تو صرف ذمہ دار ہی سے اس مشترک قرض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ ان میں سے پوری رقم کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک آدمی نے ذمہ داری ضرور لی ہے مگر وہ ذمہ داری اس نے سب کے لئے لی ہے، محض اپنی ذات کے لئے نہیں لی ہے۔

۴۔ اگر ایک کے بجائے کئی آدمی کسی کے کفیل بن جائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ الگ الگ دو یا تین آدمیوں نے کہا کہ ہم اس کے کفیل ہیں، تو مکفول لہٗ ان میں سے ہر ایک سے پوری رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر اکٹھا ذمہ داری لے لی کہ فلاں کے قرض کے ہم ذمہ دار ہیں تو ان میں سے ہر ایک پر وہ قرض بانٹ دیا جائے گا، اور جس کے حصہ میں جتنا آئے گا، ان سے وہ وصول کیا جائے گا، مثلاً خالد کے ایک ہزار روپے احمد کے ذمہ باقی ہیں، احمد کے چار دوستوں نے الگ الگ خالد سے کہا کہ اگر احمد نے نہ دیا تو ہم اس کے ذمہ دار ہیں تو خالد ان میں سے جس سے

چاہے ایک ہزار روپیہ مانگ سکتا ہے، لیکن اگر وہ چاروں دوست ساتھ آئے اور انھوں نے مل کر خالد سے کہا کہ ہم سب ایک ہزار کے ذمہ دار ہیں، تو اب ہر ایک کے ذمہ ڈھائی سو روپیہ کی کفالت ہوئی خالد انہیں سے ہر ایک سے ڈھائی سو روپے کا مطالبہ کر سکتا ہے، کسی ایک سے ایک ہزار کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۵۔ اگر کفیل نے اپنے پاس سے دینے کی ذمہ داری نہیں لی، مگر یہ کہا کہ میرے پاس مقروض کی امانت رکھی ہوئی ہے اگر وہ نہ دے گا تو میں اس کی امانت سے دے دوں گا تو اب وہ کفیل ہوگیا اور اب وہ امانت سے حقدار کا روپیہ دینے پر مجبور ہے، اگر یہ امانت اس کے پاس سے چوری ہو گئی یا کسی طرح ضائع ہو گئی، تو اب کفیل پر ذمہ نہیں ہے، لیکن اگر اس نے کفالت کرنے کے بعد وہ امانت رکھانے والے کو واپس کر دی، تو پھر اس کو اپنے پاس سے وہ رقم دینی ہوگی۔

۶۔ اگر کفیل نے کسی شخص کو عدالت میں حاضر کرنے کی ضمانت لی اور اس شخص کے ذمہ عدالت کا کوئی مطالبہ ہے تو اگر وہ وقت پر حاضر نہ کر سکا تو اس مطالبے کے ادا کرنے کی ذمہ داری کفیل پر ہوگی۔ جو دین کہ مُعجّل ہو یعنی اس کی ادائیگی بروقت کرنی ہو اس کی کفالت بھی مُعجل ہوگی اور جو دین کے مُوجّل ہو یعنی اس کی ادائیگی کے لئے ایک یا دو ماہ یا سال کا وقت مقرر ہو تو اس کی کفالت بھی موجّل ہوگی، غرض یہ کہ جن قیود کے ساتھ قرض یا بقایا ہوگا اسی قید کے ساتھ کفیل کی ذمہ داری ہوگی۔

۷۔ اگر مکفول لہٗ یعنی حق دار نے اصیل کو ادائیگی کی ایک مقررہ مدت دے رکھی ہے اور اس قرض کی کسی نے کفالت کر لی، مگر ادائیگی سے پہلے اصیل اپنے وطن سے دور کہیں باہر جانا چاہتا ہے اور واپسی کی مدت مقرر نہیں ہے تو اگر مکفول لہٗ نے حکومت کے سامنے درخواست دی کہ میرا قرض اسی وقت مل جانا چاہیئے تو کفیل قانونی طور پر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ روپیہ دے کر باہر جائے۔

۸۔ کفیل نے جس طرح کی چیز کفالت میں ادا کی ہے اسی طرح کی چیز وہ اصیل سے واپس لے سکتا ہے، خواہ اس نے دائن یعنی مکفول لہٗ کو اچھی چیز دی ہو یا بری مثلاً اس نے ایک

من لال گیہوں کی ضمانت لی، اور اس نے ایک من سفید گیہوں دائن کو دیا تو اب کفیل اصیل سے سفید گیہوں نہیں لے سکتا، بلکہ لال ہی گیہوں لے گا، اس لئے کہ اسکی کفالت اس نے لی تھی اب اگر اس نے اپنی مرضی سے اچھا دے دیا تو اس کی ذمہ داری اصیل پر نہیں ہے اسی طرح اس کے برعکس، یعنی اگر اس نے خراب دیا اور مکفول لہ نے لے لیا تو کفیل اصیل سے وہی وصول کرے گا، جس کی اس نے کفالت لی ہے۔

۹۔ مالی کفالت میں کفیل یا اصیل یا دائن کے مرنے کا کوئی اثر کفالت پر نہیں پڑتا ہے کفیل کو بہرحال ادا کرنا ہوگا، اگر نہ ادا کرے گا تو اس کے ترکہ سے وہ وصول کیا جائے گا۔

کفالت کن چیزوں میں ہوسکتی ہے (۱) جس طرح جان و مال کی ادائیگی اور حاضری کی ضمانت و کفالت صحیح ہے، اسی طرح نقل و حمل کی بھی کفالت صحیح ہے،

ریلوے ضامن ہے (۲) جو لوگ ریل سے سفر کرتے ہیں انھوں نے جہاں تک کا ٹکٹ لیا ہے، یا اپنا مال جہاں لے جانے کے لئے بک کرایا ہے ریلوے اس مقام تک پہنچانے کی ذمہ دار یعنی کفیل ہے، اب اگر گاڑی ٹھہر جائے یا گر پڑے اور مسافروں کی جان یا مال کا نقصان ہو جائے، یا ان کا ٹکٹ ریل کے حادثہ میں گم ہو جائے، تو اس کے نقصان کی تلافی ریلوے کو کرنی ہوگی، اور اس کو بغیر ٹکٹ اس مقام تک پہنچانا ہوگا اگر وہ اسکی تلافی نہ کرے تو قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، البتہ اگر کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ بلا ٹکٹ تھا تو اس کو پہنچانے کی کوئی ذمہ داری ریلوے پر نہیں۔

۳۔ اسی طرح جو مال یا سامان تاجر ریلوے کے ذریعہ منگاتے ہیں یا بھیجتے ہیں، ان سب کی ذمہ داری ریلوے پر ہے یعنی اگر وہ گم ہو جائے یا ٹوٹ پھوٹ جائے تو اس کے نقصان کا ہرجانہ ریلوے کو دینا ہوگا اگر وہ نہ دے تو مال بھیجنے والا قانونی کارروائی کے ذریعہ لے سکتا ہے، اس کو شریعت میں اَلْکِفَالَۃُ بِالتَّسْلِیْم (کفالت نام ہے سپرد کر دینے کا) کہتے ہیں۔

ڈاکخانہ بھی کفیل ہے اسی طرح جو خطوط، رجسٹری، منی آرڈر، بیمے، پارسل، ڈاکخانہ کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں، ڈاکخانہ ان سب کا کفیل ہے یعنی اگر وہ گم ہو جائیں

اور ان کا ثبوت مل جائے تو ڈاک خانہ کو ان کا ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کو اَلْکَفَالَۃُ بِالدَّرْکِ (کفالت نام ہے پا جانے کا، کہتے ہیں۔

کسی چیز کے پہنچانے کا بیمہ اسی طرح اگر کوئی جہاز راں کمپنی یا بیمہ کمپنی اس بات کی ذمہ داری لے کہ یہ مال فلاں جگہ پہنچا دے گی اور اتنی فیس لے گی اور اگر مال ضائع ہوگیا تو اس کا تاوان اس کے ذمہ ہوگا، تو یہ بیمہ جائز ہے، جہاز راں کمپنی یا بیمہ کمپنی اس کا ذمہ دار ہوگی، البتہ جہاز راں کمپنی اور بیمہ کمپنی کی ذمہ داری میں تھوڑا سا فرق ہے، جہاز راں کمپنی بعض صورتوں میں اجیر مشترک اور بعض صورتوں میں امین بالاُجرت ہوتی ہے، اور بیمہ کمپنی ہر حال میں کفیل ہوگی۔

ضروری ہدایتیں مگر اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ جتنا مال ہو صحیح صحیح اتنا ہی درج کرایا جائے، اگر اس نے غلط طور پر زیادہ مال دکھایا تو گناہ گار ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اس پر جان و مال کے اس بیمہ کو قیاس نہ کیا جائے جو آج کل عام طور پر رائج ہے، اس کی حقیقت سود و قمار ہے، جس کی تفصیل سود کے بیان کے سلسلہ میں آچکی ہے۔

مردہ کی طرف سے کفالت اگر کوئی مقروض مر جائے، اور اس کے قرض کی ذمہ داری مرنے کے بعد دوسرا آدمی لے لے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں، اس بارے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ ترکہ میں کچھ چھوڑ گیا ہے تب تو اس کی کفالت صحیح ہے، اگر نہیں کچھ چھوڑ گیا ہے تو اس کی کفالت صحیح نہیں ہے، یعنی کفیل کو ادا نہ کرنا پڑے گا۔ مگر دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ مردہ کی طرف سے بھی کفالت جائز ہے اس کے ثبوت میں یہ حضرات یہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے مردہ مقروض کی ذمہ داری لی تھی، اور آپؐ نے ان سے ادا کرایا تھا حالانکہ اس مردہ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا، اور یہ اس لئے بھی جائز ہونی چاہیئے کہ مردہ کے مقروض کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ " جب تک مردہ کا قرض

ادا نہیں کیا جاتا وہ ایک قیدی کے مانند پابند رہتا ہے،، اس صورت میں ایک مسلمان اگر اس کو اس قید سے نجات دے دیتا ہے یہ انتہائی مناسب بات ہے۔

باب الاستفسار والجواب

از مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی، دار الافتاء جامعۃ الرشاد

(۱) سوال ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں:۔

۱۔ زید کے گاؤں کی مسجد کی مشین گم ہوگئی، چند افراد نے غیر مسلم پنڈت کے علم اور کٹورا چلانے پر اعتقاد کرتے ہوئے مسجد کے اندر پوجا پاٹ کرایا۔

۲۔ جتنے آدمی اس پوجا پاٹ اور کٹورا چلانے میں شریک تھے ان کے بارے میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی
محمد اسلم
سون بزرگ، روناپار، اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب

۱۔ نام نکالنے والے پنڈت کو مسجد میں بلانا اور اس کی باتوں کی تصدیق کرنا شرعاً فعل کفر ہے، فی الحدیث من اتی کاھنا او عرافا فصدقہ بما یقول فقد کفر بما أنزل علی محمد اخرجہ اصحاب السنن الأربعۃ وصححہ الحاکم، عن ابی ھریرۃ (الی قولہ) والعراف المنجم وقال الخطابی ھو الذی یتعاطی معرفۃ مکان المسروق والضالۃ ونحوھما، (شامی ص۲۹۷ ج ۴)

پس صورت مسئولہ میں جتنے لوگ عمل کروانے والے شریک ہیں وہ سب دو گنا کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایک عراف کی باتوں کی تصدیق دوسرے مسجد کی بے حرمتی کے اسباب کو مہیا کرنا، اس لئے یہ تمام لوگ عند اللہ مجرم اور گنہگار ہیں، ان سب پر توبہ اور استغفار ضروری ہے اور اگر کچھ مالی صدقات کر دے تو بہتر ہے۔ صدقات سے خدا کا غضب ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ان

حرکتوں کی وجہ سے یہ لوگ کافر نہیں ہوتے ہیں۔ ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں حدیث بالا کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حکم کفر اس کے واسطے ہے جو حلال سمجھ کر کیا ہو، یہاں ڈرانے اور دھمکانے کے لئے کافر کہا گیا۔ ای کفر وھو محمول علی الاستحلال او علی التھدید والوعید۔ ص ۵۳۱ ج ۴

۲۔ اور اگر پوجا پاٹ میں مسلمان عملاً شریک ہوئے تو پھر تمام لوگ دائرۂ ایمان سے نکل چکے ہیں ان لوگوں پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

محمد حبیب الرحمٰن غفرلہٗ

۲۳ر ۱۲ر ۱۴۰۴ھ

(۲) سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ذیل کے مسئلہ میں:۔

۱۔ وہ یہ کہ زید ایک مسجد پر عرصہ سے پنج وقتہ نماز کا امام ہے عرصہ پانچ چھ سال کا ہو رہا ہے ان کے خلاف ایک استفتا، مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور روانہ کیا گیا تھا جواب استفتا، موصول ہوا کہ امامت سے علٰحدہ کر دیا جائے ان کی اقتداء میں نماز واجب الاعادہ ہوگی مقتدیوں نے بہت کوشش کیا کہ امام صاحب کو اس منصب سے علٰحدہ کر دیا جائے مگر امام صاحب اس منصب سے ہٹنے کو بالکل تیار نہیں ہوئے اور جو بھی ان سے ہٹنے کو کہتا ہے اس سے جھگڑا کر بیٹھتے ہیں۔ ہنوز مسائل کے جاننے والے مقتدیان امام صاحب کی اقتداء نہیں کر رہے ہیں اور جماعت کثیرہ منتشر ہو گئی ہے معدودے چند افراد جو علم دین سے بالکل بے بہرہ ہیں ان کی اقتدا کر رہے ہیں۔

۲۔ یہ کہ مقتدیان کے مشورے سے ابھی حال میں ایک دوسرے امام کا انتخاب کیا گیا اور امام صاحب نے بھی اس مشورہ سے اتفاق کیا منتخب امام نے ابھی دو ہی وقت کی نماز پڑھایا تھا تو امام صاحب مذکور سابق چند مقتدیوں سے بحث مباحثہ وغیرہ جھگڑا فساد کرنے کو تیار ہوئے کہ یہ ہمارے خاندان کی بنوائی ہوئی مسجد ہے اسمیں کوئی دوسری جگہ کا امام امامت نہیں کر سکتا اور میں اس منصب سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوں اور ٹائم مقررہ سے پہلے مصلی پر پہونچ جاتے ہیں۔ جب کوئی جید عالم دین اتفاق سے کبھی اس مسجد میں آجاتے ہیں تو تمام مقتدیوں کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ صاحب جو آئے ہوئے ہیں نماز پڑھائیں مگر امام صاحب ٹس سے مس نہیں ہوتے اور مصلے پر قبل از وقت پہنچ جاتے ہیں تمام مقتدیوں کو ان کے اس قسم کے فعل سے سخت نفرت ہو گئی ہے یہ اپنی ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہیں کہ

میں ہی نماز پڑھاؤں گا۔ بایں صورت از روئے شرع یہ دریافت ہے کہ ایسے امام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے یانہیں ؟

فقط والسلام

سائل حکیم اللہ الاعظمی القاسمی

مقام ماہ پور، پوسٹ کرہاں، اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب

شریعت میں جماعت کی کثرت اور زیادتی مطلوب اور پسندیدہ ہے اسوجہ سے امامت کے لئے امام کا صحیح العقیدہ، زیادہ جاننے والا، زیادہ متقی ہونا بہتر قرار دیا گیا چونکہ اس طرح کے امام کی وجہ سے جماعت اور مصلیوں کی کثرت ہوگی، شامی میں ہے (والاحق بالامامۃ الاعلم باحکام الصلوٰۃ صحۃ وفسادا بشرط اجتنابہ للفواحش الظاھرۃ (الی قولہ) ثم الاورع ۔ اور ایسا امام جو تقلیل جماعت کا باعث ہے (مثلاً فاسق، مبتدع وغیرہ) اسکی امامت کو مکروہ کہا ہے کہ اس میں تقلیل جماعت کا خطرہ ہے۔

ویکرہ امامۃ عبد (الی قولہ) وفاسق ومبتدع ۔ نیز ایسا امام جسکی امامت سے مقتدیوں کو دینی خرابی کی بنیاد پر ناراضی ہو اس کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اس نماز کو حق تعالےٰ قبول نہیں فرماتے ہیں ۔ ولو ام قوما وھم لہ کارھون ان الکراھۃ بفساد فیہ (الی قولہ) کرہ تحریما لحدیث ابی داؤد لا یقبل اللہ صلوٰۃ من تقدم قوما وھم لہ کارھون (درمختار ص ۳۷۶ ج۱)

بلکہ اگر امر مباح کی وجہ سے نمازیوں میں اختلاف وانتشار کا اندیشہ پیدا ہو تو اس صورت میں بھی جماعتی مصلحت کی خاطر امام کو اس امر مباح پر عمل نہیں کرنا چاہیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز میں لمبی قرأت کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بعض مقتدیوں کو تکلیف ہوتی تھی جب اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے سختی کے ساتھ حضرت معاذ بن رضی اللہ عنہ کو منع کیا اور فرمایا کہ معاذ مصلیوں کے درمیان فتنہ نہ پیدا کر داس تمہید کے بعد امام صاحب اگر فاسق ہیں یعنی گناہ کبیرہ کے مرتکب یا صغائر کے عادی ہوں تو وہ امامت کے لائق نہیں ان کی اقتداء میں نماز

مکروہ تحریمی ہوتی ہے۔

لہٰذا ایسے امام کو فوراً امامت سے معزول کردینا ضروری ہے امامت وراثت کی بنیاد پر نہیں ملتی بلکہ صلاحیت اور اہلیت کی وجہ سے ملتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(مولانا) محمد حبیب الرحمٰن غفرلہٗ

دارالافتاء جامعۃ الرشاد

۲۴ ر ۱۲ ر ۱۴۰۴ھ

علم کا شوق

مناقب موفق میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے کسی بچہ کا انتقال ہوگیا، مگر وہ اس کے جنازہ اور تدفین میں اس لئے شریک نہ ہو سکے کہ مبادا امام صاحب کے درس و املا کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے، خود فرماتے ہیں:۔

مَاتَ اِبْنٌ لِي فَلَمْ احضر جهازه ولا دفنه وتركته على جيراني واقربائي مخافة ان يعوتني من ابي حنيفة شيئ ولا تذهب حسرته عني،

(ج ۲ ص ۲۱۵)

میرے ایک بچہ کا انتقال ہوگیا، لیکن میں اس کی تجہیز و تدفین میں شریک نہیں ہوا، اور اس کو اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امام ابوحنیفہ کے درس کا کوئی حصہ چھوٹ جائے اور مجھے اس کی حسرت رہ جائے،

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کو علم دین کا کتنا ذوق اور ~~کتنا~~ شغف تھا، اور امام صاحب کی مجلس درس کی ان کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت تھی،

(تبع تابعین ج ۱ ص ۱۰)

الرشاد کی ڈاک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب ! سلام مسنون

گرامی نامہ ۲۳ جولائی کو ملے ایک عرصہ ہوچکا ہے۔ جواب لکھنے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوگئی۔ حیدرآباد میں ۲۲ جولائی کی شب سے ایک ہندو نہوار کے بہانے فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ابھی تک جاری رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ پولیس کرفیو نافذ کردیتی چنانچہ ۲۲ جولائی کی شب سے جو کرفیو نافذ کیا گیا تو اسمیں چند روز کے وقفے کے سوا، کل شب تک جاری رہا۔ میں حالات کی خوشگواری کا منتظر تھا کہ آپ کے خط کا جواب لکھوں، سو وہ ابھی تک صحیح طور پر میسر نہیں ہے۔ ان فسادات کے علاوہ ریاستی سیاست میں ایک ایسا بھنور پیدا ہوچلا ہے کہ تمام حالات کو معمول پر آنے نہیں دیتا۔ ہندوستان میں جمہوریت ایک خواب پریشان معلوم ہوتی ہے، آج کے اخبارات میں ضلع اعظم گڈھ کے بعض علاقوں میں فساد کی خبر چھپی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

آپ نے میری والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر پاکر اپنے خط میں جن گہرے احساسات کا اظہار فرمایا ہے، میرا قلب حزیں ان پر تڑپ اٹھا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے میری والدہ مرحومہ، مجھے اور میرے خاندان کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھا۔ آپ کی تحریر کو پڑھکر دوسرا تاثر یہ ابھرا کہ ابھی مکتب و خانقاہ میں سلیقۂ دل نوازی باقی ہے۔

آپ کی حیدرآباد تشریف آوری ہمارے لئے باعث برکت ہوگی۔ میں حالات کو سازگار پاکر آئندہ آپ کے دورہ کا پروگرام بناؤں گا اور آپ کو اس کی اطلاع بہت پہلے کردی جائے گی۔ آج کل حیدرآباد میں طوفانی بارش ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ مہینہ بارش کا نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ اواخر دسمبر یا ابتدائے جنوری ۱۹۸۵ء کا زمانہ بہت موزوں رہے گا۔

آپ اپنی دعاؤں میں شہر حیدرآباد کو بھی شامل فرمالیں۔ کیونکہ یہاں ۹ ستمبر سے شروع ہونے والے فساد میں جس عظیم پیمانہ پر مالی و جانی نقصان ہوا ہے اس کی مثال پچھلی فسادات

بقیہ صـ۵۴ پر

کوائف جامعۃ الرشاد

مدرسہ کے ایک پرانے کرمفرما جناب حاجی عین الحق صاحب جو ایک مدت تک اعظم گڈھ میں رہ چکے ہیں اور ان کے صاحبزادے مولوی مظفر الحق صاحب ندوی بہت دنوں سے راقم الحروف سے اپنے پرانے تعلق کی بنا پر برابر کانپور آنے کی دعوت دے رہے تھے اور وہ خود کئی بار جامعۃ الرشاد آچکے ہیں، مجھے ان حضرات سے کانپور جاکر ملنے کا شوق ایک مدت سے تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا صدیق احمد مدظلہٗ سے ملاقات اور ان کا مدرسہ دیکھنے کا اشتیاق بھی ایک مدت سے تھا، مگر اس کی نوبت برسوں کے بعد آئی عید الاضحیٰ کے چند دن پہلے کان پور اور ہتھوڑا دونوں جگہ کے سفر کے ارادہ سے اعظم گڈھ سے نکلنے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر اعظم گڈھ سے براہ راست کانپور کے لئے ہو سکتا تھا۔ مگر حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کی زیارت کی غرض سے لکھنؤ جانے کے بجائے براہِ الٰہ آباد گیا۔ الٰہ آباد دو روز حضرت مولانا کی خدمت میں رہکر پھر ہم لوگ کان پور کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں چوبیس گھنٹے قیام رہا۔ حاجی صاحب اور ان کے متعلقین خاص طور پر مولوی مظفر الحق صاحب بڑی محبت سے ملے۔ اور پورا حق ضیافت ادا کیا، حاجی صاحب نے لڑکیوں کے لئے جو مدرسہ جامعۃ الزہرا کے نام سے قائم کیا ہے اسے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کانپور جیسی جگہ میں جہاں کاروباری ذہنیت، افادیت پسندی اور خود نمائی نے سب کو اتنا منہمک کر رکھا ہے کہ ان کے پاس نہ تو قومی و ملی کاموں کے لئے وقت ہے اور نہ پیسہ۔ ایسی جگہ میں حاجی صاحب کا لڑکیوں کے لئے ایک دینی مدرسہ قائم کرنا اور اس کے لئے وقت اور پیسہ خرچ کرنا انتہائی قابل قدر ہے۔ کانپور تک رفیق سفر میرے چھوٹے لڑکے محمد عامر رشادی تھے مگر کان پور سے اس قافلہ میں مولوی مظفر الحق صاحب کے علاوہ ان کے ایک اور عزیز بھی شامل ہو گئے، حاجی صاحب اور مولوی مظفر الحق کی گراں بائی کی وجہ سے کانپور سے ہتھوڑا کا سفر ان کی ذاتی کار سے ہوا۔ ہم لوگ اول وقت میں فجر کی نماز پڑھکر ہتھوڑا ضلع باندہ کے لئے روانہ ہوئے، اور کئی جگہ ٹھہرتے ہوئے تقریباً دس بجے ہتھوڑا پہونچے، جاتے ہی ایک طالب علم سے

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مدظلہ کی موجودگی کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ طالب علم مذکور اثبات میں جواب دے کر ان کو اطلاع دینے کے لئے بڑھا کہ اسی اثنا میں مولانا کی نظر ہم لوگوں پر پڑ گئی، غالباً وہ درس دے رہے تھے مگر درسگاہ سے اتنی تیزی سے ہم لوگوں کی طرف بڑھے کہ پیر میں چپل بھی نہ پہن سکے، ان کی اس محبت، تواضع اور عزت افزائی سے قلب متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ ہم لوگ شرمندگی میں ڈوب گئے پہنچتے ہی میں نے مولانا سے عرض کر دیا کہ صرف آپ کی اور مدرسہ کی زیارت کے لئے حاضر ہو گیا ہوں، اور ڈیڑھ بجے تک ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے، انشاء اللہ پھر اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ اسی کے مطابق مولانا نے ضیافت کا انتظام کر دیا۔ ناشتہ کے بعد تفصیل سے مدرسہ کے تمام شعبے ایک استاذ کی نگرانی میں مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ کتب خانہ کے لئے دو بڑے ہال زیر تعمیر ہیں۔ جب وہ مکمل ہو جائیں گے تو امید ہے کہ اور شعبوں کے ساتھ مدرسہ کا کتب خانہ قابل ذکر ہو جائے گا۔

مدرسہ عربیہ ہتھوڑا میں گو راقم الحروف چند گھنٹے رہا مگر چند گھنٹے کے قیام میں قلب و روح کو جو تازگی اور انشراح نصیب ہوا وہ بہت دنوں تک یاد رہے گا۔ سادگی و تواضع ہمارے طبقۂ علماء میں جنس نایاب ہوتی جا رہی ہے وہ مولانا صدیق احمد صاحب مدظلہ میں پورے طور پر نظر آئی۔ پھر ان کے روحانی اثر سے اساتذہ اور طلبہ میں بھی وہی کیفیت نظر آئی۔

راقم الحروف بھی ایک مدرسہ سے وابستہ ہے اس لئے بہت سی باتیں اس نے وہاں سے اخذ کی ہیں۔ انشاء اللہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اپنی طرف سے کچھ مخلصانہ مشورے بھی پیش نظر تھے مگر اب انہیں کسی دوسری ملاقات پر اٹھا رکھا گیا ہے۔

ہتھوڑا سے ہمارا قافلہ تقریباً سوا بجے روانہ ہو کر ڈھائی بجے کے قریب فتح پور پہونچا، وہاں سے بذریعۂ ٹرین ہم لوگوں کو الہ آباد جانا تھا اور مولوی مظفر الحق صاحب وغیرہ کو کانپور جانا تھا۔ ٹرین میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر تھی، اس لئے خیال ہوا کہ فتح پور کے مشہور عالم مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ سے بھی ملاقات کر لی جائے۔ چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن سے سیدھے ان کے مکان روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی اور ان کے دولت خانہ پہ جا کر چائے پی۔ ادھر ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ مولانا بھی پرانے بزرگوں کی یادگار ہیں۔ اتنی مختصر ملاقات کا مولانا کو بھی افسوس تھا۔

اور خود مجھے بھی شرمندگی تھی مگر بادل ناخواستہ ہم لوگ وہاں سے واپس آئے اور پھر الٰہ آباد آکر دوسرے دن حضرت مولانا پرتاب گڈھی کی اجازت کے بعد ہمارا قافلہ اعظم گڈھ واپس آگیا۔
اس سفر کو دو ماہ ہو گئے مگر دو ماہ بعد بھی اس پرکیف سفر کی یاد سے دل میں ایک سرور پیدا ہو جاتا ہے۔

الہ آباد میں میرے بڑے بھائی کے خویش نہال احمد صدیقی جو ریلوے میں گارڈ ہیں اور میرے بھانجے منیر عالم صدیقی جو گورنمنٹ کالج میں لکچرر ہیں اس سفر میں ان کی پُر محبت ضیافت بھی قابل قدر تھی، نہال احمد صدیقی نے تو اس ضیافت میں حضرت مولانا پرتابگڈھی مولانا قمر الزماں صاحب اور مولانا عمار احمد صاحب اور بعض دوسرے علماء کو بھی بلا لیا تھا جس سے یہ ضیافت بڑی پرکیف بن گئی تھی۔

بقیہ الرشاد کی ڈاک ص ۵۱

کی نار یخ میں نہیں ملتی۔ یہاں کے سب سے بڑے بازار عابد روڈ پر مسلمانوں کی دوکانات کو چن چن کر جلا کر خاک بنا دیا گیا۔ ان میں سے بعض دوکانیں ایک ایک کروڑ روپئے کی تھیں میں نے ایک خط اپنے ہمدم دیرینہ شبنم سبحانی صاحب (مقیم سلطان پور) کو بھی لکھ دیا ہے۔

والسلام
آپ کا مخلص
وحیدالدین۔ حیدرآباد
۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

نئی کتابیں

۱۔ آداب المتعلمین، ۲۔ آداب المعلمین، ۳۔ فضائل نکاح، ۴۔ حق نما، ۵۔ تسہیل النحو، ۶۔ تسہیل الصرف اول، دوم، سوم، ۷۔ تسہیل المنطق

یہ کتابیں حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ کی تصنیف کردہ ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔ آداب المتعلمین اور آداب المعلمین کو تو ہر طالب علم اور استاذ کو حرز جان بنالینا چاہیئے۔ مولانا نے صرف ونحو اور منطق کے مسائل کو تسہیل الصرف، تسہیل النحو اور تسہیل المنطق میں جس سہل انداز میں اور عملی مشق کے ساتھ سمجھایا ہے وہ خصوصیت کم کتابوں میں ملتی ہے۔ یہ کتابیں درس میں داخل کرنے کے لائق ہیں۔ بحمداللہ ان میں سے ایک کتاب تسہیل المنطق جامعۃ الرشاد میں داخل نصاب کرلی گئی، اور دوسری کتابیں زیر غور ہیں۔

امید ہے کہ مولانا موصوف کی علمی سرگرمیوں کے ساتھ ان کی علمی کاوشیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

۸۔ مفتاح السعادہ | تصنیف:۔ شیخ الاسلام ابن القیم جوزی، ترجمہ:۔ حاجی مولوی شمس الدین صاحب انصاری الٰہ آبادی، صفحات ۱۵۲، کتابت وطباعت عمدہ، قیمت:۔ ۵ روپے ملنے کا پتہ:۔ ادارہ افضل المعارف، وصی آباد، نوراللہ روڈ، الٰہ آباد، یوپی۔

یہ کتاب امام ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "الجواب الکافی لمن سئل عن الدواء الشافی" کا اردو ترجمہ ہے، اس میں انہوں نے ۴۶ عنوانوں کے تحت گناہوں کے نقصانات اور بھلائیوں کے فوائد پر قرآن وسنت کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے، کتاب کا ایک ایک باب اپنی افادیت کے لحاظ سے پوری کتاب ہے، یہ کتاب نہ صرف خواص اہل علم بلکہ ہر مسلمان کے مطالعہ ہی کے نہیں بلکہ وظیفۂ زندگی بنانے کے قابل ہے۔

تبلیغی نصاب ایک مطالعہ کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں

از۔ مولانا عبدالکریم صاحب مفتاحی، صفحات ۲۰۸، کتابت وطباعت معیاری،

قیمت :۔ ۱۴ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ خلیل بکڈپو، جامع مسجد انعامدارپورہ، اکولہ، مہاراشٹر

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کی کتاب جوعام طور پرتبلیغی نصاب کے نام سے مشہور ہے اسمیں صحیح احادیث اور واقعات کے ساتھ بعض ضعیف روایتیں اور بزرگوں کے کچھ ایسے قصے آگئے ہیں جو اہل علم کے نزدیک قابل بحث رہے ہیں، مگر اہل کے ساتھ بعض نااہل لوگ بھی اس پر تنقید ہی نہیں بلکہ اس کی تنقیص کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں، انہی لوگوں میں تابش مہدی صاحب بھی ہیں جنھوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "تبلیغی نصاب ایک مطالعہ" لکھکر اپنی کم علمی کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے،

زیرنظر کتاب میں تابش مہدی کی اسی کتاب کا معقول اور مدلل جواب مرتب کتاب نے دیا ہے مرتب نے بڑی محنت سے عام اعتراضات کا جواب دیا ہے یہ صحیح ہے کہ صحابہ کرام اور بزرگان دین سے بیشمار کرامتیں صادر ہوئی ہیں جنکا انکار ممکن نہیں ہے اور پھر کرامات الاولیاء حق" ہمارا عقیدہ ہے مگر اس سلسلہ میں اتنی بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ عام لوگوں میں اس کا بہت زیادہ ذکر اور اس کے ذریعہ عمل کی ترغیب سے ذہنی اور عملی طور پر توحید خالص کی عظمت میں کچھ فرق ضرور پیدا ہوجاتا ہے اور بسا اوقات یہ چیز شرک و بدعت پر منتج ہوتی ہے، جیساکہ اس وقت ہمارے ہندوستان کے اکثر بزرگوں کے کراماتی قصوں کے سلسلہ میں ہورہا ہے۔ اسلئے ایسے حصے اگر کتاب سے حذف کردیئے جائیں تو یہ کتاب ہر طبقہ کیلئے قابل قبول ہوجائے گی۔ تبلیغی جماعت کے کاموں کی قدردانی ہمارے رگ د پے میں سرایت کی ہوئی ہے مگر کتاب کی بعض چیزیں ہمیشہ ذہن میں خلش پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اسلئے ذمہ دار حضرات کو عقیدۂ توحید کی حفاظت کے پیش نظر جرأت کرکے اس پر نظر ثانی کرڈالنی چاہیئے۔ اگر تبلیغی حلقہ کے چند ذی علم علماء سے مشورہ کرکے اس پر نظر ثانی کرلی جائے تو اس سے حضرت شیخ الحدیث کی نہ علمی فضیلت میں کوئی فرق آئے گا اور نہ تبلیغی کام میں۔ بلکہ اس سے اسکی افادیت کا دائرہ وسیع ہوجائیگا، اور تاجروں نے اپنے مفاد کے پیش نظر اسکا نام جو تبلیغی نصاب رکھدیا ہے اگر وہ کتابیں اپنے اصل نام ہی سے چھاپی جائیں تو زیادہ مناسب ہے ــــــ

خطبۂ نکاح | نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک الفاظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ قیمت ۱؍

اہل دل کی باتیں | یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پراثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اسکا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہوا ہے، اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل | یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت للعہ

ملنے کا پتہ :- شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد - رشاد نگر شہر اعظم گڈھ - یوپی

Regd. No. AZM / N. P. 42 / 84 Phone:- 461
Regd. No R N 38937 / 81

Monthly Jameatur Rashad

Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد

ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جسکے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپے کے قریب ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کیساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے [illegible] ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے، مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع [illegible] ہوتا ہے

اکتوبر نومبر ۱۹۸۵

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

جامعۃ الرشاد

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت وخدمت

مرتبہ حافظ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس رسالہ میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر وثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادت کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت اور حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۱۸×۲۲، صفحات ۵۶، قیمت ۵۰/ـ

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کر رہے ہیں۔ یہ تقریریں اور تحریریں درد واثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ "الفرقان" میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک مجمع میں پڑھوا کر سنوایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیے۔ سائز ۱۸×۲۲۔ صفحات ۱۰۰، قیمت ۵۰/للعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول۔ دوم۔ سوم۔ چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت حصہ اول عہ/، دوم ۵۰/عہ، سوم ۳۰/عہ چہارم ۵۰/عہ

تبع تابعین حصہ اوّل

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس کتاب میں ۱۹ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی، اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ وتابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں اُن صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود ونصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے! اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر وایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بارہ ڈالر امریکی
12/= $

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

الرشاد
جامعۃ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے =/25
خصوصی معاون =/100
قیمت فی پرچہ 2/50

جلد نمبر ۱۱ | ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۸۵ء مطابق صفر و ربیع الاول ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۵۱-۵۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مینجر توسیع و اشاعت:
مولوی عقیل احمد صاحب ندوی

مطبوعہ
نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ (فیض آباد)

مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں اخبارات و رسائل میں نہ جانے کتنے مضمون آچکے ہیں، اور آرہے ہیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن پر پروگرام ہوچکے ہیں، اور ہو رہے ہیں، ملک کے گوشے گوشے میں احتجاجی جلسے ہوچکے ہیں، اور ہو رہے ہیں، مگر کیا خیال ہے کہ مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ ان کوششوں سے حل ہو جائے گا؛ اور اتنی کوششوں سے ہندوستان میں مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ دوسری اقلیتوں یا صوبوں کا کوئی مسئلہ حل ہوا ہے؟ ہماری حکومت بہت اونچا سنتی ہے، اس کو آر۔ ایس ایس اور دوسری فرقہ پرور جماعتوں اور افراد نے اتنا اپنے گھیرے میں لے لیا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ ان کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتی، اور عدلیہ سے اس کی پشت پناہی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں کا یہ بنیادی حق آسانی سے نہیں ملے گا، یہ حق ان کو دینا ہوتا تو چھینا ہی کیوں جاتا؟ اس لیے احتجاجی جلسے کرنے اور میمورنڈم پیش کرنے کے بجائے انہیں کچھ عملی اقدام کرنا ہوگا، مگر اس کی صورت بظاہر نظر نہیں آتی۔ اس کے اسباب یہ ہیں۔

اس کا سب سے بڑا سبب خود مسلمان ہیں، انھوں نے اپنے پرسنل لاء کو عملاً اپنی زندگی سے خود نکال پھینکا ہے، اور اس وقت پورے مسلم معاشرہ کا (الا ماشاء اللہ) حال یہ ہے کہ جہاں ان کو شریعت کے فیصلہ میں فائدہ نظر آتا ہے، وہاں وہ شریعت کی دہائی دیتے ہیں، اور جہاں موجودہ قانون میں ان کو اپنا مفاد نظر آتا ہے، تو وہ شرعی حکم سے ایسا پیچھا چھڑاتے ہیں کہ گویا وہ اسلام کے دائرہ ہی میں نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ جب ہم نے خود اس کو اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا ہے، تو ہمارے ان مسائل سے دوسرے کیوں دلچسپی لینے لگے، یا ان کے دل و دماغ میں ان مسائل کی اہمیت کیوں بیٹھنے لگی،

دوسرا سبب ہمارا انتشار ہے، ہمارے اندر اتنے سیاسی، معاشرتی اور مسلکی اختلافات ہیں کہ ہم کوئی موثر متحدہ آواز نہیں اٹھا پاتے ہیں، اتحاد کلمہ کی بات ہم بہت کرتے ہیں، مگر ہم میں ایک آدمی ایسا نہیں دکھائی دیتا جو اتحاد کلمہ کی خاطر اپنی وجاہت کی ادنی بھی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ مسلم پرسنل لا، بورڈ بظاہر اس مسئلہ میں ایک متحدہ محاذ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک ممبر ایسا نہیں ہے جو بہت سے تحفظات کے ساتھ اس میں شامل افراد یا جماعتوں سے معاملہ نہ کرتا ہو، اور خود وہ جماعتیں اپنے تحفظات کے بغیر ایک قدم چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ہر شخص اور ہر جماعت اپنے کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتی ہے، میں اسکی تفصیل بیان کر کے جو لوگ کچھ کام کر رہے ہیں، ان کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا، مگر صورت حال یہی ہے، پھر اگر مسلم پرسنل لا، بورڈ میں شامل دو ایک جماعتوں کو اس سے علحدہ کر لیا جائے، تو افرادی طاقت اس کے پاس صفر کے برابر ہے، ایسی حالت میں تحفظات کی ذہنیت کیا کوئی اقدام کر سکتی ہے ؟

تیسرا سبب وہ سیاسی افراد ہیں، جو یا تو کسی پارٹی کی تنظیم میں ہیں، یا پھر وہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، وہ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں یا تو گونگے بہرے بن جاتے ہیں، یا پھر اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں، وہ مسلم معاشرہ کے لیے اتنی بڑی مصیبت ہیں کہ ان سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کی ایک ہی صورت تھی کہ مسلم عوام کا ضمیر اپنے مسائل کے بارے میں اتنا بیدار ہوتا کہ ان کو یہ خطرہ ہوتا کہ اسلامی معاشرہ ان کو چھانٹ پھینکیگا ان میں کتنے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کی آواز اٹھا کر یا تحریک چلا کر ان کے ووٹ سے ممبر بن جاتے ہیں، مگر جب پارلیمنٹ کی جنت الفردوس میں پہنچ جاتے ہیں تو وہ صرف اپنے مفاد کے بندے ہو کر رہ جاتے ہیں، اس کی تازہ مثال عارف محمد خاں ہیں،

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حکومت کا ذہن خود صاف نہیں ہے، اس لیے وہ ان افراد کو اقتدار کی دو چار ہڈیاں پھینک دیتی ہے، وہ اس کی لذت میں اتنا بے خود اور سرمست ہو جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں نہ خدا کا خوف رہ جاتا ہے، اور نہ معاشرہ کا،

چوتھا سبب جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا نہرو کے زمانہ تک حکومت اپنی پالیسی بناتے وقت کچھ سیکولرزم کا بھرم رکھتی تھی، مگر اندر اکے اندر خود فرقہ پرست ذہنیت پائی جاتی تھی، اور ان کو بنگلہ دیش کے انقلاب کے بعد

فرقہ پرست جماعتوں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے ہر امتیاز کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ان کی مستقل پالیسی یہ رہی ہے کہ مسلمانوں کے امتیازات کو یکلخت ختم کردو، پھر کچھ شور شرابا ہو تو ہمدردی کر حقوق کے دو چار ٹکڑے ان کے سامنے پھینک دو، یا پھینکنے کا وعدہ کرلو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اردو زبان، مسلم پرسنل لا، کے بارے میں یہی ہوا ہے، اور ہو رہا ہے، اندرا حکومت کے زمانہ کا سب سے بڑا سیاہ کارنامہ یہ ہے کہ عدلیہ بھی فرقہ واریت اور جانبداری سے متاثر ہوکر رہی، ان کے صاحبزادے صاحب بھی قریب قریب اسی روش پر چل رہے ہیں، مثال کے لیے کشمیر اور آسام کا مسئلہ پیش کیا جاسکتا ہے،

اس صورت حال کو بدلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہم کسی قیمت پر اپنا ایک متحدہ محاذ بنائیں اور کاسۂ گدائی لے کر حکومت سے بھیک مانگنے کے بجائے کاسۂ سر لے کر کفن بردوش ایک پرامن تحریک چلائیں،

بنارس اور کلکتہ میں بڑے بڑے مجمعوں کا ہمارے راہنما اور ہمارے اخبارات اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ گویا ان کو مسلمانوں کی بہت بڑی فوج مل گئی ہے، جس سے وہ ساری مشکلات پر قابو پالیں گے، لیکن ابھی کوئی اقدامی پوزیشن اختیار کرنے کا مرحلہ آجائے تو چند سو آدمی مشکل سے نظر آئیں گے، ہم اپنے راہنماؤں، لیڈروں اور اخبارات سے گذارش کریں گے کہ ان جذباتی تقریروں، تحریروں اور بڑے بڑے جلسوں سے کچھ کامیابی نہیں ہوسکتی، زیادہ نہیں اگر دس ہزار آدمی ہم ایسے تیار کردیں، جو جیل جانے ڈنڈے کھانے اور سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوجائیں، تو یہ مسئلہ حل ہوکر رہیگا، ورنہ ان جلسوں کا حشر وہی ہوگا جو خلافت کمیٹی کے جلسوں کا ہوچکا ہے، اور آزادی کے بعد مجلس مشاورت کی مقبولیت کا، گو ہمارے راہنماؤں نے اس کی نزاکت کو اس وقت محسوس کیا ہے، جب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے، یعنی مسلم پرسنل لا کے سارے حقوق سلب کرلیے گیے ہیں، یا ان کو بے جان کردیا گیا ہے، مگر جب تک دستور میں بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ موجود ہے، ہم اس کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کی اس حیثیت کو بحال کرنے کی جدوجہد کرسکتے ہیں، جو آزادی کے وقت اسے حاصل تھی، اور آزادی کے بعد دستور بننے تک وہ باقی رہی،

ہمیں امید نہیں ہے کہ دھواں دھار تقریروں اور جذباتی تحریروں کے شور میں ایک معمولی آدمی کی یہ
نحیف آواز سنی جائے گی، مگر اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی ہے، اس لیے کہ بڑی سے بڑی
سیکولر جماعتیں جو حکمراں جماعت کی ہر پالیسی کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ وہ سب اس حمام میں ننگی ہو کر
اس کی آواز میں آواز ملا رہی ہیں، ایسی صورت میں ہمیں اپنی داخلی قوت اور کوشش ہی پر کوئی پروگرام بنانا
چاہیے، اور خدا کی نصرت و مدد کے علاوہ کسی اور خارجی سہارے کی امید اپنے دل سے نکال دینی چاہیے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور مسلم پرسنل لا کے ممبران حضرات اور عام مسلمانوں کو پیش نظر رکھنی چاہیے
کہ شاہ بانو کے فیصلہ کی وجہ سے اس وقت زیادہ تر مضامین اسی مسئلہ کے متعلق آ رہے ہیں، اور عام
طور پر اسی پر تقریروں اور جلسوں میں زور دیا جا رہا ہے، لیکن یہ تو ایک ضمنی مسئلہ ہے، اصل مسئلہ پورے
پرسنل لا کے ڈھانچہ کا ہے جو انگریزوں سے وراثت میں ہماری حکومت کو ملا تھا۔ جس کا بیشتر حصہ یا تو ختم کر دیا
گیا ہے، یا بے جان کر دیا گیا ہے، اس لیے ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر ہمیں مزید تحفظات نہیں ملتے تو
وہ ڈھانچہ جوں کا توں باقی رہے، اور ساتھ ہی ہمارا دوسرا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے اندر رضاکارانہ
طور پر ہماری جو جماعتیں یا تنظیمیں کام کر رہی ہیں یا وہ معاشرتی مسائل میں جو فیصلہ کریں، ہماری حکومت ان کی قانونی حیثیت
کو تسلیم کرے، مثلاً امارت شرعیہ بہار، یا یوپی، اور دوسرے صوبوں کی شرعی پنچایتیں یا الجماعۃ الشرعیہ
وغیرہ کے نام سے یہ تنظیمیں جو فیصلہ کرتی ہیں، ان کو عدالت میں چیلنج نہ کیا جا سکے، دستور کی دفعہ
۲۵ ہمیں اس کا حق دیتی ہے۔

دستور میں دفعہ ۲۵ کو ہم سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے، مگر مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں
بعض شقیں ایسی موجود ہیں، جو اس کو کالعدم کر دیتی ہیں، یہی حال دفعہ ۴۴ کا بھی ہے، اس پر انشاء اللہ
آئندہ لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

تفسیر سورۂ فیل

از مولانا شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی، شیخ الحدیث جامعۃ الرشاد

یہ سورہ بھی مکی ہے، اور ان سورتوں میں سے ہے جو سورۃ المدثر کی قسط اوّل کے بعد نازل ہوئی تھیں، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اس کے نزول کا زمانہ نبوت کا پہلا سال ہے، چونکہ اس میں اصحاب فیل کو ہلاک کر دیے کا تذکرہ ہے، اس لیے اس کا نام سورۃ الفیل رکھ دیا گیا ہے، اصحاب الفیل سے مراد شاہ یمن ابرہۃ الاشرم اور اس کا لشکر جرار ہے، جو ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا، اور جن کے ساتھ نو یا تیرہ جنگی ہاتھی بھی تھے اور جو خانۂ کعبہ کو منہدم کر ڈالنے کے ارادے سے یہ عظیم فوج لیکر آیا تھا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ خاندان حمیر کے آخری بادشاہ ذو نواس حمیری کو جس کا قصہ سورۃ الدخان اور سورۃ البروج کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے، حبشی سپہ سالار اَرْیاط نے شکست دے کر ۵۲۵ء میں پورے یمن و نجران پر قبضہ کر لیا تھا، اریاط کے بعد ۵۴۳ء میں دوسرا حبشی سردار جس کا نام ابرہہ تھا، شاہ حبشہ کے والیسرائے کی حیثیت سے اس علاقہ کا حکمراں بن گیا، اسے یونانی مورخین ابرامن، سریانی مورخین ابراہام، اور عربی مورخین ابرہۃ الاشرم کہتے ہیں، اس کی ناک بہت چھوٹی اور پست تھی، دیکھنے سے نکٹا محسوس ہوتا تھا، عربی زبان میں ایسے شخص کو اشرم کہا جاتا ہے، ابرہہ تمام اہل عرب کو عیسائی بنا لینے کا خواہشمند تھا، فی نفسہ یہ خواہش بری نہ تھی، کیونکہ بت پرستی سے عیسائیت ہزار درجہ بہتر ہے، مگر کاش وہ گھر میں دروازے سے داخل ہوتا، یعنی اس مقصد کے لیے جائز و مناسب کوشش کرتا، اس نے دار السلطنت شہر صنعا میں ایک عظیم الشان گرجا تعمیر کرایا، اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا، لیکن اسے جہل و تعصب نے یہ پٹی پڑھائی کہ اہل عرب کے دلوں میں میرے بنائے ہوئے گرجا کی وہی عظمت و حرمت گھر کر لے جو ان کے دلوں میں ابراہیم و اسماعیل

کے بنائے ہوئے کعبہ کی ہے، اور اسے چھوڑ کر اطراف واکناف سے باشندگانِ عرب اسی گرجا کی زیارت کے لیے آیا کریں، ظاہر ہے کہ خانۂ کعبہ سے نفرت کرنے اور لوگوں کو اس سے کاٹ دینے کا جذبہ قطعاً شیطانی جذبہ تھا، اور اہلِ عرب اگرچہ اصل دینِ ابراہیم فراموش کر چکے تھے، مگر حج کو نہ بھولے تھے، اور ہر سال تمام جزیرۂ عرب سے لوگ حج کرنے کے لیے مکہ جاتے، اور قربانیوں کے جانور ساتھ لے جاتے تھے۔ حج کے لیے جانے والوں سے راستہ میں کہیں بھی تعرض نہ کیا جاتا، سب ان کا احترام کرتے تھے۔ عرب کا ہر باشندہ خانۂ کعبہ کو اللہ کا گھر مانتا تھا، اہلِ عرب میں رہنے والے یہود و نصاریٰ کو خانہ کعبہ سے کوئی عقیدت نہ تھی، کعبہ سے عام اہلِ عرب کو منقطع کرنے کی کوششیں جو ابرہہ نے کی تھیں، اکارت گئیں، تب اس خبیث کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اسے نیست و نابود کر دینا چاہیے۔ اس خیال کو اس نے پکے ارادے میں تبدیل کر لیا، اور اتفاقاً ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے بھاری لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ بنی کنانہ کا ایک قافلہ جو مکہ کے قرب و جوار کے رہنے والے تھے، اس گرجا کے پاس شب باش ہوا۔ انھوں نے کھانا پکانے کے لیے جو آگ سلگائی تھی، تیز ہوا کی وجہ سے اس کے تنکے گرجا گھر میں جا گرے، اور اس میں آگ لگ گئی، قافلہ چلا گیا، ابرہہ نے آتش زنی کے اس واقعہ کو عرب قافلہ کی شرارت پر محمول کیا، اور انتقاماً خانہ کعبہ کو منہدم کر ڈالنے کے قصد سے روانہ ہو گیا، ایک روایت یہ ہے کہ گرجا میں گھس کر کسی نے پاخانہ کر دیا تھا، ابرہہ نے کہا یہ ان عربوں کا ہی کام ہے، بہرکیف گرجا میں آگ لگنے کا واقعہ ہوا ہو یا کسی نے اسے گندہ کر دینے کی حرکت کی ہو، اس قافلہ کا کھوج لگا لینا اور گرفتار کر کے مجرم کو سخت سزا دینا کچھ مشکل نہ تھا، مگر اس کی طرف تو اس نے کوئی توجہ کی نہیں، اور لشکر جرار لے کر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے روانہ ہو گیا، یہ اس کی دلیل ہے کہ ابرہہ کا یہ اقدام ہنگامی غیظ و غضب کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اس کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔

ابرہہ کا یہ وبال انگیز کوچ ۵۷۰ء میں ہوا تھا، اس کی فوج میں بھی کوئی شریف آدمی نہ تھا، جو اسے اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دیتا، فوج میں سب جاہل و متعصب عیسائی تھے، سب بصوع و رغبت اس کے ساتھ ہو لیے، فوج کو رہنمائی کی ضرورت تھی، اس ضرورت کے تحت ابرہہ نے ایک یمنی سردار ذو نفر نامی کو پکڑوا لیا، اس نے کہا میں صرف بلادِ خثعم تک کا راستہ جانتا ہوں، خثعم کے علاقہ میں پہونچ کر قبیلۂ خثعم کے سردار نفیل ابن حبیب خثعمی کو پکڑوا لیا، اور اس سے رہنمائی کا کام لیا، اس نے کہا تھا کہ مجھے صرف طائف تک کا راستہ

معلوم ہے، جب ابرہہ طائف کے علاقہ میں پہنچا تو باشندگان طائف کو خطرہ ہوا، کہ ہمارا لات دیوی کا مندر نہ گرا دیا جائے، اسے بچانے کی غرض سے اہل طائف نے اپنے سردار مسعود ثقفی کی قیادت میں ابرہہ کے پاس ایک وفد بھیجا، اور اسے یقین دلایا کہ آپ کعبہ کو منہدم کر دینے کی غرض سے جا رہے ہیں، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، بس یہ درخواست ہے کہ ہمارے مندر سے آپ تعرض نہ کریں، ہم مکہ تک رہنمائی کے لیے آپ کو رہنما دیں گے۔ ابرہہ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اہل طائف میں سے ایک شخص جسے ابو رغال کہتے تھے، مکہ کا راستہ بتانے کے لیے اس کے ساتھ ہو گیا، لشکر ابرہہ نے جب منزل بہ منزل المغمس میں جا کر پڑاؤ کیا تو ابو رغال وہیں مر گیا، بعد میں اہل عرب برسوں اس غدار کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے، جب کسی شخص کا ادھر کو گذر ہوتا تو اس کی قبر پر پتھر مارتا۔ آگے بڑھ کر جب ابرہہ لشکر لیے ہوئے عرفات کے قریب الصفاح نامی مقام پر پہنچا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب اہل مکہ کی جانب سے اس سے آ کر ملے، اہل مکہ اس کی آمد کا غلغلہ سن چکے تھے، اور اس کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے، ان کی فوجی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میدان بدر میں ان کے جنگ آزماؤں کی تعداد ایک ہزار تھی، اور جنگ احد میں تین ہزار پھر غزوۂ احزاب میں قریش و قبائل غطفان اور یہود خیبر کا مجموعی اتحادی لشکر بارہ[12] ہزار تھا، پس جس شہر میں لڑ سکنے والوں کی تعداد بمشکل ساڑھے تین ہزار تک پہنچ سکتی تھی، اس کے باشندوں میں ابرہہ کے ساٹھ ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کا یارہ کیسے ہو سکتا تھا۔

اہل مکہ کی طرف سے عبد المطلب ابرہہ کو مالی پیش کش کر کے اسے واپس جانے پر راضی کرنے کے لیے آئے تھے، اس سے کہا، آپ کو جو مطلوب تھا ہمارے پاس اطلاع بھیجدیتے، ہم خود ہی لیکر حاضر ہو جاتے، ابرہہ بولا، مجھے مال مطلوب نہیں، میں تو تمہارا کعبہ منہدم کرنے کے لیے آیا ہوں، عبد المطلب نے کہا، ایسا نہ سوچیے، وہ تو اللہ کا گھر ہے، آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس ہو جائیں، وہ بولا ہرگز نہیں، ہم اسے منہدم کیے بغیر واپس نہ جائیں گے، ہمیں باشندگان مکہ سے نہ لڑنا مقصود ہے، نہ مال لینا، ہاں اگر وہ مزاحمت کریں گے، تو قتل کر دیئے جائیں گے، یہ کہہ کر اس نے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، عبد المطلب اس کی جہت سے مایوس ہو کر مکہ پہنچے۔ اور لوگوں سے کہا اگرچہ ابرہہ نے کہا ہے کہ مجھے نہ اہل مکہ سے لڑنا مقصود ہے، نہ مال لینا، لیکن دشمن کا کیا اعتبار، اپنے اہل و عیال

کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپو، اور مکہ کو خالی کر دو، تمام اہل مکہ نے ایسا ہی کیا، ادھر ابرہہ نے آگے بڑھ کر عرفات و منیٰ کے درمیان وادی محسر میں پڑاؤ کیا، صبح ہوئی تو لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا، اب انہیں کہیں رکے بغیر سیدھے مکہ پہنچنا تھا، ہاتھی فوج سے آگے آگے تھا سب سے پہلے جو ہاتھی تھا، وہ نہایت قوی ہیکل و عظیم الجثہ تھا، یکایک وہ بیٹھ گیا، فیلبانوں نے اسے اٹھانے کے لیے انکس پر انکس لگائے، نیزوں سے کچوکے دیئے، لیکن اس نے اٹھنے کا نام نہ لیا، اسی دوران میں سمندر کی طرف سے جھنڈ کے جھنڈ پرندے جو فاختہ اور کبوتر کی برابر جثہ رکھتے تھے نمودار ہوئے، ان کی چونچوں اور پنجوں میں کنکر دبے ہوئے تھے، ان پرندوں نے فضا میں فوج کے اوپر آ کر اسے کنکروں کا نشانہ بنا لیا، ان کنکروں نے وہی کام کیا جو رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیاں کرتی ہیں، جس شخص کو کنکر لگا، اس کے بدن میں گھس گیا، اور وہ لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر لوٹنے لگا، فوج میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی، لیکن پرندوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا، بے تحاشا پیچھے بھاگتے اور کنکر لگ کر گرتے اور مرتے رہے، سب کے سب وہیں وادی محسر میں نہیں مرے، بلکہ ع

یہ یہاں گرا وہ وہاں گرا، یہ یہاں مرا وہ وہاں مرا،

کا عالم تھا، ساٹھ ہزار اشخاص میں سے کوئی صنعاء واپس نہ پہنچ سکا، قبیلۂ خثعم کے علاقہ میں پہنچتے پہنچتے پوری فوج کا صفایا ہو گیا، سخت جان ابرہہ وہیں غالباً سب سے آخر میں مرا ہے، راستے میں اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی گرتی چلی گئی تھی، مگر نفیل بن حبیب خثعمی کو جسے ابرہہ نے راستہ بتلانے کے لیے پکڑ رکھا تھا، اس آسمانی گزند سے اللہ نے بچا لیا تھا، وہاں سے دوسرے پہاڑ کا راستہ لیا، حتیٰ کہ سالم و محفوظ اپنے علاقہ میں پہنچ گیا، سراسیمہ حال حبشی فوج کے لوگ چلا رہے تھے، کہ نفیل تو کہاں ہے؟ اسے یہ نفیل کہاں چلا گیا، او نفیل خدا کے واسطے ہمیں کوئی راہ نجات بتا، چنانچہ نفیل نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے، کہتا ہے:

ردینۃ لو رأیت ولن تریہ لدی جنب المحصب ما رأینا

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرا وخفت حجارۃ تلقی علینا

وکل القوم یسأل عن نفیل کان علی للحبشان دینا

اور اسی کے ایک قصیدے کا مطلع ہے:

این المفر و الالہ الطالب والاشرم المغلوب لیس الغالب

یہ عظیم الشان واقعہ تمام عرب میں مشہور ہوگیا، اس عہد کے بہت سے شاعروں نے اس کا ذکر کیا ہے عبداللہ بن الزبعری کے یہ اشعار پڑھیے:

سائل امیر الجیش عنھا ما رأی | فلسوف ینبی الجاھلین علیمھا
ستون الفالم یؤبوا ارضھم | بل لم یعش بعد الایاب سقیمھا
کانت بھا عاد وجرھم قبلھم | واللہ من فوق العباد یقیمھا

ابو قیس بن اسلت نے کہا ہے ؎

فقوموا فصلوا خاشعین لربکم | بارکان ھذا البیت بین الاخاشب
فلما اتاکم نصر ذی العرش ردھم | جنود الملیک بین ساف وحاصب

اس شعر میں حاصب بمعنی محصوب ہے، یعنی سنگریزوں سے مارا ہوا، جیسے کاتم بمعنی مکتوم آتا ہے، یقال سٹ کا تعرز، اور سافی کے معنی ہیں خاک میں پڑا ہوا، امیہ بن ابی الصلت کہتا ہے:

ان آیات ربنا ساطعات | ما یماری فیھن الا الکفور
حبس الفیل بالمغمس حتی | ظل یحبو کانہ معقور

عبداللہ بن قیس کے یہ اشعار پڑھیے:

کادہ الاشرم الذی جاء بالفیل | فولی وجیشہ مھزوم
واستھلت علیھم الطیر بالجندل | حتی کانہ مرجوم

ابرہہ کے لشکر کی تباہی کا واقعہ ماہ محرم میں پیش آیا تھا، اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ماں کے پیٹ میں تھے، آپ کی ولادت اسی سال نو ربیع الاول کی صبح کو ہوئی ہے، اس حادثہ کے بعد یمن میں حبشی اقتدار ختم ہوگیا، یمن کے مختلف علاقوں میں جو حبشی حکام ابرہہ کی طرف سے مقرر تھے، وہ جو حبش سپاہی موجود تھے، یمن کے لوگوں نے انہیں قتل کر ڈالا، اور بعض جان بچا کر حبشہ بھاگ گئے، ایک یمنی سردار سیف بن ذی یزن سے گٹھ جوڑ کرکے ایک ہزار ایرانی فوج لے آیا، ۵۷۵ء سے یمن ایرانی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک یمن ایرانی حکومت کا صوبہ رہا، ایرانی حکومت کا آخری وائسرائے حاکم باذان تھا، جسے خسرو پرویز نے لکھا تھا، کہ یثرب سے محمد نام کے شخص کو گرفتار کرکے ہمارے حضور بھیج دو، کہ اس نے خط میں ہمارے نام سے پہلے اپنا نام لکھ کر

ہماری شان میں گستاخی کی ہے، اس حکم شاہی کی تعمیل کے لیے باذان نے دو ایرانی سپاہی مدینہ منورہ بھیج دیتے تھے، کیونکہ اسلام سے قبل اہل عرب کی ایرانیوں، رومیوں، حبشیوں اور مصریوں یعنی عرب کی پڑوسی قوموں کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہ تھی، بے شک اہل عرب بڑے لڑاکا اور عموماً سفاک و بے رحم تھے، اور ایک قبیلہ کی جب دوسرے قبیلہ سے جنگ چھڑ جاتی تھی، تو رُکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی، چالیس چالیس سال تک ان کی خانہ جنگیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، لیکن ان کی ساری دلیری اور بہادری بس آپس میں ایک دوسرے کو مارنے کاٹنے اور لوٹنے کھسوٹنے کی حد تک تھی، لیکن حکمراں بیرونی قوموں کے کسی سپاہی کے مقابلہ میں وہ ایسے ہی تھے، جیسے گیدڑوں کا جتھا کسی شیر کے مقابلہ میں ہوتا ہے،

اصحاب الفیل کو پرندوں کے ذریعہ ہلاک کر دینے کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرما کر ایک طرف اہل مکہ کو اپنا عظیم الشان احسان یاد دلایا ہے، دوسری طرف اس میں زبردست عبرت و خوشخبری بھی پیوست کر دی ہے، عبرت کفار کے لیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خداداد عظمت و حرمت کے قائل نہیں، اور آپ کے درپے آزار ہیں، انہیں جاننا چاہیے کہ جیسے بیت اللہ کو منہدم کر ڈالنے کا قصد نہایت بدانجام ثابت ہوا ہے، اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور عباد اللہ کی اذیت رسانی کا انجام بھی اچھا نہیں ہو سکتا، ایسے ظالموں پر اللہ کا عذاب آ پڑا، تو کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا، اور خوشخبری مومنین کے لیے ہے کہ جس نے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی ہے، وہی اپنے دین اپنے رسول اور اپنے فرمانبردار بندوں کی حفاظت فرمانے والا ہے،

ربط | سورۃ الہمزہ میں بد اخلاق حریص بخیل کافر شخص کو جو طعنہ زنی و عیب چینی کر کے اللہ کے بندوں کی بے حرمتی کرنے کا خوگر ہو عذاب جہنم کی دھمکی دی ہے، اسے خالی خولی دھمکی نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ یہ دھمکی اللہ کی طرف سے ہے، جس نے بیت اللہ کی بے حرمتی کا قصد کرنے والوں کو دنیا میں ہی ایسا عذاب دیا ہے، جس کی عالم اسباب میں کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں ہے، بیت اللہ کی بے حرمتی کا قصد کرنے والے عذاب کے مستحق ہوئے تو دین اللہ کو قصداً نہ ماننے والے عذاب کے مستحق کیوں نہ ہوں گے، پس سورۃ الفیل کا مضمون سورۃ الہمزہ کے مضمون کی دلیل ہے، اسی لیے مصحف شریف میں سورۃ الہمزہ کے بعد سورۃ الفیل ثبت کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ کیا تجھ علم نہیں ہوا، کیسا برتاؤ کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔ استفہام کا مطلب یہ ہے کہ بے شک یہ واقعہ تیرے علم میں ہے، کہ کا بچہ بچہ اور جزیرۂ عرب کا ایک ایک فرد اس سے واقف ہے،

(۲) أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ کیا ان کے منصوبہ کو ناکامی میں نہیں ڈال دیا،

(۳) وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ اور ان پر پرندے بھیج دیئے جھنڈ جھنڈ،، طیر جمع ہے طائر کی جیسے صَحْبٌ صاحب کی اور رَكْبٌ راکب کی جمع ہے۔ اور ابابیل جمع کا صیغہ ہے لیکن اس کا واحد مستعمل نہیں ہے۔ بعض نے اس کا واحد اِبَّالَةٌ بتایا ہے،

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِنْ سِجِّيلٍ ۝ جو انہیں نشانہ بنا رہے تھے کنٹ کی جنس کے پتھروں کا،

تنبیہ: سجیل کی تحقیق تفسیر سورہ ہود میں گذر چکی کہ اہل علم ولغت نے اسے سنگ گل کا معرب بتایا ہے فارسی زبان میں سنگ پتھر کو اور گل گیلی مٹی کو کہتے ہیں۔ پتھر کی دو جنس ہیں (۱) خالص پتھر جن میں مٹی کی آمیزش نہیں ہوتی اس جنس کے پتھروں کے پہاڑ ہوتے ہیں۔ (۲) مٹی ملے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر اسی کو عربی میں سجیل فارسی میں سنگ گل اور ہندی میں کنٹ کہتے ہیں۔ یہ جنس معدنی ہے۔ زمین کے اندر اس کی کانیں ہوتی ہیں۔ ضلع میرٹھ اور میوات کے متعدد مقامات میں اس کی کانیں میں نے خود دیکھی ہیں اور علاقوں میں بھی ہوں گی۔ ان پتھروں کو جلا کر پیس کر عمارتی چونا بنایا جاتا ہے۔ سرزمین حجاز میں اس جنس کا پتھر نہیں ہوتا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَأْكُولٍ ۝ پس انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا،،

واضح رہے کہ ابرہہ کا فوج اور ہاتھیوں کو لے کر کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے روانہ ہونا اور غیبی پرندوں کی سنگ باری سے آخری منزل پر تباہ ہو جانا اتنا ہی یقینی و قطعی واقعہ ہے جتنا یہ واقعہ کہ ہندوستان پر صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ اور دہلی کا مشہور لال قلعہ اور آگرہ کا تاج محل مسلمان بادشاہ شاہجہاں کا بنوایا ہوا ہے۔ اس قسم کے متواتر الثبوت واقعات کا انکار یا ان کی صحت میں شک کرنا قطعاً خلاف عقل ہے۔ مگر بعض لوگ عداوت اور راندۂ تعصب کے جوش میں ایسے واقعات کی تغلیط کر گذرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۵ سال پہلے ایک ہندو محقق کا مضمون کسی اخبار میں چھپا تھا اس نے لکھا

تھا کہ شاہجہاں نے لال قلعہ اور تاج محل نہیں بنوایا۔ یہ دونوں بے مثال عمارتیں تو فلاں ہندو راجہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔ اس محقق کو ہندو و مسلم تاریخ والوں کی طرف سے تو اس ریسرچ کی داد نہیں ملی البتہ اس کا اندھا تعصب سب پر واضح ہو گیا۔ اسی طرح اصحاب الفیل کے اس واقعہ کے متعلق بعض یوربین ستم ظریفوں نے یہ احساس کر کے اس واقعہ سے خانہ کعبہ کی بڑی عظمت ثابت ہوتی ہے لکھ مارا تھا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابرہہ لشکر لے کر اپنے ہم مذہب رومیوں کی مدد کے لئے روانہ ہوا تھا اس سال عرب میں چیچک پھیلی ہوئی تھی ابرہہ کے لشکر میں بھی یہ بیماری گھس گئی اور خود ابرہہ بھی اس کا شکار ہو کر مر گیا۔ رہا یہ کہ ابرہہ کعبہ کو منہدم کرنے کی غرض سے گیا تھا اس کی سزا میں پرندوں نے چھوٹے چھوٹے سنگریزے مارا سے اور اس کی فوج کو ہلاک کر دیا تو یہ کہانی ناقابل یقین ہے۔ پرندوں کا یکایک غیب سے نمودار ہو کر ابرہہ کے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دینا اور محض ان کی چوٹ سے ان کا ہلاک ہو جانا ناممکن ہے۔ عرب کے بدوؤں نے یہ کہانی تراش لی تھی۔ اس کو قرآن نے نقل کر دیا ہے۔ میں یہ کہنا ہوں کہ ابرہہ کا عہد حکومت ۵۴۳ء سے ۵۷۰ء تک ہے ۲۸ سال کے اس عرصہ میں رومی حکومت کو کوئی ایسی مہم پیش نہیں آئی جس میں ابرہہ کی مدد کی ضرورت پڑتی لہذا یہ خیال کرنے کی کوئی تک نہیں ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کے لئے لشکر لے جا رہا تھا اس عہد کے کسی یونانی یا رومی مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا نہ کسی عربی نے یہ بے سروپا بات بیان کی ہو پرندوں کے پھینکے ہوئے سنگریزوں سے ابرہہ کی فوج کے تباہ ہو جانے کو ناممکن سمجھنا تو یہ محض بکواس ہے۔ جب مچھروں کے کاٹنے سے ملیریا بخار وبائی انداز میں پھیل سکتا ہے تو پرندوں کی سنگباری سے عام تباہی آجانے کو ناممکن سمجھنے کی کیا تک ہے۔ ؟ کیا زمین میں زہریلے اور بدن گداز گنٹوں کی کانیں نہیں ہو سکتیں۔ جس قدرت و حکمت والے رب نے سانپوں اور بچھوؤں کو زہریلا بنایا ہے جس نے پہاڑوں کے اندر لاوا رکھ دیا ہے۔ جس نے زمین کے اندر سونے چاندی تانبے لوہے نمک اور ہیروں کی کانیں بنائی ہیں۔ جس نے اس میں زہریلی گیس کے ذخیرے چھپا دیئے ہیں اسی نے زہریلے گنٹوں کی کانیں بھی زمین میں پیدا فرما دی ہیں۔ اللہ کے حکم سے پرندے ایسی ہی کسی جگہ سے جہاں زہریلے اور بدن گداز گنٹ تھے چونچوں اور پنجوں میں گنٹ لے آئے اور ابرہہ کے لشکر پر برسا گئے

سرسید مرحوم شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمان تھے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے انہیں قرآن پر اعتراض گوارا نہ تھا مگر وہ یورپین مفکرین و مصنفین کے فکر و نظر و علم سے بے حد مرعوب تھے اس لئے موصوف نے قرآن حکیم کی تفسیر لکھی اور ان جملہ آیات و مضامین کی جن پر یورپین اہل علم کو اعتراض تھا بڑی محنت اور غور و فکر کے ساتھ ایسی تشریح کی جس سے ثابت ہو جاتے کہ وہ آیات و مضامین محل طعن و اعتراض نہیں ہیں۔ اس کوشش کے تحت وہ متعدد آیات کی تفسیر میں بڑی غیر علمی اور غلط تاویلات کر گذرے ہیں جو تحریف معنوی کی مصداق ہیں۔ بے شک اچھے اچھے ذی علم و متقی علماء سے بھی بعض آیات کے سمجھنے میں غلطیاں ہوئی ہیں اور ہو سکتی ہیں مگر اجتہادی غلطی اور ارادی غلطی کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ آیت :-

"وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ" کی تفسیر میں سرسید مرحوم نے ایسی ہی تاویل کی ہے۔ لکھا ہے کہ طیر پرندوں کے معنی میں نہیں بلکہ نحوست کے معنی میں ہے۔ لفظ طائر قرآن کریم میں بھی نحوست کے معنی میں آیا ہے (سورۃ النمل، سورۃ یٰسین) اور موصوف نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے چڑھائی کی تھی مگر یہ کہا ہے کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک پھیل گئی تھی اس کو قرآن نے طیر کہا ہے، موٹے موٹے دانوں کی سخت شورش و تپش اور بخار والی چیچک مریضوں کے پورے بدن کو گھیرے ہوئے تھی پھر چیچک کے زخموں کی وجہ سے ہر چیچک زدہ شخص کا جسم ایسا ہو گیا جیسے اس پر سنگ ریزوں کا پتھراؤ کیا گیا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس مطلب کو تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ کسی عبارت کا وہی مطلب صحیح ہو سکتا ہے جو اس کے ترجمہ سے نکلے۔ پھر اس مطلب کی بنیاد لفظ طیر کو نحوست و تباہی کے معنی میں لینے پر ہے۔ لیکن لفظ طیر کو اہل عرب نے اس معنی میں کہیں استعمال نہیں کیا۔ جیسے لفظ طیر کلام عرب میں جوتے یا ٹوپی یا درخت یا پتھر کے معنی میں نہیں آتا اسی طرح نحوست و تباہی کے معنی میں بھی نہیں آتا۔

اس قصہ کی ایک توجیہ اور ان آیات کی ایک تاویل مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ مکہ اور قرب و جوار کے باشندوں اور اطراف و اکناف سے آئے ہوئے حاجیوں نے کعبہ کو بچانے کے لئے پہاڑوں کے اوپر سے ابرہہ کی فوج پر کامیاب سنگباری کی تھی جس کی وجہ سے فوج کو سخت تباہی پیش آئی۔ اور خود ابرہہ بھی زخمی ہو گیا۔ ہاتھی بھی پتھروں کی مار سے سراسیمہ ہو کر پلٹے اور اپنی

ہی فوج کو روند گئے۔ اس طرح بہت سے لشکری مر گئے بہت سے زخمی ہوگئے اور بہت سے با حال تباہ و بے نیل مرام واپس بھاگ گئے۔ اور طیر سے مراد مردار خور گدھ اور چیل ہیں جو کسی فوج کو دیکھ کر اس کے ساتھ فضا میں پرواز کیا کرتے ہیں یہ خیال کر کے کہ یہ فوج کہیں جا کر جنگ کرے گی نتیجہ میں بہت سے لوگ مریں گے اور ہم مزے سے ان کی لاشیں نوچ نوچ کر کھائیں گے اور ترمیھم میں فعل ترمی واحد مذکر کا صیغہ ہے اس خطاب کا مخاطب ان عربی بہادروں میں سے ایک ایک شخص ہے جنہوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگباری کی تھی۔ کیونکہ عرب کے لوگ نہایت خود دار اور بہادر تھے بیت اللہ پر وہ ابرہہ کا حملہ کیسے گوارہ کر سکتے تھے قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اس بھاری لشکر سے میدان میں مقابلہ کرنا انہیں دشوار تھا تو انہوں نے پہاڑوں سے لشکر ابرہہ پر سنگباری کرنے کا دانشمندانہ منصوبہ بنایا اور جریدہ روزگار پر اپنی شجاعت و خود داری کا لازوال نقش ثبت کر دیا۔ لیکن مولانا فراہی کی یہ توجیہ و تاویل درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔

(۱) طیر سے مردار خور پرندے مراد سمجھنا محض بے دلیل بات ہے۔ بعض شعراء عرب نے فخریہ اشعار میں یہ مضمون باندھا ہے کہ جنگ میں ہماری فتح مندی و ظفر یابی یقینی ہے۔ ہم جب اپنے بہادر شہسواروں کو لے کر دشمن کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو ہمارے ساتھ گدھوں کی ٹولی بھی فضا میں محو پرواز ہو جایا کرتی ہے کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہم دشمنوں کو قتل کر ڈالیں گے تو انہیں کھانے کے لئے ان کی لاشیں نصیب ہوں گی۔ مولانا فراہیؒ نے اس شاعرانہ مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ لیا کہ فی الواقع کسی کو کوچ کرتا ہوا دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ عرب و عجم میں ملک ملک میں لاکھوں جنگیں ہوتی ہیں۔ فوج کشیاں کی گئی ہیں لیکن آج تک کسی چھوٹی بڑی فوج کو کوچ کرتی ہوئی دیکھ کر گدھ اس کے ساتھ نہیں ہوتے۔

(۲) پہاڑ کے اوپر سے کسی گروہ پر سنگباری اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ گروہ پہاڑ کے دامن میں ہو۔ اس صورت میں پہاڑ کے اوپر سے جو پتھر پھینکے یا لڑھکائے جائیں گے ان سے اس گروہ کو نقصان پہونچے گا۔ لیکن ابرہہ کی فوج کو وادی محسر میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جن لوگوں نے وادی محسر دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے داہنی طرف یا بائیں جانب کے پہاڑ اتنے نزدیک نہیں ہیں کہ ان کے اوپر سے پھینکے ہوئے پتھر ان لوگوں کو ہلاک یا زخمی کر ڈالیں جو وادی محسر میں ہوں

مولانا فراہیؒ نے اپنی آنکھ سے وادی محسر دیکھی ہوتی تو ہرگز یہ تاویل نہ کرتے۔

(۳) تاریخ عالم میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ دامن کوہ سے گذرتے ہوئے کسی لشکر کو فریق مقابل کے آدمیوں نے پہاڑ کے اوپر سے وزنی پتھر لڑھکا لڑھکا کر سخت نقصان پہنچایا ہے اور وزنی پتھر لڑھکائے ہی جا سکتے ہیں ہاتھوں میں لے کر دور نہیں پھینکے جا سکتے پس اگر لشکر ابرہہ کی تباہی بھی اسی طرح ہوئی ہوتی تو آیت میں پتھروں کے لڑھکانے کا ذکر ہوتا حالانکہ آیت میں رمی یعنی پھینکنے کا ذکر ہے

(۴) اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ وہ پھینکے ہوئے پتھر سجیل کی جنس کے پتھر تھے مولانا فراہیؒ کو بتانا چاہیئے تھا کہ اگر ابرہہ کی فوج پر اہل مکہ نے سنگباری کی تھی تو سجیل کے سنگریزے کہاں سے لے آئے تھے جب کہ مکہ و نواح مکہ بلکہ تمام حجاز کی سرزمین میں سجیل کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے

(۵) سجیل کی قسم کے سنگریزے مار کر تین چار ہزار آدمی ساٹھ ہزار آہن پوش فوج کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچا سکتے سب کو ہلاک کر ڈالنے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دینے کا ذکر ہی کیا۔

(۶) عربیت کا صحیح ذوق قطعاً یہ گوارا نہیں کرتا کہ ترمیھم میں خطاب سنگباری کرنے والے اشخاص سے ہو۔ بریں تقدیر ترمونہم لانا ضروری تھا اور اللہ تعالےٰ ترمیھم کی بجائے ترمونھم فرمانے سے عاجز نہ تھا۔

(۷) مولانا فراہیؒ نے ابرہہ کے لشکر کا بے مثال شجاعانہ دفاع کرنے کا تمغہ اہل مکہ کے علاوہ ان حاجیوں کو بھی عطا فرما دیا ہے جو اس سال حج کے لئے آئے تھے۔ حالانکہ اس وقت مکہ میں باہر سے آئے ہوئے کسی حاجی کے رہنے کی بات باور کرنے کے لائق نہیں ہے باہر سے آئے ہوئے حاجی تو تیرھویں چودھویں ذالحجہ کو اپنے اپنے وطن کو واپس ہو جاتے تھے اور ابرہہ کا لشکر ماہ محرم میں وادی محسر پہنچا تھا۔

(۸) مولانا فراہیؒ نے سنا ہے کہ جاہلیت کے شعرا و خطبا کے کلام کا بڑا گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور عربی زبان سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ بے شک نہایت مفید ہے لیکن اس مطالعہ کی وجہ سے مولانا کے ذہن میں جاہلیت کے عربوں کی جو اخلاقی تصویر مرتسم ہوئی تھی وہ صحیح نہ تھی۔ مولانا فراہیؒ کے گمان میں عام اہل عرب شجاعت سخاوت خودداری و عزت نفس میں دیگر ممالک کے باشندوں سے فائق و ممتاز تھے۔ یہ سراسر غلط ہے کسی قبیلہ میں اکا دکا

اشخاص ایسے بلند اخلاق ہوں تو ہوں عام اہل عرب ہرگز ایسے نہ تھے۔ وہ بہادر تھے آپس میں ایک دوسرے کو قتل و غارت کرنے کے لئے لیکن عجمی اقوام یعنی ایرانیوں اور رومیوں حبشیوں مصریوں سے ایسے ہی مرعوب تھے جیسے انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے باشندے انگریزوں سے مرعوب رہتے تھے۔ وہ صد درجہ لالچی اور کنجوس تھے۔ اپنے یتیموں پر بھی انہیں رحم نہ آتا تھا دیگر مسکینوں کا ذکر ہی کیا۔ ان کے شعرا نہایت جھوٹے ہوتے تھے۔ ان ہی جھوٹے شاعروں کے کلام کو مولانا فراہی نے سچائی پر مبنی باور کر لیا تھا۔ بے شک اہل عرب محاسن و مکارم میں شجاعت و سخاوت و شہادت میں۔ رحمدلی و مروت و شفقت میں صدق و امانت میں غرضیکہ تمام اخلاقی خوبیوں میں تمام اقوام عالم سے نہایت ممتاز و برتر بن گئے مگر کب ؟ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اسلام کی علمبرداری کے بعد پس یہ خیال کرنا سر سر غلط ہے کہ اہل مکہ نے ابرہہ کے لشکر پر سنگباری کرنے کی جرأت کی تھی۔

(۹) اگر اہل مکہ نے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہوتا تو شعرائے قریش نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔ اور قریش کی شجاعت و بسالت کا اپنے قصیدوں میں وہ صور پھونکتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ حالانکہ اس دور کے کسی بھی قریشی یا غیر قریشی شاعر نے لشکر ابرہہ کی تباہی کو انسانی شجاعت کا ثمرہ نہیں بتایا۔ جس شاعر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے محض اللہ کی آیت و قدرت اور اس کی غیبی مدد کے طور پر ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم متعدد شعرا کے اشعار نقل کر آئے ہیں

مولانا فراہیؒ کی اس غلط تاویل کو فرقہ قرآنیہ کے سرخیل چودھری غلام احمد پرویز نے معمولی سا تصرف کر کے اپنی کتاب لغات القرآن میں مولانا حمید الدین فراہی کا حوالہ دیئے بغیر یوں لکھا ہے۔

" اصحاب الفیل کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرہۃ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لے کر کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا اور اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں خفیہ راستہ اختیار کیا تھا لیکن گدھوں کے جھنڈ جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کس طرف جا رہی ہے اس لئے ہمیں اس کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک یعنی لاشیں ملیں گی۔ ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آگئے۔ انہیں دیکھ کر قریش عرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آ رہا ہے چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور کا پتھراؤ کیا کچھ تو خود ان پتھروں سے اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے وہ فوج بھس کی طرح ہو گئی " (لغات القرآن مصنفہ مسٹر پرویز مادہ ف ی ل)

اس عبارت کے آغاز میں صریح مغالطہ ہے "اس کے متعلق تاریخ بھی ہے" کے الفاظ سے ناواقف لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ یہ بیان تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے حالانکہ تاریخ میں تو یہ مذکور ہے کہ ابرھۃ الاشرم نے کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھائی کی تھی اللہ نے انہیں ہلاک کرنے کے لئے کچھ پرندے بھیج دیئے جنہوں نے لشکر ابرھہ پر سنگریزے پھینکے۔" لیکن یہ کہ اہل مکہ نے ان پر زوردار سنگباری کرکے تباہ کرڈالا تو یہ بات چودہ سو سال سے کسی مورخ نے بھی نہیں لکھی، یہ بات تو صرف مولانا فراہی نے لکھی ہے اور بس اپنی رائے کے طور پر لکھی ہے۔ واللہ ھو الموفق للصواب ———— انتھی بعون اللہ وحسن توفیقہ تفسیر سورۃ الفیل قبل العصر یوم الاربعاء ۱۳ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۵ھ، ۶ر مارچ ۱۹۸۵ء

بقیہ نکاح و طلاق

جو لوگ اس کا ترجمہ گزارہ زندگی کرتے ہیں، وہ عربی زبان اور شریعت دونوں سے ناواقف ہیں،

اوپر کی تفصیلات سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ نکاح و طلاق کا جو نظام اسلام کے ذریعہ انسانوں کو اللہ تعالے نے عنایت کیا، اس سے بہتر دنیا میں کوئی دوسرا نظام موجود نہیں ہے، نہ تو اسلام نے عورت کے سلسلہ میں کنیا دان کا تصور دیا ہے، جیساکہ ہندو مذہب میں ہے، کہ عورت مرد کی غلام بن کر رہ جائے، اور نہ مرد اور عورت کو اتنا بے بس کردیا ہے کہ وہ اگر کسی سبب سے ایک دوسرے سے علحٰدہ ہونا چاہیں تو عدالت کی مداخلت کے بغیر علحٰدہ نہ ہو سکیں، جیساکہ عیسائی مذہب میں ہے، اور پھر جس طرح نکاح کے بعد میاں بیوی دونوں کے کچھ حقوق و فرائض ہیں، اسی طرح طلاق کے بعد کچھ حقوق و فرائض ہیں، تاکہ یہ تعلق مستقل دشمنی اور عداوت کا سبب نہ بن جائے،،

نکاح و طلاق

اور

عدّت و نفقہ

(از مجیب اللہ ندوی)

راقم الحروف تین مہینے سے مسلسل مسلم پرسنل لا کی حیثیت اور اس کے سلسلہ میں حکومت اور بعض اور مسلمانوں کے طرز عمل کے بارے میں لکھتا رہا ہے، لیکن اسلامی شریعت میں طلاق و عدت اور اس کے حدود کیا ہیں؟ یہ پہلو ابھی پورے طور پر واضح نہیں ہو سکا، اور یہ پہلو بھی تشنہ رہ گیا ہے کہ خود ہندو مذہب میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس شمارے میں ہم طلاق و عدت کی شرعی حیثیت پر ذرا وضاحت سے بات چیت کریں گے،

نکاح ایک معاہدہ ہے | سب سے پہلے یہ بات ہم کو ذہن نشین کر لینی چاہیے، کہ اسلامی شریعت میں نکاح ایک معاہدہ ہے، میاں اور بیوی کے درمیان، اسی لیے اس کو عقد کہتے ہیں، عقد کے معنی گرہ دینے کے ہیں، گویا میاں بیوی مل کر اپنے کو ایک معاہدہ میں باندھ دیتے ہیں، اور جس طرح ہر معاہدہ کے کچھ تقاضے اور حدود ہوتے ہیں، اسی طرح میاں بیوی جب ایجاب و قبول کر کے عقد نکاح میں اپنے کو باندھ دیتے ہیں، اس کے برخلاف ہندو مذہب میں بیواہ کا مفہوم ایک دھارمک سنسکار ہے، جس کے ذریعہ میاں بیوی ایک دوسرے کے اٹوٹ انگ ہوتے ہیں، لیکن چونکہ یہ چیز فطرت انسانی کے خلاف تھی، اس لیے ہندو لا میں ستی کی رسم کو ختم کرنا پڑا ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۶ء تک کئی ترمیمات ہوئیں، جس میں ہندو بیواہ ادھنیم بنایا گیا، اور پہلی بار طلاق کا لفظ استعمال ہوا حالانکہ ہندو شاستر میں کہیں طلاق کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔

نکاح کے مقاصد | قرآن مجید میں نکاح کے لیے "عقدۃ النکاح" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے عقد عربی زبان میں گرہ لگانے اور باندھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی میاں بیوی ایجاب و قبول کے ذریعہ آپس میں بندھ جاتے ہیں۔ اور ایک نئے خاندان کو وجود میں لانے کا معاہدہ کرتے ہیں، جس طرح خود آدمی خرید و فروخت

کا معاہدہ کرتے ہیں اسی طرح نکاح بھی ایک معاہدہ ہے اس لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر لفظ بیع سے بھی نکاح کیا جائے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔

نکاح کے اخلاقی مقاصد | جس طرح ہر معاہدہ کسی مقصد کے تحت کیا جاتا ہے اسی طرح نکاح کے بھی کچھ اخلاقی مقاصد ہیں اگر نکاح کے ذریعہ وہ مقاصد پورے نہ ہوں تو پھر اس رشتہ سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ چیز معاشرہ کے لئے ایک فتنہ بن جاتی ہے۔

(۱) نکاح کا سب سے پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایک اچھا، صالح اور صحت مند خاندان وجود میں آئے تاکہ اس کے ذریعہ ایک اچھا اور صالح معاشرہ پیدا ہو۔ اگر کسی رشتہ نکاح سے یہ مقصد حاصل نہ ہو تو پھر ایسے رشتہ نکاح کو کاٹ دینا اور معاہدہ کو توڑ دینا ہی بہتر ہے اس لئے کہ اس صورت میں یہ چیز مستقل طور پر معاشرہ کے بگاڑ کا سبب بنے گی اسی بناء پر لڑکے اور لڑکی کے انتخاب میں دین وتقوی کو مقدم رکھا گیا ہے، خفیہ نکاح سے منع کیا گیا ہے اور دونوں کے حقوق وفرائض مقرر کر دیئے گئے ہیں، حضرت علی کے بھائی حضرت عقیل کی شادی ہوئی تو لوگوں نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا بالرفاء والبنین دونوں میں میل ملاپ رہے، اور بچے والے ہوں، آپ نے سنا تو فرمایا کہ یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو اللھم بارک لھم و بارک علیھم آپ کا خود معمول تھا کہ کسی شادی کرنے والے جوڑے کو مبارک باد دیتے تو یہ فرماتے

بارک اللہ لک وبارک علیک	اللہ تمہیں اسمیں داخلی طور پر بھی برکت دے
وجمع بینکما فی خیر	اور خارجی طور پر بھی برکت دے اور تمہیں بھلائی میں جمع رکھے

(بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۱۵)

یعنی جب تک یہ رشتہ نیکی و بھلائی کا سبب بنے اس وقت تک اسے قائم رہنا چاہیئے۔ ورنہ پھر اسکا باقی رکھنا بگاڑ کا سبب بنے گا

عفت وعصمت کی حفاظت | اسلام کے نزدیک نکاح کا سب سے بڑا مقصد انسان کی اس فطری عفت وعصمت کی حفاظت کرنا ہے۔ جو ہر انسان کے اندر خواہ مرد ہو یا عورت فطری طور پر موجود ہے، اسی کی حفاظت کے لئے اس نے زنا اور متعلقات زنا مثلاً بے پردگی، بے حجابی، بے شرمی کی باتوں اور اجنبی عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو حرام قرار دیا ہے، اور مرد وعورت دونوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ

دونوں ایک ایسے ضابطے کے ذریعے اپنا فطری تعلق قائم کریں اور قائم رکھیں، جس کے ذریعے ان کی عصمت وعفت مجروح ہونے کے بجائے محفوظ و مامون ہو جائے۔ قرآن نے اسی لئے بدکاری وزنا کو سفاح کے لفظ سے اور پاک دامانی اور نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا ہے، سفاح کے معنی کسی چیز کو بے کار بہانے اور ضائع کرنے کے ہیں اور احصان کے معنی محفوظ کرنے اور حفاظت گاہ بنانے کے ہیں گویا زنا کے ذریعے ایک مرد اور عورت اپنی فطری عصمت وعفت کو ضائع کرتے ہیں اور نکاح کے ذریعے اس کو محفوظ کرتے ہیں

أُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ	مذکورہ عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لئے
أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ	حلال ہیں، بشرطیکہ تم ان کو مہر دے کر ان کو
غَيْرَ مُسَافِحِينَ (النساء)	قید نکاح میں لانا چاہو آزاد شہوت رانی مقصود نہ ہو
فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ	تم ان کے ذمہ داروں کی اجازت سے ان
وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ غَيْرَ	سے نکاح کرو، اور حسب استطاعت ان کے مہر ادا
مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ	کرو، وہ پابند اور پاک دامن بن کر رہیں، علانیہ یا
أَخْدَانٍ (النساء)	چوری چھپے شہوت رانی کرنے والی نہ ہوں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ	اے نوجوانو! تم میں جو نکاح کی طاقت رکھتا
اسْتَطَاعَ مِنكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ	ہے وہ نکاح کرلے اس لئے کہ اس سے
فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ	نگاہیں نیچی اور شرم گاہیں محفوظ رہیں گی۔
لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ	اور جن کو استطاعت نہ ہو وہ روزے رکھیں
بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ (صحاح ستہ)	کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص زنا و بدکاری سے بچنا اور اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو اس کو قید نکاح کا پابند ہونا چاہیئے۔

الفت ومحبت | نکاح کی تیسری غرض یہ ہے کہ میاں بیوی کا یہ تعلق محض خواہش نفسانی کی تکمیل ہی کا سبب نہ ہو، بلکہ یہ تعلق محبت ومودت کی ایک مضبوط بنیاد ثابت ہو، اس کے ذریعے

دونوں کو سکون وراحت میسر ہو کیونکہ دو آدمیوں کا تعلق اگر سکون وراحت کی فضا نہ بنا سکے، تو پھر اس کے ذریعہ خدا کے دوسرے بندوں کے وہ حقوق کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے ان دونوں کو ایک رشتہ میں جوڑا گیا ہے، کیونکہ اگر خشت اول ہی کج رہے گی تو اس کے اوپر جو تعمیر ہوگی وہ بھی کج ہی ہوگی، خدا تعالے نے میاں بیوی کی الفت و محبت کو اپنی ایک خاص نشانی قرار دیا ہے

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ	اس کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ اس نے
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ
لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ	تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (روم)	درمیان الفت و محبت پیدا کر دی ہے
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	وہی ذات ہے جس نے ایک جان سے تم کو
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا	پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا
زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا (اعراف)	تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے

قرآن نے یہاں تین الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مودت، رحمت اور سکون، مودت میں ہر طرح کی محبت اور الفت آجاتی ہے اور رحمت کے لفظ میں ہر طرح کی ہمدردی، مہربانی اور غم گساری شامل ہیں، اور سکون کے لفظ میں ہر طرح کا سکون خواہ وہ جنسی سکون ہو یا ذہنی وقلبی، اس میں شامل ہے۔ قرآن نے ایک لفظ سکون میں فلسفۂ زوجیت کا پورا دفتر سمیٹ کر رکھ دیا ہے قرآن نے دوسری جگہ اس تعلق کو "لباس" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لئے اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ	وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان
لِبَاسٌ لَّهُنَّ، (بقرہ)	کے لئے لباس ہو۔

لباس کا لفظ بڑا جامع ہے، اس میں دسیوں معنی پوشیدہ ہیں۔ لباس آدمی کے جسم کو چھپاتا ہے، اس کو زینت دیتا ہے اس کی عزت اور خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے، اس کے جسم کو مضر اثرات سے بچاتا ہے۔ میاں بیوی کے تعلق کو لباس کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں

کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیے ایک دوسرے کی زینت و آرائش ہونا چاہیے۔ ان کے جسم و جان میں وہی اتصال ہونا چاہیے جو لباس اور جسم کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و مضرت کا احساس اور اس سے بچانے کا خیال ہونا چاہیے،

۴۔ حدود اللہ کا قیام | نکاح کی چوتھی غرض یہ ہے کہ یہ تعلق خدا کے مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کا سبب ہو، ان کے توڑنے کا سبب نہ ہو، چنانچہ قانون مناکحات کے ہر حکم کے وقت حدود اللہ کے قیام کی تاکید کی گئی ہے۔

اَن يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ (بقرہ) — یہ کہ دونوں حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں

نکاح و طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ (بقرہ) — جو لوگ اللہ کے قائم کردہ حدود سے آگے آ جائیں گے وہ ظالم ہیں۔

اسی وجہ سے مسلمانوں کے لیے کافروں سے رشتۂ مناکحت حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ کافروں سے حدود اللہ کے قیام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ مشرک اور مشرکہ سے نکاح حرام قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر یہ تم کو بھلے لگیں، جب بھی ان سے نکاح نہ کرو، کیونکہ

أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۔ (بقرہ ۲۶) — یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے ذریعہ جنت و مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے،

غرض یہ کہ رشتۂ نکاح کے ذریعہ عفت و عصمت کی حفاظت ہونی چاہیے، الفت و محبت کی فضا پیدا ہونی چاہیے، حدود اللہ کا قیام ہونا چاہیے، اگر اس کے ذریعے یہ مقاصد پورے نہ ہوں تو اس رشتے کو باقی رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو کاٹ کر ایسا رشتہ تلاش کیا جائے جس کے ذریعے یہ مقاصد پورے ہوتے ہوں، مگر اس رشتہ کے کاٹنے میں بھی معقولیت و انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ، — یا تو مناسب و معقول طریقے پر روک دیا جائے۔ یا پھر عمدگی کے ساتھ جدا کر دیا جائے۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ — یا تو ان کو معقول طریقے پر روک لو

منہ خوش بمعنی ذب   یا مجھ عمدہ طریقہ پر جدا کردہ،

چنانچہ فقہاء نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ جب مرد یا عورت کو یہ گمان اور خیال ہو کہ اس نکاح کے بغیر اس کی عفت و عصمت محفوظ نہ رہ سکے گی، تو نکاح واجب ہے، لیکن اگر اس عفت و عصمت کے محفوظ نہ رہنے کا یقین ہو جائے، تو پھر فرض ہے، اور اگر ان باتوں کا گمان، خیال یا یقین نہ بھی ہو تب بھی نکاح کرنا سنت ہے، لیکن اگر مرد کو یہ گمان یا خیال ہو کہ وہ عورت کے حقوق ادا نہ کر سکے گا، تو اس کا نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور اگر اس کو عدم ادائیگی حقوق کا یقین ہو تو پھر نکاح کرنا حرام ہے۔ (درمختار)

شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض

اسلامی شریعت میں جس طرح رشتۂ نکاح کے قائم کرنے کے لیے تفصیل سے قانونی اور اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں، اسی طرح رشتۂ نکاح کے قائم ہونے کے بعد اس کو خوشگوار اور استوار رکھنے کے لیے بھی اصولی طور پر شوہر و بیوی دونوں کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کر دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے عمل و اختیار کا دائرہ بھی متعین کر دیا گیا ہے اور حقوق و فرائض کی نشاندہی اور دائرہ عمل و اختیار کی تعیین اور ہر موقع کیلئے ہدایتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ یہی ایک ایسا رشتہ ہے جو باشعور ہونے کے بعد ایک مرد اور ایک عورت کو اتنی لمبی مدت تک باندھ رکھتا ہے اور اس رشتہ کے ذریعہ دو عورتیں اتنا ہی قرب ہو جاتا ہے جتنا قرب خون اور گوشت کا ہوتا ہے، لیکن یہ رشتہ اپنی طوالت اور قرب ہی کی وجہ سے اپنے اندر بڑی نزاکت بھی رکھتا ہے، اگر مرد و عورت دونوں اس کو قائم اور استوار رکھنے کے لیے مسلسل کوشش نہ کریں، اور ہر ایک اپنے اپنے دائرہ اختیار و عمل کا لحاظ و پاس نہ کرے تو یا تو یہ رشتہ ٹوٹ جائیگا یا اگر ٹوٹا نہیں تو اس کا بندھن اتنا کمزور ہو جائے گا، کہ اس کے ذریعے وہ مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے، جن کیلئے یہ گرہ لگائی گئی ہے، اور ان میں سے کوئی صورت بھی پسندیدہ نہیں ہے،

اسلامی شریعت میں مرد اور عورت کی حیثیت

میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی تفصیل سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی حیثیت پر روشنی ڈال دی جائے، کیونکہ ان کی اصلی حیثیت معلوم کیے بغیر ان کے حقوق و فرائض کی حیثیت اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتی،

مرد قوام ہے

دنیا کا چھوٹا یا بڑا کوئی کام بھی ہو اس کے نظم و نسق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اس کا اصل ذمہ دار قرار دیا جائے، اور دوسرے لوگ اس کی معیت میں کام کریں، اگر کسی کام کے لیے کوئی ذمہ دار نہ قرار دیا جائے، بلکہ جتنے کام کرنے والے ہیں ان سب کو مساویانہ حقوق دے دیئے

جائیں، تو پھر دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں پاسکتا، ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر، کالج میں پرنسپل، کارخانے میں منیجر، گھر میں ایک مالک اسی لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کے نظم و انتظام کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر ایک کام کے کئی نگراں اور ذمہ دار بنا دیئے جائیں تو پھر اس کام میں خلل پڑے گا، مثلاً اگر ایک اسکول کے تمام ماسٹر، ایک کالج کے تمام لکچرر، ایک کارخانے کے تمام کارکن اور ایک گھر کے تمام افراد ذمہ دار اور نگراں ہو جائیں، تو پھر اس اسکول، کالج، کارخانے کا نظم ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

ذکر آچکا ہے کہ رشتۂ مناکحت کے ذریعہ ایک نئے خاندان کی داغ بیل پڑتی ہے، اور خاندان کی داغ بیل ہی پر معاشرہ اور تہذیب و تمدن کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس لیے ایسے بنیادی اور اہم کام کے لیے کسی کو اصل ذمہ دار اور نگراں قرار نہ دیا جائے، تو پھر اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہونا ضروری ہے، اور جب اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہوگی، تو رشتۂ مناکحت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ مرد اور عورت میں کس کو اس ذمہ داری کا منصب دیا جائے، اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے، اس لیے اس نے عورت و مرد کی مخصوص فطرت کے پیش نظر یہ حق مرد کو عطا کیا ہے، موجودہ دور میں مرد و عورت کی مساوات کی جو کوشش کی جا رہی ہے، اسلامی شریعت کی رو سے یہ ایک غیر فطری کوشش ہے، اور واقعہ بھی ہے کہ یہ غیر فطری نظریہ جن قوموں نے پیش کیا ہے، وہ بھی مکمل طور پر ایک دن بھی اس پر عمل نہ کرسکیں، کیونکہ عورت کی مخصوص جبلت اور اس کے فطری اعمال و خواص اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، اور جہاں ان کو کچھ توڑنے یا موڑنے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں فائدہ کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہوئے ہیں، جن قوموں نے مساوات کے دھن میں عورت کو گھر سے نکال کر دفتر، پارک اور میدان سیاست میں پہنچایا ہے، اس کا نتیجہ ان کے سامنے جو کچھ ظاہر ہوا ہے، اس کی تصویر ایک مشہور امریکی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"اب ہم کھانا ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کھاتے ہیں، ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں، اگلے وقتوں میں تفریح کے لیے لوگ خانقاہوں کی طرف

رجوع کرتے تھے، لیکن اب اس کے لیے سینما ؤں تھیٹروں اور کلبوں کا رخ کرتے ہیں پہلے
خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا، اور خاندانی زندگی ہی میں سکون و آسائش تلاش کی جاتی
تھی، مگر اب خاندان کے افراد بکھر گیے، اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو ان کا مقصد ہی فوت
ہو گیا ہے، ہمارے گھر، ہمارے آرام و استراحت کی جگہ نہیں رہے، جہاں
بہر حال ہم رات گذارتے ہوں، (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۷ء)

قرآن میں مرد کو قوامیت کا درجہ دیتے ہوئے عورت پر اس کے اس فطری تفوق کی طرف
بھی اشارہ کر دیا گیا ہے، جس کی بنا پر عورت کے بجائے اس کو یہ مرتبہ عطا ہوا ہے،

الرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مردوں کو عورتوں کے اوپر قوام اس
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	لیے بنایا گیا ہے کہ فطری طور پر اللہ تعالیٰ
(نساء)	نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے،

قوام کے معنی قوام محافظ نگراں اور خبر گیری کرنے والے کو کہتے ہیں اور نگراں اور خبر گیری کا
لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اس کے اوپر جس کی وہ خبر گیری کر رہا ہے، کچھ امتیاز حاصل ہو، مگر امتیاز
کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کی حیثیت ایک لونڈی کی اور مرد کی حیثیت آقا کی ہو، بلکہ بنیادی
حقوق میں دونوں برابر ہیں، یہ تفوق اور مرتبۂ قوامیت مرد کو بعض ایسی ذمہ داریوں کی بنا پر دیا
گیا ہے جنھیں مرد کی مخصوص فطرت کے پیش نظر اسلام ان کی انجام دہی اسی پر ڈالتا ہے، چنانچہ
اسی حقیقت کو بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سے ظاہر کیا گیا ہے، ورنہ جہاں مرد کے
تفوق کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ عورتوں کے بنیادی حقوق ان پر اسی طرح ہیں
جس طرح ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ	اور قاعدہ شرعی کے مطابق عورتوں کا
بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ	حق مردوں پر اسی طرح ہے جس طرح
دَرَجَةٌ (بقرہ ۲)	مردوں کا حق عورتوں پر ہے، اور مردوں
	کا کچھ مرتبہ ان سے زیادہ ہے،

عورتوں کے حقوق یا مردوں کے فرائض مردوں کے اوپر عورتوں کے حسب ذیل حقوق ہیں، یا دوسرے

الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قوام اور ذمے دار ہونے کی حیثیت سے مردوں کے حسب ذیل فرائض ہیں:۔

۱۔ مہر | قوام ہونے کی حیثیت سے شوہر کا پہلا فرض مہر کی ادائیگی ہے، یہ مہر مرد کو نکاح ہی کے وقت ادا کر دینا چاہیے۔ اگر اس وقت ادا نہ کرے تو اس کے لیے عورت سے مہلت لینی چاہیے، یہ ایسا حق ہے کہ اگر نکاح کے وقت اس کا ذکر نہ آئے جب بھی شریعت نے مرد کے اوپر اس کی ادائیگی ضروری قرار دی ہے، اگر عورت اس کو ادائیگی کی مہلت دے دے، تو اس مہلت کے بعد اسے فوراً ادا کر دینا چاہیے، ورنہ عورت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس کو مباشرت سے روک دے، اس حق سے عہدہ برآ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اسے ادا کر دے۔ دوسرے یہ کہ عورت اپنی خواہش سے یا اس کے حسن سلوک کے عوض میں معاف کر دے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مرد نے عورت پر دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیا ہے تو اخلاقاً و قانوناً اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اگر کسی وجہ سے میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے، اور دونوں میں علیحدگی ہو جائے تو مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ مہر میں ادا کی ہوئی رقم عورت سے واپس لے لے۔

۲۔ نفقہ | شوہر کا دوسرا ضروری فرض یا عورت کا دوسرا حق نفقہ ہے۔ نفقہ کے معنیٰ وہ چیز جو آدمی خرچ کرے یعنی قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے روٹی کپڑے اور دوسری ضروریات زندگی کا سامان کرے، مرد کی قوامیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کی قوامیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ اپنی کمائی عورت کے اوپر صرف کرتا ہے، وبما انفقوا من اموالھم یہاں مال سے مراد مہر کی رقم بھی ہے اور روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ بھی،

نفقہ کا معیار | (۱) نفقہ اگرچہ عورت کا حق ہے، مگر اس کی ذمہ داری چونکہ شوہر کے اوپر ہے، اس لیے اس کی حیثیت اور آمدنی کے لحاظ ہی سے یہ ذمہ داری اس پر ڈالی جائے گی، لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اس سلسلہ میں عورت کی حیثیت، مرضی اور خواہش کا لحاظ بالکل نہ کیا جائے، بلکہ اس کا خیال بھی شوہر کو کرنا پڑے گا،

قرآن میں نفقہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ — فارغ البال آدمی کو (بیوی بچوں پر) اپنا

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ،

وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور جو تنگ حال ہو اس کو بھی چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے، (بخل نہ کرے)

(طلاق)

عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ،

(بقرہ)

خوش حال پر اس کی وسعت کے مطابق نفقہ ہے، اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے،

یہ احکام گو طلاق کے موقع کے ہیں، مگر ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر طلاق یعنی اس رشتے کے کٹ جانے کے بعد بھی مرد کی حیثیت سے لحاظ کرنا ضروری ہے تو پھر نکاح یعنی اس رشتے کے قیام کے وقت بدرجہ اولیٰ ضروری ہونا چاہیے،

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! عورتوں کے اوپر ہمارے کیا حقوق ہیں؟ فرمایا:-

اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طعمت وتکسوها اذا کتسیت ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجر الا فی البیت،

جب تم کھاؤ تو ان کو بھی کھلاؤ، اور جب تم پہنو تو ان کو بھی پہناؤ، اور ان کے منہ پر نہ مارو، ان کی شکل و صورت اور ان کے کام کاج میں عیب نہ نکالو، اور برا بھلا نہ کہو (اور اگر کچھ ناگواری ہو جائے تو) گھر کے اندر اس کی خوابگاہ اپنے سے علیحدہ کردو (یعنی ناراضگی اتنی طویل نہ ہو جائے کہ وہ گھر کے باہر میکے وغیرہ جانے پر مجبور ہو)

آپؐ نے اپنے آخری حج میں جو خطبہ دیا تھا، اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ فرمایا تھا "ولهن علیکم نفقتهن وکسوتهن بالمعروف" ان کے کھانے پینے اور کپڑے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے

قرآن و حدیث کی انہی ہدایات کی روشنی میں فقہا نے حسب ذیل احکام مستنبط کیے ہیں،

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر حال میں شوہر کی حیثیت اور اس کی آمدنی کو نفقہ کا معیار قرار دیا ہے، مگر امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے درمیان کی راہ اختیار کی ہے، وہ یہ کہ اصل لحاظ تو مرد کی آمدنی ہی کا کیا جائے گا، مگر عورت کی حیثیت بالکل نظر انداز نہیں کی جائیگی، قرآن و حدیث کی مذکورہ روایتوں سے بھی اس رائے کی زیادہ تائید ہوتی ہے،

ضروری مسائل (۱) اگر مرد مالدار ہو، یا اس کی آمدنی اچھی خاصی ہو، اور عورت بھی مالدار گھرانے کی ہو، تو مرد کو اپنی حیثیت اور عورت کی حیثیت اور اس کے معیار زندگی کا خیال کرکے نفقہ دینا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت اپنے گھر تو اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہو، اور شوہر بھی اس حیثیت کا ہو کہ اس کے معیار کے مطابق خرچ دے سکتا ہو، مگر بخل کی وجہ سے موٹا جھوٹا کھلاتا پہناتا ہو، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو عورت اس سے قانوناً اپنے معیار کا کھانا کپڑا طلب کر سکتی ہے،

(۲) اگر مرد خوش حال ہو، یا اس کی آمدنی خوش حال جیسی ہو، مگر عورت کسی غریب گھرانے کی ہو، تو مرد کو عورت کی حیثیت کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق نان نفقہ دینا چاہیے، شوہر بخل کی وجہ سے اس کی غربت سے فائدہ اٹھاکر اگر اس کی غربت و تکلیف میں رکھنا چاہے، تو عورت قانوناً اس سے زائد کا مطالبہ کر سکتی ہے،

(۳) اگر مرد غریب اور تنگ حال ہے، اور عورت بھی غریب گھر کی ہے تو پھر مرد کو اپنی اور عورت کی حیثیت کے مطابق ہی روٹی کپڑا دینا چاہیے، عورت اسکی حیثیت سے زیادہ نہیں مانگ سکتی،

(۴) اگر مرد غریب ہو، اور عورت مالدار اور خوشحال گھرانے کی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت کے ساتھ اس کی حیثیت کا لحاظ کرکے نفقہ دینا چاہیے، مگر خود عورت کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مرد سے اس کی حیثیت سے زیادہ نفقہ طلب نہ کرے، ورنہ یا تو وہ خرچ سے مجبور ہو کر حرام ذریعۂ آمدنی تلاش کرے گا یا پھر دونوں کے تعلقات خراب ہو جائیں گے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے ہمیشہ تنگی سے بسر کی، لیکن ایک بار جب فتوحات وغیرہ کے ذریعہ آپ کے پاس کافی مال آنے لگا، تو انھوں نے بھی اپنے نفقہ میں زیادتی کی خواہش کی، مگر یہ خواہش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناگوار ہوئی، اور خدائے تعالٰی کو بھی، چنانچہ قرآن میں ان کی سخت تنبیہ کی گئی،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ   اے نبی! اپنی ازواج سے کہدیجئے

اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	کہ اگر تم کو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ	زیادہ پسند ہے اور تم وہی چاہتی ہو، تو
وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا	آؤ میں تم کو کچھ کپڑا وغیرہ دے دوں،
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ	اور پھر تم کو عمدہ طریقے سے علیحدہ کردوں،
رَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ	اور اگر تم خدا اور اس کے رسول اور
فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ	آخرت کی طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ نے
اَجْرًا عَظِيْمًا	نیکو کار عورتوں کے لیے بہت بڑا
(احزاب)	اجر رکھا ہے،

چنانچہ اس تنبیہ کے بعد انھوں نے پھر کبھی نفقے کی زیادتی کا مطالبہ نہیں کیا، اس آئینہ میں ہر مسلمان عورت کو اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے،

(۵) آرائش و زیبائش کی وہ چیزیں جو عورتوں کی صحت و صفائی کے لیے ضروری ہیں وہ بھی نفقے میں داخل ہیں، اور ان کا فراہم کرنا بھی مرد کے لیے ضروری ہے، مثلاً تیل، کنگھی، صابون، غسل و وضو کا پانی وغیرہ، البتہ جو چیزیں محض آرائش و زیبائش کی ہوں، اور ان سے کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، مثلاً پان، تمباکو، پاوڈر، لپسٹک وغیرہ، ان کا فراہم کرنا مرد پر ضروری نہیں ہے،

(۶) اگر عورت ایسے گھر کی ہے جہاں لوگ اپنے ہاتھ سے کام کاج نہیں کرتے، بلکہ نوکر چاکر کرتے ہیں، یا عورت اتنی کمزور یا مریض ہے جس کی وجہ سے اس سے گھر کا کام کاج نہیں ہوتا تو شوہر ایسی عورت کو کام کاج پر مجبور نہیں کرسکتا، بلکہ اس کو بغیر کام کیے ہوئے بٹھا کر روٹی کپڑا دینا پڑے گا،

اگر ایسی عورت اپنے ذاتی کام کے لیے یا گھر کے کام کاج کے لیے ملازم کا مطالبہ کرے، تو شوہر اگر خوشحال ہے تو اس کو ملازم رکھنا پڑے گا، اور اس کا خرچ اس کو دینا پڑے گا، لیکن اگر شوہر کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ملازم رکھ سکے تو پھر عورت کو گھر کے اندر کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرنا پڑے گا، اور مرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ باہر کا کام خود کرے مثلاً سودا

صاف، جنس، لکڑی اور پانی وغیرہ گھر میں لادے۔ اگر مرد یہ چیزیں فراہم نہیں کرے تو عورت
پر اس کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔

بعض علمائے فقہ نے لکھا ہے کہ کپڑے کی دھلائی مرد کے اوپر واجب نہیں ہے، بلکہ
اس کو صرف پانی اور صابون فراہم کر دینا ضروری ہے، عورت اپنے ہاتھ سے اپنا کپڑا دھولے،
اگر مرد دھلائی دیتا ہے تو یہ اس کا احسان ہے، یعنی یہ عورت کا قانونی حق نہیں ہے، لیکن
راقم کے خیال میں یہ احسان اس صورت میں تو ہو سکتا ہے جب اس کے اندر اس کی ادائیگی
کی استطاعت نہ ہو، اور پھر بھی وہ دیتا ہو، یا عورت اپنے گھر اس کی عادی رہی ہو لیکن شوہر
اپنے گھر میں اس کو اپنے ہاتھ سے کپڑا دھونے نہیں دیتا، بلکہ دھوبی سے دھلواتا ہے، لیکن جب
مرد میں استطاعت ہو، یا عورت اس کام کی عادی نہ ہو تو اس کو کپڑے کی دھلائی بطور حق ملنا
چاہیے، جب مرد کی وسعت اور عورت کی حیثیت کا خیال کر کے اس کو خادم مل سکتا ہے، تو
صحت وصفائی کی دوسری چیزیں بطور استحقاق کیوں نہ ملنی چاہئیں، البتہ اگر عورت اس
کا بار مرد پر نہ ڈالے تو یہ اس کا احسان ہے، اور اس تعلق کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں ایک
دوسرے سے صرف قانونی تعلق نہ رکھیں، بلکہ اخلاقی تعلق بھی رکھیں، یعنی ایک دوسرے کی
تکلیف وآرام کا خیال رکھیں،

(۷) اسی طرح بعض علماء نے لکھا ہے کہ دوا علاج کا خرچ شوہر کے اوپر واجب نہیں
ہے، بلکہ اس کے اوپر صرف نان نفقہ واجب ہے، اگر وہ دوا علاج کرتا ہے تو یہ اس کا احسان
ہے، اس مسئلہ میں بھی راقم کی رائے یہ ہے کہ دوا علاج خاص طور پر اس زمانے میں انسان کی
اس سے کم بنیادی ضرورت نہیں ہے جیسے کہ تیل، کنگھی اور صابن وغیرہ ہے، جب عورت
کے جسم کی صحت وصفائی کے لیے ان چیزوں کے فراہم کرنے کو فقہاء نے واجب کہا ہے، تو پھر
دوا علاج کیوں نہ واجب ہو، پھر فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالغ لڑکوں کا نفقہ باپ پر واجب
نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بالغ لڑکا بیمار پڑ جائے تو پھر اس کا نان نفقہ باپ پر ضروری ہو جاتا ہے، اور
پھر یہ تو لڑکا ہے، فقہاء نے مضاربت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کو علاج کا خرچ بھی ملے گا، کیونکہ
بغیر اس کے مضاربت کا کام وہ نہیں کر سکتا، تو عورت سے جو فوائد متعلق ہیں ان کا لحاظ کر کے

اس کے دوا علاج کا خرچ مرد پر ضروری کیوں نہ قرار دیا جائے ، اگر عورت اس کا بار خود شوہر پر نہ ڈالے تو یہ عورت کا احسان کیوں نہ سمجھا جائے ، اس کے علاوہ مرض کی اور اس کے دوا علاج کی جو اہمیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتی ہے ، اس کی روشنی میں بھی یہ عورت کا ایک ضروری حق قرار دیا جانا چاہیے ،

اسی طرح بچہ جننے کے وقت دائی وغیرہ کی فیس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ اس کو وہ برداشت کرے گا جو اس کو بلائے گا ، یعنی اگر بیوی خود بلائے گی تو وہی برداشت کرے گی ، اور اگر شوہر بلائے گا تو وہ برداشت کرے گا ، راقم کے خیال ناقص میں اس کو بھی ہر حال میں مرد ہی کی ذمہ داری ہونی چاہیے ، کیونکہ جب بچہ اس کا ہے ، جب اسی پر اس کے دودھ پلوانے کی اجرت اور اس کا نفقہ واجب ہے تو پھر ولادت کے وقت کے تمام اخراجات اس پر کیوں نہ واجب ہوں ، جب کہ یہ ایسا نازک موقع ہوتا ہے ، کہ اس وقت کی ذرا سی بے احتیاطی سے زچہ اور بچہ دونوں کی جان خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ،

۳ - سکنی | سکنیٰ کا لفظ سکون سے نکلا ہے ، یعنی گھر میں پہنچ کر آدمی چونکہ سکون محسوس کرتا ہے ، اس لیے اس کو سکون کی جگہ کہتے ہیں ، مرد کا تیسرا فرض یا بیوی کا مرد کے اوپر تیسرا حق یہی ہے ، یعنی مرد کو عورت کی اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک گھر بھی دینا ہوگا ، نفقہ یعنی روٹی کپڑے کی طرح سکنیٰ بھی عورت کا ایسا حق ہے کہ طلاق کے بعد اختتام عدت تک عورت کو شوہر اس سے محروم نہیں کرسکتا . قرآن میں ہے :

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ ، (طلاق)	ان کو اپنے مقدور بھر وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو ،

ایک مسلمان عورت کے لیے اس کی کتنی اہمیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے ، تو مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد دوسرا کام یہ کیا کہ ازواج مطہرات کے سر چھپانے کے لیے مکان کی تعمیر فرمائی ، حتیٰ کہ آپ نے طلاق پانے والی عورتوں کو بھی عدت تک نفقہ و سکنیٰ دلایا ،

گھر کیسا ہونا چاہیے ؟ اس کی تفصیل فقہاء کی زبانی سنیے :

(۱) بیوی کو حق ہے کہ مکان شوہر کے گھر کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے ، لیکن خواہ مخواہ

مرد کو اس کی وجہ سے ورد سر مول نہ لینا پڑے، لیکن اس کے باوجود مناسب یہ ہے کہ شوہر خود یا اس کے گھر والے عورت کے لیے گھر کا ایک گوشہ یا ایک کمرہ مخصوص کر دیں، تاکہ وہ اپنی چیزیں ایک جگہ حفاظت سے رکھ سکے، اور میاں بیوی وہاں بے تکلفی سے رہ سکیں، اور گھر کے دوسرے لوگوں سے اس سلسلہ میں کوئی اختلاف کی نوبت نہ آئے،

(۲) اگر عورت سب کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اپنے لیے ایک علاحدہ گھر کا مطالبہ کرتی ہے تو مرد کے لیے اس کو علاحدہ کمرہ یا کم سے کم گھر کا کوئی گوشہ اس کے لیے مخصوص کر دینا ضروری ہے، جس کو وہ بند کر سکے یا جہاں وہ حفاظت سے اپنا سامان بھی رکھ سکے۔ اور میاں بیوی لیٹ بھی سکیں جو جگہ یا کمرہ اس نے اس کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ اس میں عورت جسے چاہے آنے دے، اور جسے چاہے نہ آنے دے، اس کے علاوہ دوسری چیزیں مثلاً غسل خانہ، پاخانہ اور باورچی خانہ الگ دینا ضروری نہیں ہے، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے جب شوہر معمولی حیثیت کا ہو، لیکن اگر شوہر مالدار ہے، تو اس کو ایسا گھر دینا چاہیے، جس میں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں ہوں، مثلاً غسل خانہ، پاخانہ، باورچی خانہ وغیرہ۔ (رد المحتار شرح درمختار)

۴۔ حسن سلوک | جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، عورت و مرد کا تعلق محض ایک کاروباری تعلق نہیں ہے، بلکہ ان دونوں میں وہی تعلق ہوتا ہے، جو جسم و جان اور خون و گوشت میں ہوتا ہے، اس لیے ان کو جو حقوق دیے گیے ہیں، ان کی ادائگی محض رسمی طور پر نہ ہونی چاہیے، بلکہ ان کی ادائگی ایک عبادت اور انتہائی پسندیدہ کام سمجھ کر کرنی چاہیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک دینار جو آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے، اور ایک دینار جو اپنے اہل و عیال پر صرف کرتا ہے، دونوں کا اجر برابر ہے۔ (مسلم)

آپؐ نے اسی بنا پر بیوی سے حسن سلوک کی سخت تاکید کی ہے، حسن سلوک کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ اس کو روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری مادّی ضروریات زندگی فراہم کردی جائیں، کیونکہ یہ تو ایسے قانونی حقوق ہیں، جنھیں اسے بہر حال ادا ہی کرنا ہوگا، خواہ خوشی سے ادا کرے یا بجبر، لیکن اس نازک رشتے کی پاکیزگی، لطافت اور راہیت کا تقاضہ یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ کیا جائے، رہنے، سہنے، کھانے پینے میں مساوات برتی جائے، بات چیت میں نرمی

اور ملاطفت ملحوظ رکھی جائے۔ اس کو بات بات میں ٹوکا اور ڈانٹا نہ جائے، اس کی غلطی اور نقصان سے درگذر کیا جائے۔ اس سے کام لینے میں اس کی کمزوری اور نازک فطرت کا لحاظ کیا جائے۔ قرآن میں بار بار معروف طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے،

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝

(نساء)

اور عورتوں کے ساتھ حسن و خوبی کے ساتھ رہو، اگر ان کو تم کسی وجہ سے ناپسند کرتے ہو، تو ممکن ہے کہ ایک چیز جو تمہیں ناپسند ہو اس میں خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے بہت سی بھلائیاں اور فائدے رکھ دیئے ہوں،

اس آیت میں دو ہدایتیں دی گئی ہیں، ایک تو معروف طریقے پر رہنے سہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ معروف کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے، اس میں ہر طرح کی قانونی اور اخلاقی خوبیاں اور بھلائیاں آجاتی ہیں، اس کی پوری تفصیل آگے ارشادات نبوی میں آتی ہے، دوسرے یہ کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ کرنے میں معروف طریقہ سے اسی وقت ہٹتا ہے، جب اس کو یا تو بیوی کی ظاہری خصوصیات پسند نہ ہوں، یا پھر اس کی باطنی خصوصیات مثلاً مزاج یا سیرت و کردار میں کوئی خرابی پاتا ہو، یا اس نے اپنے ذہن میں عورت کی صورت و سیرت کا جو بلند معیار بنایا تھا، وہ اس معیار سے کچھ فروتر نظر آئی ہو، تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ انتہائی حکیمانہ بات کہی گئی ہے، کہ وہ اول وہلہ ہی میں ان کی اختیاری یا غیر اختیاری کمزوریوں کی وجہ سے ان سے نفرت نہ کرنے لگیں، بلکہ ان کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ ایک عورت جس کی شکل و صورت، رفتار و گفتار اور ناز و انداز اس کو پسند نہ ہو، مگر اس کا باطن بہت اچھا ہو، مثلاً وہ انتہائی فرمانبردار اور کفایت شعار ہو، صابر و شاکر ہو، ہنرمند و سلیقہ مند ہو، بخلاف اس کے ہوسکتا ہے کہ ایک عورت اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے اس کے معیار پر پوری اترتی ہو لیکن سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات میں بالکل صفر ہو، اس لیے ظاہری حسن و جمال سے محروم بیوی کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے میں جلدی نہ کرنی چاہیے، بلکہ صبر سے کام لینا چاہیے اشکال

صورت اس کے اختیار کی چیز نہیں ہے،

معروف اور غیر معروف طریقۂ معاشرت یا حسن سلوک کی پوری تفصیل حدیث نبوی میں ملے گی، چند حدیثیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، آپ نے فرمایا:۔

خیرکم خیرکم لاھلہ (ترمذی)	تم میں سے اچھا وہ شخص ہے، جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہو،

"اپنے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ تم میں سب سے بہتر ہوں"۔

آپ نے فرمایا:۔

خیارکم خیارکم لنسائھم (مسند احمد، ترمذی)	تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہوں،

بیوی کے معاملہ میں صبر و ضبط کا م لینے کی جو ہدایت قرآن میں دی گئی ہے، آپ نے اس کی تفسیر میں فرمایا:۔

لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر، (مسلم)	مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ اپنی بیوی میں کوئی برائی یا خلاف مرضی بات دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگے، اگر اس کو اپنی بیوی کی ایک عادت ناپسند معلوم ہوتی ہے تو اس کی دوسری عادت اسے پسند بھی آسکتی ہے،

عورتیں چونکہ فطرۃً کمزور ہوتی ہیں، اس لیے ان کی طبیعت میں عام طور پر ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے، اور یہ کمزور آدمی کا خاصہ ہوتا ہے، اس لیے جب کسی عورت سے کسی کمزوری کا ظہور ہو تو اس کے دور کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سختی و درشتی سے کام لیا جائے، بلکہ ان کو سمجھا بجھا کر اسے دور کرنا چاہیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تشبیہ دے کر عورت کی اس فطری کمزوری کو سمجھایا، اور اس کے دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے، آپ نے فرمایا:۔

استوصوا بالنساء فان	عورتوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو،

المرأة خلقت من ضلع فان ذهبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء،	عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اس لیے وہ اسی کے مانند کج ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے، تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر تم اسی ٹیڑھے پن کے ساتھ اس سے کام لوگے، تو اچھا نتیجہ برآمد ہوگا، تو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو،

(بخاری ومسلم)

۵۔ ظلم وزیادتی اور ایذا رسانی

اسی حسن سلوک کا تقاضا ہے کہ ان کے اوپر ظلم وزیادتی نہ کی جائے، ان کو ایذا، اور تکلیف نہ دی جائے مثلاً بلا وجہ ان کو مارا نہ جائے، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے، ان کی دلشکنی نہ کی جائے، ان کے اوپر طعن وتشنیع نہ کی جائے، انہیں اپنے اعزہ واقربا سے ملنے سے روکا نہ جائے، ان کی مادی ضرورتوں کے ساتھ ان کی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا بھی خیال کیا جائے۔ قرآن نے ظلم وزیادتی سے باز رہنے کا حکم اپنی منکوحہ عورتوں ہی کے بارے میں نہیں، بلکہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں بھی دیا ہے،

ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ، (بقرہ)	ان کے اوپر زیادتی کرنے اور ایذا پہنچانے کے لیے ان کو روک رکھو، اور جو ایسا کریگا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا،

دینی کاموں کی وجہ سے عورت کی حق تلفی

بعض لوگ دین کے غلط تصور کی بنا پر نماز وروزہ یا دین کے کام میں ایسا منہمک ہو جاتے ہیں کہ عورتوں کے مادی اور جنسی حقوق سے انکی توجہ بالکل ہٹ جاتی ہے۔ ایسا کرنا ثواب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بے سہارا بندۂ خدا کی حق تلفی ہے اور حق تلفی بہرحال گناہ ہے، ایک بڑے ممتاز صحابی ہر وقت نماز روزے میں لگے رہتے تھے، اور بیوی کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی، آپؐ کو اطلاع ملی، تو آپ نے بلا کر تنبیہ فرمائی، اور فرمایا کہ:

وان لزوجک علیک حقا	تمہاری بیوی کا بھی تمہارے اوپر حق ہے،

حضرت عمرؓ چار پانچ ماہ کے بعد فوجیوں کو میدان جہاد سے اس لیے گھر واپس کر دیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حق زوجیت کو ادا کر سکیں،

دینی تربیت | ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے ہدایت کی ہے کہ رشتۂ نکاح کے قائم کرنے میں لڑکے اور لڑکی کی ظاہری خوبیوں ہی کو وجہ ترجیح نہ بنایا جائے۔ بلکہ ترجیح کی بنیاد دین و اخلاق کو بنانا چاہیے، ورنہ فساد عظیم برپا ہوگا، یہ حدیث اس کے علاوہ بعض اور احادیث اور قرآن کی آیات سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ مرد کے اوپر بحیثیت نگراں و ذمے دار یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی دینی و اخلاقی تربیت بھی کرتا رہے، قرآن میں ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا	اے مسلمانو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح عام مسلمانوں کو دین کی باتیں بتاتے تھے، اسی طرح گھر میں اپنی ازواج مطہرات کو دین و حکمت کی باتیں بتاتے رہتے تھے، چنانچہ ازواج مطہرات کو مخاطب کرکے کہا گیا:۔

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ،	اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، انکو یاد رکھو،

حضرت مالک بن حویرثؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم چند نوجوان اسلام لانے کے بعد مسجد نبوی میں حصول تعلیم کے لیے حاضر ہوئے، اور آپ کی خدمت میں بیس دن رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نرم خو، اور رحم دل تھے، آپؐ کو بیس دن کے بعد یہ خیال ہوا کہ ہم لوگ گھر واپس جانا چاہتے ہیں، چنانچہ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ گھر میں کس کو چھوڑ آئے ہیں، جب ہم نے بتایا تو آپؐ نے فرمایا:۔

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم ومروھم (بخاری ومسلم)	اپنے اہل و عیال میں واپس جاؤ، اور انہی میں رہو سہو، اور ان کو (علم دین) سکھاؤ اور ان کو نماز روزہ اور نیکی کا حکم دو،

اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو عام احکام قرآن و حدیث میں آئے ہیں، ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کو باہر کی فکر سے پہلے گھر کی فکر کرنی چاہیے، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے اپنے قریبی لوگوں میں تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ — اپنے کنبے والوں کو انجام سے باخبر کردو۔

بعض فقہا نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ اگر شوہر بیوی کو نماز کی تاکید کرتا ہے، اور وہ نماز نہیں پڑھتی تو طلاق دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ مہر دینے پر قادر نہ ہو (عالمگیری) دینی تربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر بعض ائمہ نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ اگر کوئی آدمی عورت کا مہر مقرر کرے کہ ہم اس کو قرآن پڑھائیں گے تو اس سے بھی نکاح ہو جائے گا، گو اس کو نقد مہر بھی دینا پڑے گا

مگر بیوی کی اصلاح و تربیت میں ان احکام کو سامنے رکھنا چاہئے، جو اصلاح و تربیت کے سلسلے میں دئے گئے ہیں، یعنی یہ اصلاح و تربیت حکمت و موعظت اور موقع و محل کے ساتھ ہو، اس سے خالی نہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حدیث نبوی بھی سامنے رہنی چاہئے جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کی اصلاح میں اس کی فطری کمزوری اور کجی کو ملحوظ رکھا جائے ورنہ وہ درست ہونے کے بجائے ٹوٹ جائے گی۔

خلع و تفریق | اگر کوئی مرد اپنے فرائض انجام نہیں دیتا، تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اس مرد سے صلح و مصالحت کے ذریعہ اپنے حقوق لینے کی کوشش کرے اگر صلح و مصالحت سے بات نہ بن سکے تو پھر وہ قانونی طور پر اسے حاصل کرے، اور اگر اس سے بھی وہ مطمئن نہ ہو، تو پھر اس کو حق ہے کہ وہ اس سے خلع و تفریق کرالے۔

عورتوں کے فرائض اور مردوں کے حقوق | اسلامی شریعت نے عورتوں کے فرائض یا ان کے اوپر مردوں کے حقوق مندرجہ ذیل مقرر کئے ہیں۔

(۱) بیوی پر مرد کا سب سے پہلا فرض یہ ہو جاتا ہے، کہ عورت اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرے، عفت و عصمت کی حفاظت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت کرے، بلکہ جو چیزیں اس کی آبرو کو کسی درجہ میں داغ دار بناتی ہوں وہ ان کا ارتکاب ہی نہ کرے، مثلاً پردہ کرے، کسی نامحرم مرد سے بلا ضرورت بات چیت نہ کرے، شوہر کے علاوہ کسی محرم کے سامنے منہ اور ہاتھ کے علاوہ سر، سینہ اور دوسرے اعضا کو کھلا نہ رکھے، بغیر اجازت گھر سے باہر نہ جائے قرآن میں عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ — نیک عورتیں وہ ہیں جو شوہر کی غیر موجودگی میں اللہ کی توفیق سے اپنی عزت وآبرو اور شوہر کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔

(۲) عورت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مال کی حفاظت کرے اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں عزت وآبرو کی حفاظت کے ساتھ مال کی حفاظت بھی شامل ہے، حدیث نبوی میں بھی عصمت وعفت کی حفاظت اور مال کی حفاظت دونوں کے بارے میں سخت تاکید آئی ہے۔ آپ نے ایک صالح عورت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ بِمَا يَكْرَهُ — جس چیز کو شوہر اس کے نفس اور اپنے مال کے بارے میں ناپسند کرتا ہے اس کے خلاف وہ نہ کرے۔ (نسائی، بیہقی)

آپ نے فرمایا کہ جو شخص چار چیزیں پا جائے وہ دنیا کی سب سے بڑی دولت پا گیا۔ ایک شکر گذار قلب، دوسرے اللہ کو یاد کرنے والی زبان، تیسرے ایسا جسم جو آزمائش کے وقت صابر ہو، چوتھے، زَوْجَةٌ لَا تَبْغِيهِ خَوْنًا فِي نَفْسِهَا وَلَا فِي مَالِهِ (بیہقی شعب الایمان) ایسی عورت جو اپنے نفس وعزت وآبرو اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے۔

مال کی حفاظت یہ بھی ہے کہ گھر کی کوئی چیز، شوہر کی اجازت کے بغیر نہ دے حتیٰ کہ اگر وہ کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ کر دے، تو اس کا ثواب شوہر کو اور عذاب عورت کو ہوگا اور شوہر کو اس سے باز پرس کرنے اور اس چیز کو یا اس کی قیمت کو واپس لینے کا حق ہوگا

(۳) عورت کا تیسرا فرض یہ ہے کہ عورت ہر نیک کام اور حق بات میں شوہر کی اطاعت کرے قرآن میں ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ — نیک عورتیں وہ ہیں جو فرماں بردار ہوتی ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تقوی کے بعد آدمی کے لئے، اللہ کی سب سے بڑی نعمت صالح عورت ہے اور صالح عورت وہ ہے کہ شوہر جو اس سے کہے اسے وہ ماننے اور جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور اگر شوہر قسم کھا کر یعنی اس کے اعتماد پر کوئی بات کہہ دے تو وہ اسے پورا کر دے، اور جب وہ گھر میں نہ ہو تو اپنے نفس کی اور اس کے مال کی حفاظت کرے (ابن ماجہ)

ضروریات زندگی کی طلب میں اعتدال | عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کی حیثیت اور اس کی آمدنی کا خیال کرکے اپنی ضروریات پوری کرائے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ازواج مطہرات نے تعیش و آرام کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنی ضروریات کے لئے کچھ زیادہ نفقہ طلب کیا، تو ان کو سخت تنبیہ کی گئی۔ اسی بنا پر عورتوں کو بے ضرورت زینت و آرائش سے منع کیا گیا ہے تاکہ ان میں بے جا طلب نہ پیدا ہو۔ عہد نبوی میں عورتیں اپنے سر کے بالوں کو خوبصورت بنانے کے لئے کچھ خارجی بال لگا لیا کرتی تھیں، اس کے بارے میں آپ نے فرمایا فَاِنَّہٗ زُوْرٌ تَزِیْدُہٗ فِیْہِ (نسائی) یہ ایک طرح کا فریب ہے، آپ نے اسی بنا پر گدنے گدوانے اور اپنے چہرے کے روئیں صاف کرنے اس کی حد سے زیادہ تراش خراش کرنے۔ دانتوں کو رگڑ رگڑ کر چمکانے سے منع فرمایا ہے۔ (مسند احمد)

اوپر ایک حدیث کا ذکر آچکا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ سب سے مبارک رشتہ نکاح وہ ہے جس میں آدمی کو کم سے کم اخراجات کی پریشانی اٹھانی پڑے۔ (دارمی) پھر حدیث میں ایسی عورت سے نکاح کی ترغیب دی گئی ہے جو دین و اخلاق کے ساتھ کم سے کم ضروریات زندگی پر راضی ہو جائے۔

احسان شناسی | عورتوں میں ایک بڑی اور عام کمزوری احسان ناشناسی بھی ہے۔ یعنی اگر ان کے ساتھ زندگی بھر سلوک کرتے رہیے، اور ایک دو بار ذرہ برابر بدسلوکی کر دیجئے، تو پھر ساری زندگی کے بدسلوک کو بھلا کر صرف اس کی ایک بدسلوکی کو یاد رکھیں گی، اور وقت بے وقت اس کو دہراتی رہیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ناشکری کی وجہ سے عورتیں زیادہ تر دوزخ میں ڈالی جائیں گی آپ نے فرمایا کہ عورتیں سب سے زیادہ ناشکری کرتی ہیں۔ "یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَۃَ" یہ (عورتیں) اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو شوہر کے ساتھ احسان شناسی اور شکر گذاری کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے، یعنی وہ محنت مزدوری کرکے جو کچھ اسے دیتا ہے اس کو خدا کا شکر ادا کرکے خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیئے۔ البتہ اگر وہ اپنی حیثیت سے کم دیتا ہے، یا اپنے کھانے پینے کے پیچھے اس کی پرواہ نہیں کرتا تو اس کو بولنے کا حق ہے اور یہ بولنا احسان ناشناسی نہیں ہوگی۔

رضاعت | رضاعت یعنی دودھ پلانے کی وجہ سے جو رشتے کسی رضیع اور مرضعہ کے لئے حرام ہو جاتے ہیں، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب اس پر دوسری حیثیت سے بحث کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ یہ حق

کس کا ہے۔ دوسرے فرائض کے ساتھ ماں کا ایک فرض اپنے بچے کو دودھ پلانا بھی ہے۔ گو بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ ماں کے ذمے سے یہ فرض ہٹ جاتا ہے مگر یہ ذمہ داری ہے ماں ہی کی۔ قرآن میں اس فرض کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ
وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا
لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَ
لَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ
تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا
أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ

(بقرہ)

اور مائیں پورے دو سال تک اپنے بچوں
کو دودھ پلایا کریں یہ بات اس کیلئے ہے جو پوری
مدت دودھ پلوانا چاہے اور باپ کے اوپر قاعدے
کے مطابق ان مرضعہ ماؤں کا کھانا کپڑا ہے ہر شخص
کو اس کی برداشت کے مطابق ہی حکم دیا جاتا ہے
نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے
اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور اگر باپ
نہ ہو تو اسی طرح وارث کو کرنا چاہیئے۔ اگر دونوں
آپس کی رضامندی اور مشورے سے وقت
سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان کے اوپر
کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم کسی دوسری
عورت سے اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہتے
ہو تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ
تم حسب دستور ان کو معقول اجرت دے دو

ان روایات کی روشنی میں فقہا نے حسب ذیل احکام مستنبط کئے ہیں۔

دودھ پلانا کب واجب ہے اور کب مستحب | بعض صورتوں میں ماں پر دودھ پلانا واجب ہے اور بعض صورتوں میں مستحب دونوں صورتوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے

(۱) اگر باپ کم حیثیت ہے، تو ماں کے اوپر دودھ پلانا واجب ہے جیسا کہ قرآن کے پہلے ٹکڑے میں کہا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو طلاق مل جائے تو عدت بھر بغیر اجرت کے اس کو دودھ پلانا چاہیئے۔
(۲) اسی طرح اگر بچہ ماں کے علاوہ کسی کا دودھ نہیں پیتا، تو بھی عورت پر بچے کو دودھ پلانا واجب ہے

واجب کا حکم | جن صورتوں میں ماں کو دودھ پلانا واجب ہے، ان میں نہ تو عورت اجرت مانگ سکتی ہے، اور نہ خدمت سے انکار کر سکتی ہے۔ اگر کرے گی تو گناہ گار ہوگی، اور اس کو دودھ پلانے پر قانوناً مجبور کیا جائے گا، کیونکہ ماں اگر دودھ پلائے گی، تو باپ کو خواہ مخواہ ایک زحمت اٹھانی پڑے گی اور قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ ولا مولود له بولده یعنی باپ اپنے لڑکے کی وجہ سے زحمت و مشقت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

جن صورتوں میں واجب نہیں ہے | ان صورتوں میں دودھ پلانا واجب نہیں ہے

(۱) اگر مرد مالدار ہے اور وہ کسی عورت کو اجرت پر رکھ کر دودھ پلوا سکتا ہے تو اس صورت میں اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرتی ہے تو اس کو اس کا حق ہے

(۲) اگر ماں مریض ہے، یا بہت کمزور ہے، تو باپ کا فرض ہے کہ وہ ماں سے دودھ نہ پلوائے ورنہ عورت کو نقصان پہنچے گا اور قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا ماں اپنے بچے کی وجہ سے کسی مشقت میں نہیں ڈالی جا سکتی۔

جس صورت میں ماں دودھ پلانے سے معذور ہے، یا معذور تو نہیں ہے مگر باپ باحیثیت ہے، اور وہ دودھ نہیں پلاتی ہے تو اس صورت میں نہ تو وہ گنہگار ہوگی اور نہ باپ اس کو دودھ پلانے پر مجبور کر سکتا ہے، نہ عورت پر قانونی دباؤ ڈال سکتا ہے، لیکن جب ماں کو کوئی مرض یا مجبوری نہیں ہے تو صرف زحمت سے بچنے کے لئے یا شوہر کی خوشحالی سے فائدہ اٹھانے کے لئے بچے کو دودھ نہ پلانا بری بات ہے، کیونکہ یہ عورت کا فرض ہے۔ گو شوہر کی خوشحالی کی صورت میں اس پر قانوناً پابندی نہیں ہے مگر یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ ماں اپنے بچے کے ساتھ اتنی محبت بھی نہ رکھے کہ اس کو اپنے دودھ تک سے بھی محروم کر دے۔ پھر اس لئے بھی ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ دودھ کا اثر صرف بچے کے جسم ہی پر نہیں بلکہ اس کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے، اس لئے وہ جس طرح عورت کا دودھ پیئے گا ایسا ہی اس کا اخلاق و کردار ہوگا اور اس معیار کی عورت ملنا آسان نہیں ہے۔

حضانت یعنی بچے کی پرورش | بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں۔ شوہر و بیوی کے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا ایک اہم فرض بچے کی پرورش بھی ہے۔ گویہ دونوں کا مشترکہ حق ہے۔ یعنی بچے کی پرورش دونوں کو مل جل کرنا چاہیئے اوپر دودھ پلانے کے سلسلے میں جو ماں

باپ کے حقوق کی تفصیل کی گئی ہے، وہ بھی اسی حضانت ہی کی ایک شاخ ہے۔ بچے کی ابتدائی پرورش ہی پر اس کی ساری زندگی کی اچھائی اور برائی کا دارومدار ہے۔ اس لئے اس فرض کے سلسلے میں ماں باپ کو غفلت نہ کرنی چاہیئے۔

بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہمیت

بچے کی پرورش کی ذمے داری کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ماں باپ اس کی جسمانی پرورش اور نشوونما کا سامان فراہم کر دیں، بلکہ اس کی جسمانی نشوونما کے ساتھ اس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح، اس کی تعلیم و تربیت بھی ان کے اوپر واجب ہے، دونوں طرح کی تربیتوں کی شریعت میں تاکید آئی ہے، خاص طور پر ان کی دینی اصلاح اور تعلیم و تربیت پر قرآن میں بہت زور دیا گیا ہے۔

جسمانی پرورش کے احکام

قرآن کے حکم کے مطابق ماں کا فرض ہے کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی دودھ پلانا شروع کر دے۔ اور اگر وہ معذور رہو یا باپ کو استطاعت ہو، یا دونوں راضی ہوں، تو وہ دوسری عورت سے بھی دودھ پلوا سکتے ہیں اگر کوئی ماں باپ ایسے ظالم ہوں کہ وہ اس فرض کو نا انجام دیں تو وہ سخت گناہگار ہوں گے، اور ایسے بچے کی پرورش کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے ذمے ہوگی پہلے وہ ماں باپ کو اس پر مجبور کرے گی، اگر کسی وجہ سے وہ معذور ہوں گے تو اس کا خرچ حکومت خود برداشت کرے گی۔

بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں لوگ عموماً لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر لڑکیوں کی پرورش کی تاکید کی ہے آپ نے فرمایا ہے،

من کانت لہ انثی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یوثر ولدہ علیھا الذکور ادخلہ اللہ الجنۃ،	جس کے کوئی لڑکی ہو اور اس نے اس کو زندہ درگور نہیں کیا، اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہیں دی تو اللہ تعالےٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا

آپ نے فرمایا کہ جس نے اپنی تین لڑکیوں کی پرورش اور کفالت اس وقت تک کی، جب تک کہ وہ اس سے بے نیاز نہیں ہوگئیں، یعنی ان کا شادی بیاہ ہوگیا تو اس کے اوپر جنت واجب ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ابن عباسؓ

فرماتے ہیں اگر کوئی ایک کے میں سوال کرتا تو ایک کے بارے میں بھی آپ یہی فرماتے۔ (شرح السنۃ)

بچوں کی پرورش کی اہمیت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے دودھ چھوڑنے کے بعد ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، بعد میں جب ان کو علم ہوا کہ مائیں وقت سے پہلے دودھ چھڑا دیتی ہیں کہ ان کو وظیفہ مل جائے تو پھر آپ نے پیدا ہوتے ہی ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

بچے کی پرورش کی مدت | لڑکے کی پرورش کی مدت سات برس اور لڑکی کی پرورش کی مدت نو برس ہے۔ اس مدت تک پرورش کی نگرانی، ماں کے ذمے ہوگی اور ماں اور بچہ دونوں کا خرچ باپ کو برداشت کرنا ہوگا، اور یہ ماں کا ایسا حق ہے کہ اگر اس کو طلاق مل چکی ہو جب بھی بچے کو سات برس تک اور بچی کو نو برس تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور باپ سے اس کے اخراجات لے سکتی ہے، باپ اس سے بچے کو نہیں لے سکتا، البتہ اگر طلاق کے بعد ماں خود خوشی سے بچے کو حوالہ کر دے تو پھر یا وہ اجنبی جگہ نکاح کرلے تو پھر باپ کو اس کی پرورش کرنی ہوگی، اور اس کی مطلقہ ماں کو پرورش کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا "یا رسول اللہ یہ میرا بچہ ہے، جو میرے پیٹ میں پلا ہے میری چھاتی کا دودھ پیتا ہے، اور جس کے لئے میری گود آرام گاہ ہے، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور میرے اس لخت جگر کو مجھ سے جدا کر لینا چاہتا ہے۔ آپ نے اس کی داستانِ غم سن کر فرمایا کہ

تم اس وقت تک اس کی زیادہ مستحق ہو جب تک تم دوسرا نکاح نہ کرلو۔ (ابوداؤد)

(۱) اگر عورت خدانخواستہ مرتد ہو جائے، یعنی اپنا دین بدل دے، تو بچے کو اس کی پرورش اور نگرانی میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر وہ بداخلاق و بدکردار ہو یعنی اس میں ایسے اخلاقی عیوب ہوں مثلاً زنا، چوری، گانا بجانا وغیرہ، جن کی موجودگی میں بچے کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی عورت کی نگرانی اور گود میں بچے کو نہیں دیا جا سکتا۔ صاحب مختار فاجرہ کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یَضِیعُ الوَلَدُ بِہٖ کَزِنیً وَغِنَاءٍ وَسَرِقَۃٍ	ایسے عیوب مثلاً زنا، گانا، بجانا، چوری میں سے بچہ برباد ہو جائے

پھر کہتے ہیں کہ عام طور پر "فاجرہ" کا لفظ فقہائے احناف مطلقاً لکھتے ہیں اس سے وہ عورت

بھی مراد لی جا سکتی ہے، جو مستقلاً تارک نماز ہو، اور یہی مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔
بعض علماء نے تضییع الولد کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے اگر کوئی ایسی عورت ہے جو نماز روزے میں اتنی مشغول ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش کا اس کو مطلقاً خیال نہیں ہے، تو ایسی عورت کی نگرانی میں بھی بچہ نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس سلسلہ میں فقہائے احناف نے اس راستے کو زیادہ پسند کیا ہے کہ اگر ماں کا اخلاق و کردار اچھا نہیں ہے۔ جب بھی اس وقت تک بچے کو اس کے پاس رکھا جائے۔ جب تک وہ بچہ سمجھ دار نہ ہو جائے۔ سمجھ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کی حرکات و سکنات کا عملاً اثر نہ لینے لگے
ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ بچے کی جسمانی پرورش میں اس کی دینی اور اخلاقی تربیت کو بہر حال پیش نظر رکھا جائے گا۔

(۲) اگر ماں مطلقہ ہے اور اس نے کسی ایسے شخص سے نکاح کر لیا جس سے بچے کا کوئی ایسا نسبی تعلق نہیں ہے جس کی وجہ سے نکاح حرام ہو جاتا ہے تو اب اس کا حق پرورش جاتا رہا، البتہ اگر اس نے بچے کے کسی قریبی اعزہ ہی میں کسی سے نکاح کر لیا ہے، تو پھر اس کا حق اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔ پہلی صورت میں اس لئے اجازت نہیں دی گئی ہے کہ اس کے موجودہ شوہر کو بچے سے کوئی خاص انسیت نہ ہوگی بلکہ وہ بار محسوس کرے گا اور اس کا اثر ماں کے اوپر یہ پڑے گا کہ وہ بچہ کی دیکھ بھال اچھی طرح نہ کر سکے گی۔ دوسری صورت میں اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ چونکہ اس کا شوہر بھی بچے سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ تو ماں ہی ہے اس لئے اس کی دیکھ بھال سے دونوں کو دلچسپی ہوگی۔

ماں کے بعد پرورش کا حق (۳) ماں اگر پرورش کرنے کی اہل نہ ہو یعنی فاسقہ یا فاجرہ ہو یا اس نے انکار کر دیا ہو، یا اس نے کسی اجنبی سے نکاح کر لیا ہو تو اس کے بعد اس کی ماں یعنی بچے کی نانی کو پرورش کا حق ہے، اگر نانی نہ ہو تو پر نانی، اور یہ بھی نہ ہوں تو دادی کو، پھر حقیقی بہن کو، پھر ماں جائی اور سوتیلی بہن کو، پھر خالہ کو، پھر پھوپھی کو پرورش کرنی ہوگی۔

ان میں سے جس کی پرورش میں دیا جائے گا، انہی شرائط کے ساتھ دیا جائے گا جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی جس کا ذہن و اخلاق اچھا ہوگا اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ بچے کی دو خالائیں ہوں، یا دو پھوپھیاں ہوں، تو جو خالہ یا پھوپھی زیادہ پرہیزگار ہوگی، اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔

باپ کے خرچ کی ذمے داری | جب تک باپ موجود ہے بچے کے اخراجات کی ذمے داری باپ کے اوپر ہے۔ لیکن اگر باپ مرجاتے تو اگر بچے کے نام پر کوئی جائیداد یا نقد روپیہ ہے تو اسی سے اس کی پرورش کا خرچ لیا جائے گا، اور اگر اس کے نام کوئی جائیداد یا روپیہ نہیں ہے، تو پھر بچے کے ان قریبی رشتے داروں کے ذمے ہے جو اس کے وارث ہو سکتے ہیں، اور ہر ایک پر میراث کے اعتبار سے خرچ کی ذمے داری ہوگی۔ مثلاً اس کا دادا بھی زندہ ہے اور ماں بھی تو دو حصے کا خرچ دادا کو دینا پڑے گا، اور ایک حصہ ماں کو، اسی طرح دوسرے اعزہ پر اس کی ذمے داری ڈالی جائے گی

تعلیم و تربیت | بچے کی جسمانی پرورش اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ اس کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی سب سے پہلے ماں اور اس کے بعد باپ کے ذمے ہے اگر انہوں نے اس کے جسم کی پرورش کی اور اس کے باطن کی تربیت نہ کی، تو ایک طرف انہوں نے رشتۂ زوجیت کے ایک بڑے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، اور دوسری طرف معاشرہ میں اصلاح پیدا کرنے کے بجائے فساد کا ایک مستقل بیج بو دیا۔ کیونکہ جس بچے کی ذہنی اور اخلاقی تربیت نہیں کی جاتے گی تو اس سے یہی امید جا سکتی ہے کہ بڑا ہو کر اپنے بچوں کے لئے اپنے خاندان اور پھر پورے معاشرہ کے لئے دینی و اخلاقی حیثیت سے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگا گویا ایک لڑکے کی تعلیم و تربیت ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک خاندان اور معاشرہ کی تعلیم و تربیت دینے کے مترادف ہے اور اس میں کوتاہی برتنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاندان اور ایک پورے معاشرے کو برباد کیا جا رہا ہے اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے جن کاموں کو صدقۂ جاریہ قرار دیا ان میں ایک ولد صالح بھی ہے، کیونکہ اس کی نیکی سے، اس کو، اس کے بال بچوں کو، خاندان کو اور پھر پوری سوسائٹی کو فائدہ پہنچے گا، اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا جاتے گا اور نہ جانے یہ فیض کب تک جاری رہے گا، اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن نے عام مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (تحریم) — اے مسلمانو! تم اپنی ذات کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

اس چھوٹے سے فقرے میں تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کو نہایت جامع طور پر بیان کر دیا

گیا ہے غور کیجیے، حکم یہاں آگ سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے بال بچوں کو ایسی ہی تعلیم اور ایسی ہی تربیت دینی چاہیئے جو ان کو عذاب نار سے بچا سکے اور جو تعلیم و تربیت اس کو دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے، وہ تعلیم نہ تو تعلیم ہے اور نہ وہ تربیت، تربیت، اگر کوئی مسلمان اپنے بچے کو ایسی تعلیم و تربیت دیتا ہے جو اس کو دوزخ میں لے جانے والی ہو تو پھر وہ نہ تو اپنے ایمان کے تقاضے کو پورا کر رہا ہے اور نہ باپ اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے اپنی اس ذمے داری کو پورا کر رہا ہے، جو اس پر عائد کی گئی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ ہر شخص سے اپنی ذمے داری کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں بے شمار ہدایتیں دی گئی ہیں مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں، اس لئے چند حدیثیں اور نقل کر کے اس بحث کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے آپ کا ایک دوسرا ارشاد ہے جس میں آپ نے بچے کی ایک تنبیہ کو ایک صاع صدقہ سے بہتر قرار دیا ہے۔

لَأَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ	آدمی اپنے بچے کو کوئی ادب و تمیز کی بات سکھائے، تو یہ ایک صاع (ساڑھے تین سیر غلہ یا میوہ) صدقہ کرنے سے بہتر ہے

لوگ بچوں کے لئے روپیہ پیسہ جمع کرتے ہیں، ان کے لئے جائدادیں اکٹھا کرتے ہیں، ان کو مادی حیثیت سے خوش حال بنانے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں، جو ان کے بس میں ہوتا ہے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے سب سے بہتر عطیہ اور سب سے بہتر ہدیہ و تحفہ ان کی تعلیم و تربیت ہے

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهُ مِنْ نُحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی)	کسی باپ کا اپنے بچے کے لئے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں ہے کہ وہ اس کو اچھی اور عمدہ تعلیم و تربیت دے

عملی تعلیم و تربیت | آپ نے صرف نظری طور پر ہی تعلیم و تربیت دینے کا حکم نہیں دیا ہے

بلکہ یہ تاکید بھی کی ہے کہ عملاً بھی ان کو اسی کے مطابق بناؤ اور اگر ضرورت ہو تو ان کو اس کے لئے سخت تنبیہ بھی کرو، آپ نے فرمایا کہ۔

"بچے سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو، اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ان کو مار کر نماز پڑھاؤ اور ان کو بستر سے علیحدہ کر دو (ابوداؤد) بستر سے علیحدہ کرنے کا حکم کتنی اخلاقی اور معاشرتی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کا اندازہ ہر بچے والا کر سکتا ہے۔

تنبیہ و تادیب | اگر کوئی عورت یہ مذکورہ فرائض انجام نہیں دیتی ہے یا ان میں کوتاہی کرتی ہو تو وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر رہی ہے، ایسی صورت میں نہ تو گھر کا نظم و انتظام درست رکھا جا سکتا ہے، اور نہ ایک پاکیزہ اور اچھا خاندان بن سکتا ہے، چونکہ بحیثیت قوام، گھر کے نظم و انتظام اور اس کی دیکھ بھال اور درستگی کی اصل ذمے داری مرد کے اوپر ہے اور ہر ذمے دار کو نظم و انتظام درست رکھنے کے لئے کبھی نہ کبھی سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی کے پیش نظر اسلامی شریعت نے شوہر کو ضرورت کے وقت بیوی کی تنبیہ و تادیب کرنے کی اجازت دی ہے اور اگر تنبیہ و تادیب سے بھی وہ نہیں مانتی تو پھر اس کو مارنے، اس سے ایلا کرتے اور پھر بدرجۂ مجبوری طلاق دینے کی اجازت بھی دی ہے

جس طرح عورتوں کو شوہروں کی ناشکری سے بچنا چاہیئے، اس طرح مردوں کو خواہ مخواہ عورتوں پر ہر وقت اپنی بڑائی کا حق جتانا نہ چاہیئے، بلکہ ان کو تنبیہ و تادیب کا حربہ اس وقت استعمال کرنا چاہیئے، جب ان سے نشوز پایا جائے۔

وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۔ (نساء)	جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو، تو پہلے ان کو سمجھاؤ بجھاؤ، پھر ان کی خوابگاہوں میں ان سے علیحدہ رہو، اور اس کے بعد ان کو مارو۔ اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر سختی کرنے کی راہ تلاش نہ کرو۔

نشوز کے معنی اٹھ جانے کے ہیں۔ یعنی رشتۂ نکاح کا جو احترام اور لحاظ و پاس ہے۔ وہ عورت کے دل سے اٹھ جائے۔ چنانچہ یہ آیت معاً اس آیت کے بعد ہے جس میں عورت کے فرائض کا ذکر

کیا گیا ہے

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ ، — صالح عورتیں وہ ہیں جو فرماں بردار اور غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نشوز سے مراد ان فرائض کی عدم ادائیگی ہے جن کا ذکرا وپر کیا گیا ہے، حتیٰ کہ بعض مفسرین نے ان کی نظر کی بے احتیاطی کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی عورت اپنی عزت و آبرو کی، شوہر کے گھر بار اور مال و متاع کی حفاظت نہیں کرتی۔ معروف یعنی نیکی میں اس کی اطاعت نہیں کرتی تو وہ ناشزہ ہے، اس کو تنبیہ و تادیب کی جا سکتی ہے۔ اس آیت میں تنبیہ و تادیب کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں، پہلے ان کو نرمی اور ملاطفت سے سمجھایا جائے۔ اگر سمجھانے بجھانے سے مان جائیں تو خیر ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے ترک مباشرت کرلی جائے ترک مباشرت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی دو چار دن روٹھ جائے، اور ان کے ساتھ سونا بیٹھنا اور جنسی تعلق چھوڑ دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایلاء کرے۔ یہ حربے عورتوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اگر عورت کی فطرت میں کچھ بھی سلامت روی ہے تو مرد کی نظر التفات ہٹ جانے کے ساتھ ہی وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرے گی، لیکن کوئی عورت اس سے بھی نہ مانے تو آخری حربہ یہ ہے کہ تم اس کو مار پیٹ کی ہلکی سزا بھی دے سکتے ہو۔

مگر عورت کو ہر غلطی پر زد و کوب کرنا انتہائی گناہ ہے، بلکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہ بالکل آخری حربہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے استعمال میں زیادتی کرے گا تو پھر اس سے قانونی بازپرس بھی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس آخری اجازت کے استعمال کرنے کی جو تفسیر کی ہے اس کو اگر نظر انداز کر دیا گیا تو پھر ایک غلطی کی جگہ دوسری غلطی اور ایک ظلم کی جگہ دوسرا ظلم ہو گا۔ آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں عورتوں کے بارے میں جو اعلان فرمایا تھا اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِی النِّسَآءِ فَاِنَّهُنَّ عِنْدَکُمْ عَوَانٍ وَلَکُمْ عَلَیْهِنَّ اَنْ لَّا یُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ اَحَدًا تَکْرَهُوْنَهٗ — عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو، وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں تمہارا ان کے اوپر حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو

فَاِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوْهُنَّ غَیْرَ مُبَرِّحٍ ۔

ان سے نہ روندوائیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو ان کو معمولی مار مار سکتے ہو۔

"بستر روندنے" سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آئیں، جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے، یا ان کی طرف سے شوہر کے دل میں کوئی شک وشبہ ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اگر وہ بھلائی میں تمہاری اطاعت نہ کریں، تو ان کو معمولی مار مار سکتے ہو، ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر وہ کھلی بے حیائی پر اتر آئیں تب یہ صورت اختیار کرنی چاہئے یعنی مارپیٹ کی اجازت کے ساتھ دو شرطیں لگی ہوئی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ کسی بھلے اور معروف کام میں اطاعت نہ کریں، دوسری یہ کہ مار معمولی ہو۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مسواک وغیرہ جیسی چھوٹی چیز سے مارنا چاہیے تاکہ اس کو سخت چوٹ نہ آئے۔ (تفسیر طبری) ظاہر ہے کہ مسواک سے مارنے کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سخت قسم کی تنبیہ بھی ہو جائے اور اس کو شدید چوٹ بھی نہ آئے، ورنہ اسلامی شریعت نے جب جانوروں کو بھی سخت مارپیٹ کی اجازت نہیں دی ہے، تو صنف لطیف کے بارے میں وہ ایسی اجازت کیسے دے سکتی ہے

طلاق کے ذریعہ علیحدگی اوپر رشتۂ نکاح کو قائم کرنے اور پھر اس کو باقی رکھنے کے لئے جو قانونی اور اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں اگر عورت و مرد دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ان کا لحاظ نہیں کرتا ہے، یا دونوں کے جو حقوق و فرائض مقرر کئے گئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ان کو ادا نہیں کرتے یا ان کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں، یا ان میں سے کوئی کسی کی حق تلفی کرتا ہے جس کی وجہ سے دونوں میں کوئی عارضی اختلاف رونما ہو جاتا ہے یا کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کے لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ دونوں صلح و مصالحت کے ذریعے اپنا اختلاف اور کشیدگی دور کرلیں۔

قرآن میں اس کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ جب میاں بیوی میں کسی اختلاف کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو دونوں خود یا ان کے سرپرست یا جن کی بات دونوں مانتے ہو، وہ دو آدمیوں کے سامنے اس معاملے کو رکھ دیں، جس کی بنا پر اختلاف پیدا ہوا ہے اور یہ دونوں آدمی جو فیصلہ کر دیں خواہ وہ کسی کے خلاف پڑے یا موافق اس کو دونوں مان لیں۔ یہ دو آدمی جو حکم و ثالث بنائے جائیں

ان میں ایک عورت کا نمائندہ ہونا چاہئے، اور دوسرا مرد کی طرف کا۔ قرآن میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا	اگر تم دونوں میں شدید اختلاف کا خوف ہو
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا	تو اس کو نہ بڑھنے دینے کی صورت یہ ہے کہ ا
اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ	ایک ثالث و پنچ مرد کی طرف سے اور ایک عورت
بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا	کی طرف سے بھیجا جائے اگر یہ دونوں اختلاف دور
خَبِيْرًا ،	کرنا اور واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ

دونوں میں ضرور موافقت کی توفیق دے گا، اور اللہ علیم خبیر ہے

لیکن جیسا قرآن نے اشارہ کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں آدمی جو ثالث مقرر کئے گئے ہیں، دونوں فیصلہ کرنے کے اہل ہوں اور واقعی ان کا مقصد دونوں میں صلح و مصالحت کرانا ہو اور پھر خود میاں بیوی بھی ان دونوں کی باتیں مانیں، تب یہ اختلاف دور ہو سکتا ہے یعنی خدا کی توفیق اسی وقت شامل حال ہوگی جب مذکورہ طریقے سے اس کی کوشش کی جائے گی۔

اگر اس کوشش کے بعد بھی دونوں میں صلح و صفائی نہ ہو سکے، اور دونوں کا اختلاف اور کشیدگی ایسی مستقل نفرت و عداوت کی صورت اختیار کرے کہ اب نباہ ممکن نہ ہو یا کسی فریق کی بے توجہی، حق تلفی، ایذار سانی، دوسرے فریق کی برداشت سے باہر ہو جائے، اور گمان غالب ہو کہ اگر اس رشتہ کو نہ کاٹا گیا تو پھر دوسرے معاشرتی معائب یا برائیاں پیدا ہو جائیں گی، تو پھر اس صورت میں عورت کو خلع و تفریق کے ذریعہ، مرد کی قوامیت سے نکل جانے کا اور مرد کو طلاق کے ذریعے، عورت کی ذمے داری سے سبکدوش ہو جانے کا حق دیا گیا ہے۔

طلاق کے لفظی معنی بندھن کھولنے کے ہیں، اور شریعت میں اس گرہ اور بندھن (عقد) کے کھول دینے کو طلاق کہتے ہیں جو نکاح کے ذریعہ لگائی گئی تھی گویا جو گرہ رشتۂ نکاح کے ذریعہ لگائی گئی تھی، وہ طلاق کے ذریعہ کھول دی گئی ہو۔

طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے | مرد کو یہ اختیار ضرور دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہے طلاق دے کر رشتۂ نکاح کی ذمے داری سے نکل سکتا ہے، لیکن اس اختیار کے باوجود قرآن و حدیث میں عقد زوجیت کو کھولنے اور اس رشتۂ نکاح کو کاٹنے سے پہلے بار بار غور کرنے اور اس فیصلے

سے پہلے تعلقات کو استوار کرنے کی ترغیب دی ہے، کیونکہ

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـٴًـا وَّ	ممکن ہے کہ تمہیں عورت کی کوئی بات
یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا	ناپسند ہو اور خدا نے اس میں بہت سی بھلائیاں رکھی ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ اگر بیوی کی کچھ عادتیں یا شکل و صورت تمہیں ناپسند ہے جس کی بنا پر تم اسے طلاق دے رہے ہو تو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اس کے اندر کچھ خوبیاں بھی ہوں گی جو ممکن ہے دوسری عورت میں نہ ہوں۔

اسلامی شریعت نے مرد کو طلاق کی اجازت اور اختیار ضرور دیا ہے، مگر یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے اس لئے اس اختیار کو آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الطَّلَاقُ	اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قابل نفرت چیز طلاق ہے
(ابو داؤد، ابن ماجہ)	

آپ نے فرمایا کہ نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الذَّوَّاقِیْنَ	اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مزہ چکھنے والوں
وَالذَّوَّاقَاتِ	اور چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی طلاق کسی مجبوری سے دی جا سکتی ہے مگر اس کا مقصد تجدید لذت نہ ہونا چاہیئے ایک حدیث میں ہے کہ جب تک عورتوں کی کھلی ہوئی بے حیائی نہ دیکھو طلاق نہ دو۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان یعنی ابلیس روزانہ اپنا پایہ تخت پانی کے اوپر بچھاتا ہے اور اپنے ماتحت شیاطین کو لوگوں کو بہکانے اور بھلائی سے ہٹانے کے لئے بھیجتا ہے، چنانچہ تمام شیاطین اپنا کام کر کے واپس آتے ہیں تو ہر ایک اس کے سامنے اپنا اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ یعنی اپنی فتنہ سامانی کا ذکر کرتا ہے، ابلیس کہتا ہے کہ تم لوگوں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا ہے، پھر ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں میاں بیوی میں جدائی کرا دی، یہ سن کر شیطان اس

کو گلے سے لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے البتہ ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ (مسلم)

طلاق خدا اور رسول کو اس لئے ناپسند اور شیطان کو اس لئے پسند ہے کہ اس رشتہ کے کٹ جانے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ دو آدمی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے بلکہ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنے رشتے کٹ جاتے ہیں، اور خاندان اور معاشرے میں بغض وعداوت کی ایک مستقل بنیاد پڑ جاتی ہے، کتنے نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ طلاق ایک گھر کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک رشتہ نکاح کی وجہ سے میاں بیوی کے کتنے اعزا اقارب ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں، ان میں مہر ومحبت پیدا ہو جاتی ہے، کتنے بے گانے یگانے ہو جاتے ہیں۔ طلاق کے ذریعہ یہ سب باتیں یہی نہیں کہ یک لخت ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ اب مہر ومحبت کے بجائے بغض وعداوت کی بنیاد پڑ جاتی ہے، ان کی یگانگت بے گانگی سے بدل جاتی ہے پھر دونوں کی شادی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر بچے ہوں تو پھر ان کی پرورش اور دیکھ بھال کا مسئلہ ہوتا ہے، غرض یہ کہ ایک طلاق کے ذریعے نہ جانے معاشرے میں کتنے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس کی پاکیزگی اور صالحیت کو کتنا دھکا لگتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا دور رس فتنہ خدا اور رسول کو ناپسند اور شیطان کو پسند ہونا ہی چاہیئے۔

اسی بنا پر طلاق کا جو طریقہ اسلامی شریعت نے مقرر کیا ہے، اس میں اس کی پوری رعایت رکھی ہے کہ آدمی کو بار بار اس فیصلے پر غور کرنے کا موقع ملے۔

رشتہ نکاح ایک معاہدہ ہے جسے کبھی توڑنا بھی ضروری ہو جاتا ہے

ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہے بسا اوقات عام آدمی ہی نہیں بلکہ ایک ماں باپ کی اولاد میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اسی سے بھی بڑھ کر کبھی باپ بیٹے میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، خاندان میں اعزہ اقارب میں اختلاف کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں غرض یہ کہ دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ یا کسی رائے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے اسی اختلاف کی وجہ سے دنیا میں نہ جانے کتنی قومیں، کتنے مسلک، کتنے طبقے کتنی زبانیں اور کتنی تہذیبیں پیدا ہو گئی ہیں،

جب اختلاف کی یہ صورتیں ہم میں سے ہر شخص کے سامنے دن رات آتی رہتی ہیں تو پھر میاں بیوی میں اختلاف کا ہو جانا کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں اختلاف کا ہو جانا اور پھر اسکے نتیجے میں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لینا زندگی کا کوئی ناممکن واقعہ نہیں ہے۔ ہندو مذہب کے علاوہ دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب ایسا ہو جس میں میاں بیوی کے اختلاف اور اس کے نتیجہ میں علیحدگی کی کوئی نہ کوئی صورت نہ رکھی گئی ہو یہ ایک ایسی فطری ضرورت ہے کہ ہندوؤں نے مجبور ہو کر اپنے یہاں ستی کی رسم کو ختم کیا اور ۱۹۵۵ء میں ہندو کوڈ میں ترمیم کر کے پہلی بار طلاق کو ایک معاشرتی ضرورت تسلیم کیا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے یہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں لیکن جس طرح زندگی میں اختلاف کا ہو جانا ناممکن نہیں ہے اسی طرح طلاق کا واقع ہونا بھی ناممکن نہیں ہے عام طور پر اختلافات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فروعی دوسرے بنیادی، فروعی اختلاف بات چیت سے دور ہو جاتے ہیں مگر بنیادی اختلاف میں خط امتیاز کھینچنا پڑتا ہے اور کبھی دونوں کے لئے علیحدہ دائرہ کار مقرر کرنا پڑتا ہے،

عام طور پر میاں بیوی کے درمیان اختلاف کی یہی دو نوعیتیں ہوتی ہیں، فروعی اختلافات صلح و مصالحت سے دور ہو جاتے ہیں قرآن پاک میں بڑی وضاحت سے اس کا طریقہ بتایا گیا ہے، اگر عورت کی غلطی ہے تو مرد کو عورت کی تنبیہ کرنے کی اجازت ہے اور کچھ ہلکی سزا بھی دے سکتا ہے

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ
وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ
وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ
اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ
سَبِیْلًا۔

(نساء)

اور جن عورتوں سے تم کو مسلسل نافرمانی کا ڈر ہو تو ان کو محبت سے سمجھاؤ اگر نہ مانیں تو ان کے بستروں سے تم علیحدگی اختیار کر لو اور پھر اس سے بھی نہ مانیں تو ہلکی سزا بھی دے سکتے ہو اگر پھر فرمانبردار بن جائیں تو پھر ان کو پریشان کرنے کیلئے راستہ نہ ڈھونڈنا،

اسی طرح عورتوں کو بھی اپنے حق کے لئے شکایت کرنے اور شکایت دفع کرنے کی صورت کو اختیار کرنے کا حق ہے، قرآن پاک نے جہاں مردوں اور عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا ہے وہاں دونوں برابر قرار دیا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ، (نساء)	جس طرح مردوں کے حقوق ہیں اس طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں بھلائی کے ساتھ البتہ مردوں کو ان پر کچھ فوقیت ہے،

اگر دونوں شکایتیں افہام وتفہیم سے رفع نہ ہو سکیں بلکہ وہ اختلاف بنیادی اختلاف بن جائیں تو قرآن پاک نے دوسری صورت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے کہ دونوں کی طرف سے ایک ایک آدمی حکم مقرر کر دیئے جائیں اور وہ ان کی شکایات کو سنکر انہیں رفع کرانے کی کوشش کریں قرآن پاک کی اس آیت میں اس کا صریح حکم موجود ہے اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اسی کے بعد یہ آیت ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝ (نساء)	اگر تم کو ان کے درمیان شدید اختلاف کا خطرہ ہو تو مسلمانوں فرض ہے کہ وہ ایک فرد مرد کے گھر والوں میں سے اور ایک عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کر دیں اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو پھر اللہ ان میں ضرور موافقت پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے

اب اگر اس کوشش سے دونوں کی شکایات دور ہو جاتی ہیں، اور وہ میاں بیوی کیطرح رہنا پسند کرتے ہیں تو وہ رہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں میں پھر محبت اور اتفاق ڈال دیگا لیکن اگر ان دونوں میں ثالثوں کی کوشش کامیاب نہ ہو، اور اختلافات بدستور باقی رہیں، تو پھر مرد کو طلاق دینے اور ایلا، کرنے کا حق ہے، اگر مرد طلاق نہیں دیتا ہے، اور عورت اس کے ساتھ

رہنے پر راضی نہیں ہے تو عورت کو خلع کے ذریعہ علیٰحدگی اختیار کرنے کا حق ہے،

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے یہ طلاق اصلاح حال کے مایوس ہونے کے بعد ایک آخری طریقہ ہے، جیسے مرد کو اختیار کرنا چاہیے، اسی لیے حکم ہے کہ پہلے ایک طلاق دو طلاق دینے کے بعد عدت کے درمیان دونوں کو غور و فکر کرنے کا پورا موقع ہے، اگر دونوں کو احساس ہو جائے کہ آئندہ ہم ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہ دیں گے تو مرد عورت سے رجوع کر سکتا ہے اگر پھر یہی صورت پیدا ہو جائے تو دوسری طلاق دے سکتا ہے، اب اگر اس کے بعد بھی توافق نہیں پیدا ہوتا ہے تو بہتر طریقہ سے وہ تیسری طلاق دے کر بیوی سے بالکل علیٰحدگی اختیار کرلے قرآن پاک نے اس آیت میں اس حکم کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے،

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ	طلاق دو مرتبہ ہے، دو طلاق تک اسے روکے رکھنے کا اختیار ہے، اگر اس نے تیسری طلاق دیدی تو اب اچھے طریقہ سے اسے رخصت کر دے،
(بقرہ)	

یعنی دو طلاق تک رجعت کر سکتا ہے، اور عدت گذر گئی ہے تو دوبارہ نکاح کر کے پھر اسے اپنی بیوی بنا سکتا ہے، الطلاق مرتان کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ دو طلاق ایک بار نہیں، بلکہ دو مرتبہ دو طہر میں دینا چاہیے، لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو او تسریح باحسان ہے، یعنی پھر اس کو اچھے طریقے سے چھوڑ دے، اب اس کے بعد دونوں کا رشتہ بالکل منقطع ہو گیا، اور دونوں بالکل اجنبی ہو گیے، اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے "الطلاق مرتان" فرمایا، تیسری طلاق کا ذکر کیوں نہیں فرمایا، آپؐ نے فرمایا کہ "تسریح باحسان" کے ٹکڑے میں تیسری طلاق ہی کا ذکر ہے، (روح المعانی)

طلاق دینے کے بعد رجوع کرنے یا بالکل علیٰحدہ کرنے میں معروف اور احسان کی قید لگی ہوئی ہے، یعنی طلاق سے رجوع واقعی اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے ہو، صرف عورت کو پریشان کرنا مقصود نہ ہو، اس طرح یہ رشتہ جب تک تھا تو میاں بیوی دونوں ایک جان دو قالب تھے،

اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ تو اب جب علٰحدہ ہو رہے ہیں تو یہ علٰحدگی بہتر سے بہتر طریقے سے ہو، دل شکنی اور ایذا رسانی کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے،

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ طلاق ایک ناپسندیدہ فعل ہوتے ہوئے بھی زندگی کی ایک ضرورت ہے جس سے معقول سے معقول آدمی کو بھی سابقہ پڑتا ہے،

طلاق کے بعد جس طرح نکاح کے بعد میاں بیوی کے کچھ حقوق و فرائض ہوتے ہیں، اسی طرح طلاق کے بعد بھی کچھ حقوق و فرائض ہیں، جنھیں دونوں کو ادا کرنا چاہیے،

شوہر کے فرائض اور بیوی کے حقوق (۱) مرد کا پہلا فرض یہ ہے کہ عورت کو طلاق کے بعد فوراً گھر سے باہر نہ نکال دے، خواہ طلاق رجعی ہو، یا طلاق بائن ہو، لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ۔

(۲) شوہر کا دوسرا فرض یہ ہے کہ اگر اس نے مہر ادا نہ کیا ہو تو ادا کردے، وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ۔

(۳) تیسرا فرض یہ ہے کہ عدت بھر اس کا خرچ اسی طرح پورا کرے جس طرح رشتۂ نکاح کے زمانہ میں پورا کرتا تھا،

(۴) شوہر کا چوتھا فرض یہ ہے کہ اگر چھوٹا بچہ ساتھ ہے تو اس کا خرچ بھی شوہر برداشت کرے، اگر ماں کا دودھ نہ پیتا ہو، یا ماں اب دودھ نہ پلائے تو اس کا خرچ بھی شوہر کو برداشت کرنا ہوگا،

(۵) بچہ اگر ہے تو سات برس تک، اور بچی ہے تو نو برس تک وہ ماں کے ساتھ رہے گی، اور شوہر کو باپ کی حیثیت سے خرچ دینا ہوگا۔ بشرطیکہ عورت کسی اجنبی جگہ شادی نہ کرے۔ شادی کرنے کے بعد باپ، بچہ یا بچی کو ماں سے لے سکتا ہے،

(۶) جب عدت ختم ہو جائے تو مستحب ہے کہ اسے کچھ تحفہ تحائف اور کپڑا لتا دیکر واپس کرے، قرآن پاک کی آیت وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ کا یہی مفہوم ہے، جسے پوری امت ۱۴ سو برس سے سمجھتی رہی ہے، مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ سے جو استدلال سپریم کورٹ کے جج صاحب نے کیا ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے، یہ لفظ قرآن پاک میں ایک درجن سے زیادہ جگہ آیا ہے، اور کسی جگہ اس کو گزارے کے معنی میں نہیں لیا گیا ہے، بلکہ قرآن میں ہر جگہ قلت اور حقارت کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی ایک دو جوڑے کپڑے کی صورت میں اس کا حق ادا ہو جاتا ہے، اور کبھی کچھ نقد دیکر، اور کبھی عدت کا خرچہ پورا کرکے، آگے نفقہ کے ذکر میں اس کی مزید تفصیل آئے گی،

رہنے پر راضی نہیں ہے تو عورت کو خلع کے ذریعہ علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہے،

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے یہ طلاق اصلاح حال کے مایوس ہونے کے بعد ایک آخری طریقہ ہے، جیسے مرد کو اختیار کرنا چاہیے، اسی لیے حکم ہے کہ پہلے ایک طلاق دو طلاق دینے کے بعد عدت کے درمیان دونوں کو غور و فکر کرنے کا پورا موقع ہے۔ اگر دونوں کو احساس ہو جائے کہ آئندہ ہم ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہ دیں گے تو مرد عورت سے رجوع کر سکتا ہے اگر پھر یہی صورت پیدا ہو جائے تو دوسری طلاق دے سکتا ہے، اب اگر اس کے بعد بھی توافق نہیں پیدا ہوتا ہے تو بہتر طریقہ سے وہ تیسری طلاق دے کر بیوی سے بالکل علیحدگی اختیار کرے قرآن پاک نے اس آیت میں اس حکم کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے،

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (بقرہ)	طلاق دو مرتبہ ہے، دو طلاق تک اسے رو کے رکھنے کا اختیار ہے، اگر اس نے تیسری طلاق دیدی تو اب اچھے طریقہ سے اسے رخصت کر دے،

یعنی دو طلاق تک رجعت کر سکتا ہے، اور عدت گذر گئی ہے تو دوبارہ نکاح کر کے پھر اسے اپنی بیوی بنا سکتا ہے، الطلاق مرتان کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ دو طلاق ایک بار نہیں، بلکہ دو مرتبہ دو طہر میں دینا چاہیے۔ لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو او تسریح باحسان ہے، یعنی پھر اس کو اچھے طریقے سے چھوڑ دے، اب اس کے بعد دونوں کا رشتہ بالکل منقطع ہو گیا، اور دونوں بالکل اجنبی ہو گیے، اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے "الطلاق مرتان" فرمایا، تیسری طلاق کا ذکر کیوں نہیں فرمایا، آپؐ نے فرمایا کہ "تسریح باحسان" کے ٹکڑے میں تیسری طلاق ہی کا ذکر ہے۔ (روح المعانی)

طلاق دینے کے بعد رجوع کرنے یا بالکل علیحدہ کرنے میں معروف اور احسان کی قید لگی ہوئی ہے، یعنی طلاق سے رجوع واقعی اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے ہو، صرف عورت کو پریشان کرنا مقصود نہ ہو، اس طرح یہ رشتہ جب تک تھا تو میاں بیوی دونوں ایک جان دو قالب تھے،

اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ تو اب جب علحدہ ہو رہے ہیں تو یہ علحدگی بہتر سے بہتر طریقے سے ہو، دل شکنی اور ایذا رسانی کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے،

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ طلاق ایک ناپسندیدہ فعل ہوتے ہوئے بھی زندگی کی ایک ضرورت ہے، جس سے معقول آدمی کو بھی سابقہ پڑتا ہے،

طلاق کے بعد جس طرح نکاح کے بعد میاں بیوی کے کچھ حقوق و فرائض ہوتے ہیں، اسی طرح طلاق کے بعد بھی کچھ حقوق و فرائض ہیں، جنھیں دونوں کو ادا کرنا چاہیے،

شوہر کے فرائض اور بیوی کے حقوق (۱) مرد کا پہلا فرض یہ ہے کہ عورت کو طلاق کے بعد فوراً گھر سے باہر نہ نکال دے، خواہ طلاق رجعی ہو، یا طلاق بائن ہو، لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ.

(۲) شوہر کا دوسرا فرض یہ ہے کہ اگر اس نے مہر ادا نہ کیا ہو تو ادا کر دے، وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ.

(۳) تیسرا فرض یہ ہے کہ عدت بھر اس کا خرچ اسی طرح پورا کرے جس طرح رشتۂ نکاح کے زمانہ میں پورا کرتا تھا،

(۴) شوہر کا چوتھا فرض یہ ہے کہ اگر چھوٹا بچہ ساتھ ہے تو اس کا خرچ بھی شوہر برداشت کرے، اگر ماں کا دودھ نہ پیتا ہو، یا ماں اب دودھ نہ پلائے تو اس کا خرچ بھی شوہر کو برداشت کرنا ہوگا،

(۵) بچہ اگر ہے تو سات برس تک، اور بچی ہے تو نو برس تک وہ ماں کے ساتھ رہے گی، اور شوہر کو باپ کی حیثیت سے خرچ دینا ہوگا، بشرطیکہ عورت کسی اجنبی جگہ شادی نہ کرے، شادی کرنے کے بعد باپ، بچہ یا بچی کو ماں سے لے سکتا ہے،

(۶) جب عدت ختم ہو جائے تو مستحب ہے کہ اسے کچھ تحفہ تحائف اور کپڑا لتا دیکر واپس کرے، قرآن پاک کی آیت وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ کا یہی مفہوم ہے، جسے پوری امت ۱۴سو برس سے سمجھتی رہی ہے، مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ سے جو استدلال سپریم کورٹ کے جج صاحب نے کیا ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے، یہ لفظ قرآن پاک میں ایک درجن سے زیادہ جگہ آیا ہے، اور کسی جگہ اس کو گزارے کے معنیٰ میں نہیں لیا گیا ہے، بلکہ قرآن میں ہر جگہ قلت اور حقارت کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ یعنی کبھی ایک دو جوڑے کپڑے کی صورت میں اس کا حق ادا ہو جاتا ہے، اور کبھی کچھ نقد دیکر، اور کبھی عدت کا خرچہ پورا کرکے، آگے نفقہ کے ذکر میں اس کی مزید تفصیل آئے گی،

بیوی کے فرائض (۱) بیوی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ طلاق کے بعد فوراً شوہر کا گھر نہ چھوڑے
(۲) جب تک عدت ختم نہ ہو جائے اس وقت تک کہیں اس کا نکاح نہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں اس کے ذمہ داروں کو حکم دیا جا رہا ہے:

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهٗ (بقرہ)	ان کے نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو جب تک اُن کی عدت نہ پوری ہو جائے۔

(۳) عدت کے اخراجات کے سلسلہ میں اسی معیار کو باقی رکھے جو طلاق سے پہلے اس کا شوہر کے ساتھ تھا۔ بلا وجہ فضول اخراجات کا مطالبہ نہ کرے۔

(۴) بچے کی پرورش میں وہ کوتاہی نہ کرے، اور نہ بلا وجہ اس کے لیے اس سے زیادہ مطالبہ کرے جتنا کہ شوہر اب تک پورا کرتا رہا ہے۔

(۵) اس بے تعلقی کو مستقل دشمنی اور عداوت کا سبب نہ بنانا چاہیے۔ طلاق کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یہ ہدایت فرما دی:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (بقرہ)	جو اس میں زیادتی کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

عدت کیا ہے؟ جن مذاہب یا نظام زندگی میں طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ میرے علم میں اس میں سے کسی مذہب یا نظام زندگی میں طلاق کے بعد عدت کا حکم موجود نہیں ہے۔ ہندو کوڈ میں جو ترمیم ہوئی، اس میں بھی طلاق کی اجازت تو ملی، مگر عدت کا نہ کوئی ذکر ہے اور نہ اس کے لیے کوئی مدت ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ طلاق ملنے کے ساتھ ہی شوہر کی ساری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور عورت اپنی شادی جہاں چاہے کر سکتی ہے۔ پھر بچے کی تربیت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے اس کے لئے کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔ مگر اسلام نے زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، عدت میں کتنی معاشرتی اور اخلاقی مصلحتیں ہیں اس کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے ہو جائے گا عدت کے بارے میں قرآن پاک کا حکم ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ (بقرہ)

اس آیت سے عدت کی یہ مصلحتیں فقہا نے مستنبط کی ہیں۔

(۱) طلاق شدہ عورتیں تین حیض تک اپنے کو شادی بیاہ کرنے سے روکے رکھیں

(۲) اگر طلاق رجعی ہو تو اس لئے کہ تین حیض کے اندر شوہر کو بیوی کی رضامندی سے رجوع کرنے کا حق ہے۔

(۳) اور اگر طلاق بائن ہے تو اس مدت میں یہ پتہ چل جائے گا کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں اگر حمل ہے تو پھر اس کی عدت وضع حمل یعنی بچہ کی پیدائش تک طویل ہو جائے گی۔

(۴) اگر عدت مقرر نہ ہو تو نہ طلاق رجعی کی صورت میں پھر ان آپس کے تعلقات کی استواری کی کوئی صورت باقی رہتی ہے اور نہ حمل وغیرہ کا پتہ چل سکتا ہے۔

(۵) اگر عدت نہ ہو اور عورت حمل کی حالت میں شادی کر لے تو بچے کا نسب مشکوک ہو جائے گا اور اس سے آئندہ اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اور ایک پاکیزہ خاندان کا وجود خطرہ میں پڑ سکتا ہے، فقہا نے مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں لکھا ہے

لان العدۃ وجبت للتعرف عن براءۃ الرحم فی الفرقۃ الطارئۃ علی النکاح وھذا یتحقق فیھا	عدت اس علیحدگی کے نتیجہ میں ہے جو نکاح پر طاری ہوئی ہے یہ اس لئے واجب کی گئی ہے کہ رحم کے اندر حمل قرار پایا ہے یا نہیں ہے یہ واضح ہو جائے گا اور اس کا یقین عدت میں ہو جاتا ہے
(ھدایہ ج ۲ ص ۴۰۳)	

المغنی لابن قدامہ میں ہے

لان العدۃ وجبت لبراءۃ الرحم وھکذا کل فرقۃ فی الحیاۃ کالفسخ لرضاع او عیب او لعان	عدت براءۃ رحم کے لئے واجب کی گئی ہے اسی طرح زندگی کی ہر علیحدگی میں عدت ہے جیسے فسخ نکاح یا رضاعت یا کسی عیب کی وجہ سے یا لعان کی وجہ سے ہو۔
(ج ۷ ص ۴۴۸)	

<u>عدت کا نفقہ اور اس کی حیثیت</u> عدت کے نفقہ کی حیثیت یہ ہے کہ اگر یہ طلاق رجعی ہے تو عدت تک شوہر کا تعلق اس سے باقی ہے، اگر طلاق بائن ہے تو استبراء رحم کی حد تک یہ تعلق باقی

ہے اس لئے اسے اس تعلق کی حد تک شوہر کو نفقہ برداشت کرنا ہے لان نفقۃ العدۃ بمنزلہ نفقۃ النکاح فتاوی قاضی خاں صاحب ۱۴۱۴ بحرالرائق ج ۴ ص ۲۰۸

لیکن عدت کے بعد یہ حق باقی نہیں رہے گا۔

وھی ای العدۃ حق من حقوق النکاح	یہ عدت نکاح کے حق میں سے ایک حق ہے۔ اسی کے
فلما بقی فاعتبار ھذا الحق ما کان لہا	لحاظ سے اسے سکنیٰ کا حق ملے گا۔ اور جب سکنیٰ
من استحقاق السکنیٰ فکذالک النفقۃ	کا حق ہوتا تو اسی طرح نفقہ کا بھی۔ اور عدت
ولا سبب لاستحقاق النفقۃ سوی العدۃ	کے علاوہ نفقہ کا کوئی حق نہیں ہے۔

(مبسوط ج ۵ ص ۲۰۲)

عدت کے بعد نفقہ کا مطالبہ اور متاع بالمعروف سے استدلال نہ صرف فقہار کی تصریحات کے خلاف بلکہ قرآن پاک کی صراحت کے خلاف بھی ہے ایسی مطلقہ جو حاملہ ہو اس کی عدت کے بارے میں قرآن پاک کی صراحت ہے وان کن اولات حمل فا... علیھن حتی یضعن حملھن (طلاق) قرآن پاک نے صراحت کردی کہ ان پر وضع حمل تک خرچ کرنے کی ذمہ داری ہے باوجودیکہ حمل کی عدت بھی لمبی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں کئی جگہ ذکر ہے مگر اس کے باوجود نفقہ کی ذمہ داری صرف وضع حمل تک ہے پھر دوسری عدتوں کے بارے میں یہ کہنا کہ عدت کے بعد نفقہ دیا جاتا ہے قرآن کی صراحت کے خلاف ہے قرآن کی دوسری آیت

وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنْ سَعَتِہٖ۔	یعنی اگر یہ دونوں بالکل علیٰحدہ ہو جائیں تو پھر اب ایک دوسرے پر کوئی ذمہ داری نہیں لیکن اس حالت سے گھبرانا نہ چاہیے۔ اللہ تم اپنی قدرت سے دوسری صورت پیدا کرے گا۔

متاع کا مفہوم | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ متاع یا متعہ عارضی اور قلیل معاشی یا جسمانی فائدہ پہنچانے کو کہا جاتا ہے۔ امام رازی کی اس عبارت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے:۔

اصل المتاع والمتعۃ ما ینتفع بہ انتفاعا غیر باق بل منقضا عن قریب (تفسیر رازی ص ۲۹۴ ج ۲)	متعہ یا متاع اصلاً اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ایسا فائدہ اٹھایا جائے جو باقی نہ رہے بلکہ جلد ہی ختم ہو جائے۔

(باقی ص ۱۰۸ پر ملاحظہ کر)

انشورنس کی شرعی حیثیت

(از)

جناب پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری، اسلام آباد (پاکستان)

(۳)

آج کل انشورنس میں سرمایہ کاری کا جو طریقہ رائج ہے اس کے اعتبار سے مضاربت یا شرکت عنان کا طریقہ بہتر ہے۔ یہاں ہم مختصراً مضاربت کے تجارتی طریقہ پر روشنی ڈالتے ہیں:

مضاربت[۱] (۱) اس کاروبار کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک فرد یا چند افراد سرمایہ فراہم کرتے ہیں، سرمایہ کو اصطلاح فقہ میں رب المال کہتے ہیں۔ دوسرا شخص یا کمپنی اس مال سے سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اصطلاح فقہ میں محنت یا کاروبار کرنے والے کو مضارب کہا جاتا ہے۔ سالانہ نفع میں سے اصل دار کو اور محنت کرنے والے کو ایک خاص نسبت سے حصہ دیا جاتا ہے۔ فرض کریں اصل دار کو ½ اور محنت کرنے والے کو ½ حصہ ملے گا۔ اور اصل رقم اصل دار کی ہوگی۔ نقصان کی صورت میں نقصان سارے کا سارا اصل دار برداشت کرے گا۔ کیونکہ مضارب کی محنت ضایع ہوگئی۔ اور اصل دار کا سرمایہ۔

(۲) مضارب کو جو رقم کاروبار کے لیے دی جائے۔ وہ اس رقم کو آگے کسی دوسرے فرد کو مضاربت یا شرکت پر کاروبار کے لیے دے سکتا ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک مضارب کو ایسا کرنے کے لیے اصل دار (اصل داروں) سے اجازت لینا پڑتی ہے، کہ وہ رقم آگے کاروبار پر دے سکتا ہے یا نہیں۔ اور بعض کے نزدیک اجازت ضروری نہیں، بہر حال مضارب کو ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ انشورنس کمپنیاں جو رقم اکٹھی کرتی ہیں، وہ انہیں آگے کاروبار کے لیے مضاربت کی شکل میں دے سکتی ہیں۔

---

[۱] مضاربت کے شرعی اصول کا یہ خلاصہ ہم نے عبدالرحمن الجزیری کی کتاب "الفقہ علی مذاہب الاربعہ" کی جلد "قسم المعاملات۔ باب المضاربت" سے نقل کیا ہے۔ تفاصیل کے لیے چاروں مذاہب کی کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(۲) جب مضارب اس رقم کو دوسرے شخص یا کاروباری ادارے کو دے گا تو اس کے ساتھ اپنی نئی شرائط طے کرے گا۔ یعنی وہ جس شخص کو رقم دے رہا ہے، اس سے کتنا فی صد منافع لے گا؟ وغیرہ۔ فرض کریں یہاں صاحب المال کا ½ اور مضارب کا ½ طے ہوتا ہے۔ لیکن اس مضارب کا جو (جو اب رقم آگے کسی دوسرے کو کاروبار کے لیے دے رہا ہے) معاہدہ پہلے صاحب المال سے ہو چکا ہے، اس کا اس نئے کاروبار میں دخل نہیں، وہ تو اس پہلے مضارب سے اپنا طے شدہ حصہ منافع میں سے لے گا،

(۴) حساب کتاب سال ختم ہونے کے بعد ہوگا اور اگر فریقین چاہیں تو حساب کتاب کے بعد کاروبار جاری رہے گا۔

منافع کی تقسیم کرتے وقت پہلے سارا نقصان منہا کیا جائے گا، اور باقی جو بچے گا وہ مقررہ تناسب سے تقسیم ہوگا،

۴. بیمہ کی مالیت کا تعین | کسی بیمہ دار شخص کا اس کی مالی حیثیت اور ذرائع آمدنی سے بڑھ کر اور کسی بیمہ کی جانے والی جائداد کا اس کی قیمت سے زیادہ اور کسی ذمہ داری کا اس کے عوض سے بڑھ کر بیمہ نہ کیا جائے، اور جو شخص دھوکہ دے کر اپنی جائداد زیادہ بتائے یا اس کی مالیت زیادہ ظاہر کرے، اور جب جہاں عیٹک کے بعد اس کا دھوکہ ظاہر ہو جائے تو اسے عدالتوں سے تعزیراتی سزا دلوائی جائے جس کے لیے شرعی قوانین موجود ہیں،

موجودہ انشورنس کی چند جائز مروّجہ صورتیں | اس وقت دنیا کے مختلف ممالک میں انشورنس کی دو شکلیں ایسی مروّج ہیں، جو اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل جائز بلکہ مستحسن ہیں، وہ دو شکلیں یہ ہیں:

(۱) اجتماعی انشورنس (۲) تبادلی انشورنس۔

اجتماعی انشورنس | اس نظام انشورنس کے تحت دنیا کی مختلف حکومتیں اپنے مزدوروں اور بسا اوقات دیگر کارکنوں کو بڑھاپے، مرض اور ریٹائرمنٹ کی صورت میں کفالت کرتی ہیں، اس کی مختلف صورتیں اور شکلیں مروج ہیں، مثلاً پنشن کی صورت میں امداد، بڑھاپا الاؤنس، میڈیکل الاؤنس بے روزگاری الاؤنس[1] وغیرہ۔ برطانیہ اور جرمنی کا نظام اس سلسلہ میں قابل تعریف ہے، اسلام نظام

---

[1] الدکتور حسین حامد حسان، حکم الشریعۃ الاسلامیۃ فی عقود التامین دار الاعتصام، قاہرہ ص ۳۱-۳۰ سنہ ۱۳۹۶ ہجری، سنہ ۱۹۷۶ء،

کفالت عامہ میں اجتماعی انشورنس کو صرف عمال کے طبقہ تک نہیں، بلکہ تمام شہریوں تک عام کرتا ہے۔ اسلام کے "نظام تکافل میں اجتماعی انشورنس" اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ تبادلی انشورنس | تبادلی انشورنس کا کام تعاونی انجمنیں چلاتی ہیں۔ ان انجمنوں کے تمام حصہ داران کسی نہ کسی صورت میں کسی خاص خطرے کے سدّباب کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، یہ انجمنیں اپنے تمام شرکاء سے سال کی ابتداء میں ان کے کسی خاص خطرہ کی انشورنس کے معاوضہ کے طور پر ایک مخصوص رقم لے لیتی ہیں (یہ ضروری نہیں کہ تمام شرکاء برابر رقم دیں) پھر انجمن سال بھر میں اپنے شرکاء میں کسی کو پیش آمدہ خطرہ یا نقصان کے ازالہ کے لیے جتنی رقم خرچ کرتی ہے، اگر وہ رقم اس شخص کی سال کے ابتداء میں دی گئی رقم سے زیادہ ہے تو انجمنیں یا کمپنی باقی کا اس سے مطالبہ کرتی ہے، اور اگر اس کے خطرہ کے تحفظ یا نقصان کے ازالہ پر اٹھنے والے اخراجات کم ہیں، تو اس کی باقی رقم واپس کر دیتا ہے، گویا تبادلی انشورنس میں تو صرف وقوعہ خطرہ یا نقصان کے وقت کمپنی اپنے ممبر کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتی، بلکہ اس کی پریشانی کو حل کرتی ہے، اور اسے سنبھالا دیتی ہے انشورنس کی اس شکل میں موجودہ نظام انشورنس کی قباحت نہیں پائی جاتی ہے۔

اسلام کے "نظام تکافل اجتماعی" میں یہی کام "اسلامی معاشرہ" کے سپرد ہے۔

۳۔ انشورنس کے مؤیدین کے نقلی دلائل اور ان کا تجزیہ | بیمہ کے مؤیدین کے نقلی دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) انشورنس کمپنی اپنے بیمہ داروں کا جمع شدہ سرمایہ جہاں کہیں کاروبار میں لگا کر یا کسی ضرورتمند کو قرض دے کر جو سود کماتی ہے۔ یا بیمہ دار کو اصل کے ساتھ جو منافع (اپنے کمائے ہوئے سود میں سے) دیتی ہے، وہ شرعی ربوٰ نہیں ہے۔

(۲) ودیعۃ بالاجر میں بیمہ کی بعض صورتوں کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۳) مسئلہ ضمان خطر الطریق بیمہ کی بعض صورتوں سے مشابہ ہے۔

(۴) بیمہ کو عقد موالاۃ پر قیاس کر لیا جائے۔

(۵) بیمہ کو بیع بالوفاء کی طرح گوارہ کر لیا جائے۔

(۶) بیمہ شریعت اسلامیہ کے ایک اہم مقصد کو پورا کرتا ہے، کہ "الضرر یزال" (ضرر کی تلافی کی جاتی ہے) وغیرہ۔

آئیے اب باری باری ان احتمالات کے جوابات دیتے ہیں:

بیمہ میں شریعت کا سود پایا جاتا ہے

جہاں تک پہلی دلیل یا احتمال کا تعلق ہے، اس کا جواب ہم بالتفصیل پہلے درج کر چکے ہیں۔ وہاں مختلف حوالہ جات اور مثالوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ موجودہ نظام انشورنس میں شریعت کے ربوا کی دونوں صورتیں ربوا بالفضل اور ربوا بالنسیہ پائی جاتی ہیں، اور اس کا انکار غالباً بیمہ کمپنی والے بھی نہ کریں، مگر نہ جانے ہمارے اسکالرز صاحبان کو انشورنس کا سود کیوں منافع نظر آتا ہے۔

۲۔ بیمہ اور ودیعۃ بالاجر

ودیعۃ بالاجر کا جواز بیمہ کا جواز نہیں بن سکتا۔ ودیعۃ بالاجر کی صورت یوں ہے کہ ایک شخص اپنا کوئی مال یا روپیہ دوسرے شخص (امین) کے پاس اس اجازت کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ کہ امین اس مال میں تصرف کر سکے گا۔ اور امانت رکھنے والا اس کو امانت کی حفاظت کرنے پر کچھ مقررہ اجرت بھی ماہانہ یا سالانہ دیا کرے گا[1] اور امین اس کو یہ ضمانت دے گا کہ اگر مال ضائع ہو جائے گا تو وہ اس کا معاوضہ دے گا۔

انشورنس کا جواز ودیعۃ بالاجر کے جواز سے قیاس کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ کیونکہ انشورنس کی رقم جس کی بالاقساط ادائگی کی جاتی ہے، وہ امانت نہیں رکھی جاتی، بلکہ وہ تو اس موہوم پالیسی کی قیمت ہے جسے بیمہ دار خریدتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر پالیسی ہولڈر (policy Holder) ان اقساط کی ادائگی کسی وجہ سے ادا کرنا بند کر دے، تو انشورنس کمپنی اس کی اداشدہ رقم سوخت کر لیتی ہے، حالانکہ امانت کے ساتھ تو یہ سلوک نہیں کیا جاتا، دوسرے ودیعۃ بالاجر رکھنے والا امین کو اس ودیعۃ (امانت) کی حفاظت کرنے پر کچھ اجرت دیتا ہے؛ جبکہ بیمہ کمپنی والے تو رقم (بالاقساط) جمع کرانے والے کو سود (بنام بونس) دیتے ہیں، گویا ودیعۃ بالاجر اور انشورنس کی رقم دونوں ایک دوسرے کی الٹ ہیں، تیسرے ودیعت (امانت) اگر امین سے بلاارادہ ضائع ہو جائے تو امین سے کسی قسم کا تاوان یا عوض نہیں لیا جاتا جب کہ انشورنس کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ہونے والے معاہدہ میں اس قسم کی کوئی شق نہیں ہوتی۔ الغرض، انشورنس کا ودیعۃ (امانت) بالاجرۃ کے ساتھ جوڑ ملانا کسی طرح بھی جچتا نہیں۔

---

[1] مرغینانی برھان الدین: الھدایہ، ج ۲، ایچ۔ ایم سعید کمپنی، کراچی، سن طباعت درج نہیں، ص ۲۷۶
- ابن عابدین، محمد امین: ردالمحتار، ج ۳، باب المستامن، ص ۲۴۵

۴۔ انشورنس اور مسئلہ ضمان خطر الطریق

مسئلہ ضمان خطر الطریق کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی مسافر سے کہے "تم اس راستے پر سفر کرو یہ راستہ بالکل محفوظ ہے اور اگر تمہارا مال و اسباب لٹ جائے تو میں تمہارے مال کا ضامن ہوں" اب اگر اس راہ پر سفر کرتے ہوئے اس مسافر کا مال و اسباب لٹ جائے تو وہ شخص اس کے مال و اسباب کے معاوضہ کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے راستہ کی سلامتی بتلاتے ہوئے بالصراحت یہ کہا تھا کہ اسباب لٹ جانے کی صورت میں وہ ضامن ہوگا۔ البتہ اگر وہ شخص راہ گیر کو صرف یہ کہتا کہ یہ راستہ سلامتی کا ہے اور پھر اس راہ گیر کا اسباب لٹتا تو وہ شخص ضامن نہ ہوتا کیونکہ اس کے بیان سلامتی میں ضمانت کا اقرار نہیں اب مذکورہ صورت مسئلہ کی رو سے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ انشورنس کا "ضمان علی خطر الطریق" پر قیاس کرنا غلط ہے۔ کیونکہ راستہ کی سلامتی کی ضمانت دینے والا یہ ضمانت دے رہا ہوتا ہے کہ مسافر کا سامان لٹے گا نہیں جبکہ انشورنس کمپنی بیمہ شدہ شخص یا چیز کے تلف یا ہلاک نہ ہونے کی ضمانت نہیں دیتی بلکہ نقصان یا معاوضہ پورا کرنے کی ضمانت دیتی ہے یہ ضمانت سے بڑھ کر جواہے کیونکہ انشورنس کمپنی تو اس لالچ میں نقصان کی تلافی کی ذمہ داری قبول کر رہی ہوتی ہے کہ بیمہ شدہ شخص زیادہ دیر تک زندہ رہے گا جس کے نتیجہ میں انشورنس کمپنی کو زیادہ رقم (بصورت قیمت پالیسی) ملے گی جسے وہ سود پر دے کر سرمایہ کاری کرے گی جبکہ "ضمان علی خطر الطریق" دینے والا اگر یہ ضمانت بغیر کسی معاوضہ کے دیتا ہے تو پھر اسے دھوکہ دینے والا کہا جائے گا جو راستہ کی عدم سلامتی سے گویا واقف تھا مگر اس نے ایک مسافر کو دھوکہ سے ایک غیر محفوظ راستہ پر ڈال کر اس کا سامان لٹوا دیا۔ لہٰذا وہ حسب وعدہ خسارہ پورا کرے۔ اور اگر اس نے کوئی معاوضہ لے کر ضمانت دی ہے۔ (جیسے ڈاک خانہ والے کرتے ہیں) تو پھر سامان گم ہونے یا لٹنے کی صورت میں سمجھا جائے گا کہ اس نے حفاظت سامان کی اجرت لی مگر حفاظت سامان کی ذمہ داری پوری نہ کی لہٰذا وہ جرمانہ کے طور پر خسارہ مال ادا کرے۔ مگر انشورنس کمپنی اور بیمہ دار دونوں خطرہ کی حالت میں ہوتے ہیں کیونکہ بیمہ دار بیمہ کراتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کی ہلاکت یا بیمہ شدہ شئے کے اتلاف جیسے خطرات کا تحفظ ہو سکے اور بیمہ کمپنی کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ بیمہ شدہ شخص یا شئے وقت سے پہلے ہی ہلاک یا تلف نہ ہو جائے۔ ورنہ اُسے نقصان یا معاوضہ دینا پڑے گا۔ گویا انشورنس کمپنی خود انجام سے آگاہ نہیں۔ لہٰذا اس کا معاہدہ ہی قمار پر مبنی ہے مگر ضمان علی خطر الطریق میں یہ عنصر قمار نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تو ضامن جانتا ہوتا ہے کہ یہ راستہ پرامن ہے یا نہیں اور پر امن نہ ہونے کی صورت میں اس کا کسی کو ضمانت امن دینا دھوکہ ہے اور دھوکہ

کی سزا میں وہ جرمانہ ادا کرے گا [1] البتہ ڈاک خانہ کے بیمہ (انشورنس) کو "ضمان علی خطر الطریق" پر قیاس کر کے اسے درست کہا جا سکتا ہے اور ڈاک خانہ کے انشورنس کے شرعی ہونے پر علماء کرام کا اتفاق ہے۔[2]

انشورنس اور بیع بالوفا | بیع بالوفا کی صورت یہ ہوتی ہے جب ایک شخص (بائع) دوسرے شخص (مشتری) سے یہ کہے "میں نے یہ دکان تمہیں فروخت کر دی" اور پھر یہ شرط طے کرے اور اس کو تحریر لکھا دے کہ "جب میں تمہیں قیمت ادا کر دوں تو تمہیں دکان مجھ کو واپس کرنا ہوگی"۔ اس بیع کے بارے میں فقہاء کا شدید اختلاف ہے بعض اسے رہن کہتے ہیں، بعض بیع کہتے ہیں، بیع کہنے والوں میں بھی اختلاف ہے بعض کہتے ہیں بیع فاسد ہے جبکہ بعض کے نزدیک بیع صحیح ہے جمہور علماء کرام کے نزدیک یہ بیع ہے کیونکہ اس میں یہاں بیع وشراء کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اگر بیع کے اندر واپسی کی شرط کی گئی تو بیع فاسد ہے اور اگر ایجاب وقبول کے بعد شرط عائد کی گئی تو بیع صحیح ہے اور یہ شرط ایک وعدہ ہے جس کی وجہ سے بیع میں کوئی خرابی نہیں آتی۔

۳۔ لہذا انشورنس کے موئدین یہ کہتے ہیں کہ جس طرح بیع بالوفا میں دہی مبیع (یعنی اور خریدی جانے والی چیز) بائع کو واپس فروخت کر دی جاتی ہے اس طرح بیمہ کمپنی والے بیمہ دار سے ایک مقررہ رقم لے کر (گویا کہ خرید کر) وہی رقم (گویا کہ مبیع) بیمہ دار (گویا کہ مشتری) کو واپس کر (بیع) دیتے ہیں۔ لیکن انشورنس اور بیع بالوفا میں مندرجہ ذیل باتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

۱۔ بیع بالوفا میں ایک چیز یا جنس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، انشورنس میں روپیہ کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور شریعت میں نقد کی بیع کمی بیشی کے ساتھ حرام ہے کیونکہ اس میں سود کا عنصر پایا جاتا ہے

۲۔ بیع بالوفا میں بائع کو وہی مبیع بعینہ مل جاتی ہے (بشرطیکہ معاہدہ بیع پیشگی واپسی کی شرط نہ ہو) مگر انشورنس میں تو چند اقساط ادا کرنے کے بعد بیمہ دار اقساط کی ادائیگی بند کر دے تو بیمہ کمپنی والے انہیں ہضم کر لیتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے یوں بیمہ دار بیچارے کو سوائے انشورنس کمپنی والوں کو کوسنے اور ان کی غیبت کرنے کے اور کچھ نہیں ملتا۔ گویا کہ بیع بالوفا میں تو وفا کی جاتی ہے مگر انشورنس میں بے وفائی بھی ہوتی ہے۔

انشورنس کا معاہدہ بیع بالوفا کے مانند بھی نہیں کیونکہ بیع بالوفا کا جواز بھی اس صورت میں ہے کہ بیع کا معاہدہ کرتے وقت بائع پیشگی یہ شرط نہ لگائے کہ مبیع بعد میں اسے واپس کر دی جائے۔ لیکن انشورنس

---

[1] ابن عابدین: فتاوی شامی د ردالمختار، ج ۴، باب المستامن، ص ۲۴۵

[2] مفتی ولی حسن، بیمۂ زندگی، ص ۱۰

میں تو معاملہ ہی انوکھا ہے بیمہ دار کو پہلے ہی یہ بتادیا جاتا ہے اگر وہ بیمہ پالیسی کی تمام رقم ادا کرنے سے قبل ہی اللہ کریم کو پیارے ہو گئے تو ان کے ورثا کو اتنی رقم ملے گی اور اگر بیمہ کی پالیسی کی تمام مالیت کی ادائیگی کے بعد تک زندہ رہے تو اس قدر رقم ملے گی۔ اس کا بیع بالوفا سے قیاس کرنا بالکل غلط ہے۔ انشورنس کے اس طرح کے معاہدہ کی بنیاد ہی قمار پر ہے جبکہ بیع بالوفا میں جوا (قمار) کی صورت نہیں ہوتی۔

انشورنس اور عقد موالاۃ

عقد موالاۃ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب ایک مجہول النسب شخص دوسرے شخص سے اس قسم کا معاہدہ کرلے کہ جنایت کی صورت میں ہر ایک دوسرے کی دیت (خون بہا) ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اسی طرح وفات کی صورت میں ہر ایک دوسرے کی میراث کا حق دار ہوگا۔ شریعت اسلامیہ میں اس قسم کا عقد قابل تعریف ہے یہ تعاون علی البر والتقویٰ کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس قسم کے معاہدہ کی رو سے ایک شخص دوسرے ایسے شخص کا ذمہ دار اور وارث بنتا ہے جس کا دنیا میں کوئی وارث نہ ہو۔ مگر شریعت اسلامیہ میں ایسا عقد (معاہدہ) بغیر کسی مالی معاوضہ کے صرف تعاون علی الخیر کے جذبہ سے کیا جاتا ہے جبکہ انشورنس کمپنی اس قسم کی ذمہ داری بغیر مالی معاوضہ کے نہیں کرتی اور انشورنس کمپنی کا نظام وہ تمام فاسد شرائط اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں اور وہ فاسد شرائط انشورنس کے اس معاہدہ کو ربوا اور قمار کے ناپاک عناصر سے گندہ کردیتی ہیں اور یوں تعاون علی الخیر کا عقد تعاون علی الربوا والقمار والظلم بن جاتا ہے

انشورنس اور اصول الضرر یزال

انشورنس کے بعض وکلاء ایک نہایت بودی دلیل یہ بھی لاتے ہیں کہ انشورنس شریعت اسلامیہ کے ایک بنیادی اصول "الضرر یزال (نقصان کی تلافی کی جاتی ہے)" کو پورا کرتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے بیمہ دار کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس دلیل کے جواب میں ہم یہ گذارشات پیش کریں گے۔

۱۔ الضرر یزال کا اصول یہی ہے کہ جو نقصان کرے وہی اس کی تلافی کرے کیونکہ قرآنی اصول "لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ"[۴۰] (کوئی جان دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی) ہے، مگر موجودہ نظام انشورنس میں ایک کا نقصان پوری قوم پر ڈالا جاتا ہے ایک چالاک بیمہ دار جو بدقسمتی سے بہت بڑا سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی ہوتا ہے۔ جب اپنے کاروبار کو مندے کی طرف جھکتا دیکھتا ہے تو کارخانہ کو آگ دکھا کر پوری قوم سے اس کی دوگنی مالیت بذریعہ انشورنس کمپنی وصول کرلیتا ہے۔ کیا شریعت کے اصول "الضرر یزال" کی روح یہی تقاضہ کرتی ہے؟

۴۰: الانعام: ۶

غرض یہاں ہم نے نہایت اختصار سے بیان کیا ہے کہ موجودہ نظام انشورنس میں کیونکر اور کیا کیا تبدیلیاں کی جائیں کہ یہ کاروبار اسلامی بن جائے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عنوان کے تحت بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی مگر یہاں اس سے اتنا ہی تعرض کیا گیا ہے جتنے کا تعلق ہمارے مقالے سے تھا لیکن یہ کام کسی ایک فرد یا ادارے کا نہیں بلکہ اس کی اصلاح کی قومی سطح پر ضرورت ہے۔ راسخ العقیدہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات جو صائب الرائے اور دین کا درد رکھنے والے ہیں۔ اس کاروبار کو جوا اور سود سے پاک کرنے کے لئے تجاویز مرتب کریں۔

اسلامی حکومت اس کام کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور کاروبار اسلامی خطوط پر استوار کرنے کا پختہ عزم کرلے تو کوئی ان ہونی بات نہیں کہ یہ حرام کا کاروبار حلال اور طیب بن جائے آخر آج کا سودی کاروبار کیا ۴یا ۵ سال میں ایسا سائنٹیفک طریقہ پر چلنے کے قابل ہوگیا تھا؟ نہیں بلکہ اس نے مدتوں اپنا سفر جاری رکھا۔ تب اس منزل پر پہنچا۔ علماء اسلام کی فقیہانہ بصیرت اور مسلمان ماہرین معاشیات کی مخلصانہ کوشش کے لیے یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر انشورنس کا کاروبار اسلامی خطوط پر استوار کرلیا جائے تو انشورنس کمپنی اور بیمہ داروں دونوں کو کہیں زیادہ نفع دنیوی اعتبار سے بھی ہوگا۔ اور حلال اور طیب کھانے کے بعد ان میں اللہ کریم کا بندہ بننے کا ذوق بھی پیدا ہوگا۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(بشکریہ سہ ماہی "منہاج" لاہور)

وفیات

دو ہفتہ پہلے اخبارات کے ذریعہ یہ جانکاہ خبر ملی کہ مولانا محمود احسن صاحب ناظم دینی کونسل اتر پردیش کا اچانک انتقال ہوگیا۔ زبان سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" نکلا، اور قلب پر کچھ دیر تک سکتہ کی کیفیت طاری رہی،

دینی تعلیمی کونسل کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہوا تھا، اس طویل مدت میں کونسل اور مولانا محمود احسن مرحوم کا تصور ساتھ ساتھ رہا، خوش قسمتی سے ضلع کی سطح پر مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اول دن سے موقع ملا، بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم نے ضلع کے دورہ کا پروگرام بنایا مولانا کو بلایا، مگر بارش یا دوسرے اسباب کی بنا پر ان سے میں نے ایک دو جگہ کا پروگرام ملتوی کر دینے کا مشورہ دیا، مگر مولانا پیرانہ سالی کے باوجود اس پر کبھی راضی نہیں ہوئے، وہ کہا کرتے تھے کہ جہاں کا پروگرام بنا لیا ہے، وہاں ایک آدمی بھی نہ آئے جب بھی چلنا چاہیے، ورنہ آیندہ وہاں کا پروگرام کبھی کامیاب نہیں ہوگا،

متنوع کاموں میں لگنا آسان ہوتا ہے، مگر یک گیر محکم گیر کے لیے بہت کم طبیعتیں آمادہ ہوتی ہیں، مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کے کام کی ذمہ داری لی تو پھر دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، انھوں نے اپنی پوری شخصیت کو کونسل کے کاموں میں سمو دیا تھا، ان کے دوروں اور خطوط سے ہم لوگوں کو برابر مہمیز لگتی رہتی تھی، سمجھ میں نہیں آتا کہ آئندہ مہمیز کون لگائے گا،

مولانا کی موت ایک حادثہ نہیں، بلکہ ابتدائی دینی تعلیم کی تحریک کے لیے ایک زبردست حادثہ ہے، راقم الحروف نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر دینی کونسل مدظلہ کو جو تعزیتی خط لکھا تھا اس میں اپنا یہ تاثر ظاہر کیا تھا کہ دینی تعلیمی کونسل کے ہر ممبر کو اس مشترکہ ملی حادثہ پر ایک دوسرے کی تعزیت کرنی چاہیے،

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور اس ملی کام کے لیے کوئی نعم البدل عطا کرے، آمین!

کوائفِ جامعۃ الرشاد

اس سے پہلے الرشاد میں ذکر آچکا ہے کہ کئی سال بعد اس سال پھر فضیلت کا آخری درجہ کھل گیا ہے۔ عام طور پر عربی مدارس میں آخری درجہ کو دورہ کا سال کہا جاتا ہے جس میں پوری صحاح ستہ پڑھائی جاتی ہے اور کہیں کہیں مؤطا امام مالک اور کہیں شرح معانی الآثار امام طحاوی بھی شامل رہتی ہے۔ چونکہ ہر کتاب میں ایک ہی طرح کے مباحث اور تقریریں ہوتی ہیں اس لئے طلبہ واقعی طور پر اس سے پوری دلچسپی نہیں لیتے خاص طور پر عبادات کے چند مباحث کے بعد تو کتاب کی صرف قرأت ہوتی ہے اس لئے بہت زیادہ ذہین یا محنتی طلبہ کے علاوہ عام طلبہ اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے اسی بنا پر جامعۃ الرشاد میں قرآن و حدیث کی تعلیم پانچ سال مسلسل جاری رہتی ہے، مثلاً حدیث میں درجہ سوم میں امام بخاری کی الادب المفرد پڑھائی جاتی ہے درجہ چہارم میں مشکوٰۃ کے پہلے حصہ سے فضائل قرآن اور کتاب الدعوات وغیرہ اور حصہ دوم سے کتاب الاداب مع مقدمہ سے باب الملاحم تک پانچویں درجہ میں مشکوٰۃ حصہ اول اور دوم سے کتاب النکاح اور کتاب الجہاد وغیرہ پڑھائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ابن ماجہ کے منتخب ابواب مع عجالۂ نافعہ اور ششم میں نسائی منتخب ابواب ابوداؤد مکمل اور طحاوی عبادات کا حصہ مع نخبۃ الفکر، اور درجہ ہفتم میں صحیحین، ترمذی مع مقدمہ ابن صلاح، حجۃ اللہ البالغہ الفوز الکبیر، تاریخ الادب العربی وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں، اسی طرح قرآن پاک کا ترجمہ پانچوں سالوں میں چلتا ہے، آخر سال بیضاوی نصف پارہ پڑھائی جاتی ہے،

بحمد اللہ ہر درجہ کا اور خاص طور پر آخری درجہ کی تعلیم کا معیار قابل رشک ہے،

اس سال مدرسہ کے لیے دوسری خوش کن بات یہ ہوئی ہے کہ جامعۃ الرشاد کے ایک سابق طالب علم مولوی احمد کمال صاحب جنھوں نے یہاں سے ابتدائی تعلیم کے بعد ندوہ جاکر فضیلت کیا، اور اس کے بعد مدینہ یونیورسٹی کلیۃ اللغہ میں داخلہ لیا، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد "تدریب المعلمین" کا کورس کیا اور پھر مبعوث ہو کر اپنی مادر علمی میں آگئے ہیں، ان کے بعد سے ادب و انشاء کا معیار بھی بلند ہوا ہے، اور اونچے درجات میں ادب کی تعلیم عربی میں ہونے لگی ہے، عربی پرچہ کے نکالنے کا جو پروگرام بہت دنوں سے پیش نظر تھا، انشاء اللہ وہ عملی صورت اختیار کرلے گا،

دو ماہ کے اندر مدرسہ میں بہت سے حضرات تشریف لائے، جن میں کچھ اہل خیر تھے، اور کچھ اہل علم، اہل خیر حضرات میں حاجی محمد اسحاق صاحب ملیشیا سے، اور حاجی شفیع اللہ صاحب دوبئی سے تشریف لائے، یہ دونوں مدرسہ کے بہت پرانے معاون ہیں، اللہ جزائے خیر دے، اہل علم میں مولانا مختار احمد صاحب ندوی، اور مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری، مولانا جھنڈانگری نے رات کو قیام کیا اور طلبہ کو خطاب بھی کیا، اور کچھ کتابیں مدرسہ کو ہدیہ کیں، اور واپس جاکر اپنے تاثرات بھی لکھ بھیجے ہیں، جو اس اشاعت میں شامل ہیں،

راقم الحروف مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں کئی ماہ سے مسلسل لکھ رہا ہے، ساتھ ہی اس نے ضلع کے بڑے بڑے تمام قصبات کا دورہ کیا، اور مئو اور خیرآباد کے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی، اور جونپور کے جلسے میں بھی شریک ہونے کی سعادت ہوئی، شہر کے اندر خصوصی جلسے ہوچکے ہیں، انشاء اللہ جلد ہی شہر اعظم گڈھ اور مبارک پور وغیرہ میں عوامی جلسے ہوں گے،

الرشاد کی ڈاک

انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح ۲۷/۹/ ۱۹۸۵ء

مکرمی و محترمی !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ الحمد للہ! "الرشاد" ہمیں بڑی پابندی سے مل رہا ہے، ہم آپ کے تہ دل سے شکر گذار ہیں، "الرشاد" اپنی افادیت کے لحاظ سے ہمارے نزدیک ایک اہم رسالہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری لائبریری میں آتے ہی تمام طلبہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اور بڑی دلچسپی سے اسکا مطالعہ کرتے ہیں، یہ رسالہ ہماری لائبریری کیلئے بہت گرانقدر اور قیمتی سرمایہ ہے، اسکا نہ آنا ہماری لائبریری کیلئے بہت بڑا خلا ہوگا۔ لہذا آنجناب سے التماس ہے کہ اسے ہماری لائبریری میں برابر بھیجتے رہیں، اور موقعہ تشکر عنایت فرمائیں۔

والسلام

ناظم انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح

(سرائمیر)

جامعۃ الرشاد میں حاضری

از مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری (نیپال)

۲۰/ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو گورکھپور سے میری روانگی اعظم گڈھ کے لیے بذریعہ بس ہوئی، اپنے پروگرام کی اطلاع جامعۃ الرشاد کے ناظم اعلیٰ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کو دے چکا تھا، چنانچہ ساڑھے سات بجے بس سے اتر کر میں اور میرے رفیق سفر مولوی عبداللہ صاحب مجواپوری جامعۃ الرشاد میں پہنچ گیے، (یہ جامعہ لب سڑک واقع ہے) مولانا مجیب اللہ صاحب مجھ سے بڑھ کر مدرسہ کے صحن میں ملے، پھر مولانا مجھے لیے ہوئے اپنے مہمان خانے میں گیے کھانے کا وقت آچکا تھا فوراً کھانا منگایا اور اعظم گڈھ کی مشہور مٹھائی مگدل (مونگ کی لڈو) کھلایا، پھر کھانے سے فارغ ہوکر میں مسجد گیا، اور وہاں مغرب وعشاء کی نماز پڑھی، مسجد بہت کشادہ حسین و مستحکم ہے، اس کی وسعت کیلئے صحن کی زیر زمین کھدائی ہو چکی ہے، کئی صفیں تہ خانے میں کھڑی ہونگی اور کئی صفیں اس کی چھت پر آجائیں گی جو جمعہ کے دن حاضرین کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی، رات ہی میں مولانا نے اپنے مدرسہ کا نظام بتلایا اور میں نے دیکھا کہ صبح صادق سے پون گھنٹہ پہلے مولانا خود اٹھ جاتے ہیں، اور پھر وضو

کر کے نگراں کو جگا دیتے ہیں، اور وہ لڑکوں کو اٹھاتے ہیں، اذان سے پہلے ایک لڑکا قرآن کریم کی تجوید کے ساتھ الگ پر بلند آواز سے قرأت کرتا ہے، اس کے ساتھ تمام طلبہ قرآن کریم لے لے کر قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، صبح صادق ہوتے ہی اذان ہو جاتی ہے، اور ۵ ۳ منٹ بعد نماز باجماعت ہوتی ہے، جس میں تمام لڑکے واساتذہ شامل ہوتے ہیں، پھر نماز کے بعد بھی آدھ گھنٹہ قرآن کریم کی تلاوت مسجد ہی میں کرتے ہیں اس طرح کوئی لڑکا نماز میں غیر حاضر نہیں ہوتا ہے، اور کبھی جماعت ثانیہ کی نوبت نہیں آتی،

یہ نظام اتنا مرغوب ومحبوب نظر آیا کہ اگر اس کو نمونہ بنا کر دوسرے مدارس بھی اس طرح کا پروگرام بنالیں تو طلبہ ومدرسے کے حق میں ایک بڑی نعمت ثابت ہوگی، مجھے بھی اس سے مہمیز لگی،

اس طرح نماز باجماعت کی ادائیگی اور تلاوت قرآن کریم کی سعادت سے مدرسے میں خدا کی جانب سے خیر وبرکت نازل ہوگی، مولانا خوش مزاج مرنجاں مرنج صفت کے آدمی ہیں، مدینے مدرسہ کے دوسرے قواعد سے بھی واقف کرایا، مدرسہ کے طلبہ کے لیے کھانے کا نظام اور طلبہ ہی کے ذریعہ اساتذہ تک کھانا پہنچانے کا قاعدہ، کھانے کے باری باری سے کھلانے کا حال سناتے رہے، اور طلبہ ہی کے ذریعہ مسجد کی صفائی اور اذان دینے کی بات بتلاتے رہے، اس مدرسہ میں اہل حدیث استاذ بھی ہیں اور اہلحدیث طلبہ بھی، نماز میں ان کے آمین کی آواز بھی اعتدال سے سنائی دی، پھر مولانا نے اپنا کتب خانہ بھی دکھلایا جو چند الماریوں پر مشتمل تھا، اور اس میں ہر فن اور ہر موضوع کے متعلق معتدبہ کتابیں ہیں لیکن کتبخانہ میں مزید وسعت اور اضافے کی ضرورت باقی ہے،

میں نے اپنی مؤلفات میں سے دس کتابیں مولانا کی خدمت میں پیش کیا تھا، انھوں نے اپنی تصنیفات میں سے چند کتابیں مدرسہ کے لیے ہدیہ فرمائیں، مولانا اپنے خوش اخلاقی اور کرم گستری سے برابر میری دل نوازی کرتے رہے،

پھر مولانا نے پیکر لطف وعنایت بن کر اپنی کار سے مجھ کو دارالمصنفین بھیج دیا جس کو دیکھنے کی تمنا ایک زمانہ سے تھی، میری عمر اب ستر اسّی سال کے درمیان ہے، ابتک اعظم گڈھ میں اترنے اور دارالمصنفین پہنچنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مولانا نے ڈرائیور کے بروقت موجود نہ ہونے کے سبب اپنے ان صاحبزادے کو مامور کیا جو ڈاکٹر بھی ہیں کہ وہ ہمیں ہمراہ لے جائیں اور ہمراہ واپس بھی لائیں،

مولانا شہر کے ایک دل آویز اور محبوب شخصیت ہیں، وہاں میرے دوران قیام میں شہر کے متعدد افراد

مولانا کے پاس آتے رہے، اور قومی و ملی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے رہے، اور فتاویٰ پوچھنے والے بھی آتے جاتے رہے۔ مولانا عالم دین ہونے کے علاوہ قومی، ملی و سیاسی شخصیت کے بھی مالک ہیں،

پھر مولانا نے اپنا ایک رسالہ (دینی مدارس کی ذمہ داریاں) مجھے عنایت کیا، اس کو پڑھ کر مولانا کی درد بھری کہانی اور پوری سرگزشت معلوم ہوئی، مولانا نے بڑے نازک وقت اور پیچیدہ حالات میں جامعۃ الرشاد کو قائم کیا، اور پھر مسجد کی پختہ اور مستحکم بنیاد رکھی، اور مدرسہ کے خس پوش سفالہ پوش جھونپڑوں کو بتدریج بلند و بالا مستحکم عمارت میں تبدیل کر دیا، یہ ان کی بلند نظری اور عزم محکم اور مسلسل جد و جہد کا نتیجہ ہے،

مولانا ایک زمانہ تک دار المصنفین میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صحبت میں رہے ہیں، اور ان کے تجربات اور مشوروں سے استفادہ کرتے رہے ہیں، اس طرح ان کو بہت اچھا خاصا موقع ملا، اور "جمال ہم نشیں در من اثر کرد" کے تحت ان کے قلم میں روانی اور شگفتگی پیدا ہو گئی، جس پر مولانا کی تمام تصنیفات شاہد ہیں،

ایک طرف چھوٹے طلبہ کے لیے کھپڑوں کی ایک عمارت کئی کمروں پر مشتمل نظر آئی، اسے مولانا اپنے عزم بیدار اور حسن انتظام سے پختہ عمارت کی شکل دینا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف پختہ عمارت کے نامکمل سلسلے کو مکمل کرنا چاہتے ہیں،

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، [illegible] کہ یہ اسباب و وسائل فراہم کرنے میں کچھ دیر نہیں لگتی، وما ذالک علی اللہ بعزیز،

مدرسہ نیا ہے، مگر دورہ تک تعلیم ہوتی ہے، مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی جیسے عالم دین اس کے شیخ الحدیث ہیں، خود محترم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی بھی قرآن و حدیث کی کچھ گھنٹے تعلیم دیتے ہیں، مولانا کے قلم سے نکلا ہوا طلبہ کے نام الوداعی پیغام پڑھا، دل کو بڑی عبرت و موعظت حاصل ہوئی، یہ خطبہ اس زمانہ کے ہر طالب علم کیلئے قابل دید و شنید ہے، بلکہ اساتذہ و منتظمین کے بھی پڑھنے کے قابل ہے، ان کیلئے بھی خصوصی ہدایات اور قیمتی مشورے موجود ہیں، ہر دل سے یہ آواز نہیں نکل سکتی ہے، اور تجربات کے یہ خلاصے ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی، یہ اہل دل، اہل بصیرت اور اہل نظر کا کام ہے،

نئی کتابیں

نسیم ظہیر اصلاحی غازی پوری

ششماہی مجلہ علوم القرآن

مدیر: جناب ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ تقطیع ۱۸/۲۲ کاغذ متوسط، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰، پہلا شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۵ء قیمت فی پرچہ ۱۲ روپئے سالانہ چندہ ۲۵ روپئے

پتہ - ادارہ علوم القرآن پوسٹ بکس نمبر ۹۹ نیو سر سید نگر، علیگڑھ ۲۰۲۰۰۱ -

قرآن کریم علوم و معارف کا منبع، حقائق و معانی کا بحر زخار، رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور خالق کائنات کی ہدایات کا ترجمان اور دنیا میں اس کی آخری آواز ہے یہی وہ صحیفۂ ہدایت ہے جس کو اپنا کر صدر اول کے مسلمانوں نے چہاردانگ عالم میں اپنی عظمت و رفعت کا ڈنکا بجایا، یہی وہ کیمیائے سعادت ہے جس کے ذریعہ مسلمان بام عروج پر پہنچے اور جس سے منہ موڑ کر آج کا مسلمان قعر مذلت کی گہرائیوں میں جا گرا اگر وہ یہی نسخہ شافی پھر استعمال کرے تو اپنی عظمت رفتہ کو دو بارہ واپس بھی لا سکتا ہے - چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا،	اس امت کے آخری لوگ اسی چیز کے ذریعہ کامیاب ہو سکتے ہیں جس سے اس کے پہلے لوگ کامیاب ہوئے ہیں،

قرآن مجید کی اس عظمت اور اس کی غیر معمولی اہمیت کا تقاضا تھا کہ قرآن ہی ہماری ہر حرکت و عمل اور تمام فکر و نظر کا محور و مرکز قرار پائے اور بقول ڈاکٹر اشتیاق صاحب "حق تو یہ تھا کہ قرآنی علوم و معارف کی توسیع و اشاعت کے لئے ادارے اور اکیڈمیاں قائم کی جاتیں، اور علماء محققین کی بڑی بڑی جماعتیں قرآنی علوم پر ریسرچ کے لئے فارغ کر دی جاتیں، جامعات میں

اس کے مطالعہ و تحقیق کے لئے خاص انتظامات کئے جاتے اور اس مقصد کے حصول کے لئے مخصوص شعبے اور لائبریریاں قائم کی جاتیں، لیکن اس وقت اس سلسلہ میں جو صورت حال ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے"

مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی اوائل زندگی میں مورخ اسلام علامہ شبلی نعمانیؒ اور ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ جیسی دو عظیم ترین اسلامی شخصیتوں کے خوابوں کی تعبیر اور انکی امیدوں کا آخری محور و مرکز بن گیا۔ ان دونوں بزرگوں نے ولی اللہی طرز پر اسکا اپنا ایک مخصوص نظریۂ تعلیم مرتب کیا جسمیں براہ راست قرآن کریم کی محققانہ تعلیم کو اولین اہمیت دی گئی۔ اور دوسرے علوم و فنون کو ضمنی اور ذیلی تاکہ یہ معلوم ہوتا جائے کہ یہ علوم بجائے خود ماخذ و بنیاد نہیں بلکہ اصل ماخذ، قرآن و سنت کے خادم یا اسکے نتائج و وسائل ہیں۔

فضلائے مدرسۃ الاصلاح کے ابتک جو علمی کارنامے منظر عام پر آئے ہیں جنکی طرف ہند و پاک کے تمام اہل علم اور صاحب ذوق حضرات کی توجہ مبذول ہو گئی ہے انہیں "ادارہ علوم القرآن" کا قیام اور اور اس کے تحت ششماہی مجلہ علوم القرآن کا اجراء بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس ادارہ کو مسلم یونیورسٹی سے وابستہ فضلائے مدرسۃ الاصلاح نے قائم کیا ہے اور مجلہ بھی وہیں سے شائع ہوتا ہے، لیکن اسمیں ملک اور بیرون ملک کی مختلف جامعات سے وابستہ اصلاحیوں کا بھی تعاون شامل ہے۔ زیر نظر مجلہ اسی ادارہ کا ترجمان اور اسکا پہلا شمارہ ہے، جو اپنی ظاہری آب و تاب کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی اسقدر وقیع معیاری اور اہم ہے کہ اس پرچہ جیسا کم سواد اور ہیچمداں بھلا کیا تبصرہ کر سکتا ہے، جامعۃ الرشاد کے ناظم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے اس کو بیحد پسند فرمایا اور ایڈیٹر کو مبارکباد کا خط لکھا۔

اس شمارہ میں اداریہ کے بعد جو ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب ظلی کے قلم سے ہے مقالات کی ابتدا مدرسۃ الاصلاح کے گل سرسبد، تدبر قرآن کے مولف، اور فکر فراہی کے شارح مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ العالی کے ایک تازہ ترین مضمون سے ہوتی ہے جسکا عنوان "ایمان اور اسلام" ہے اس کے مکمل اور جامع ہونے کیلئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ مولانا امین احسن صاحب جیسے ماہر علوم قرآن کے قلم سے ہے، ہمارے اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا مضمون مولانا محمد فاروق خاں صاحب (مترجم ہندی قرآن مجید، اور انچارج شعبہ ہندی

جماعت اسلامی ہند دہلی) کا ہے، جسکا عنوان "قرآن مجید کی معنوی تفسیر بطن القرآن" ہے اسمیں موصوف نے "لہ ظہر و بطن" کی روشنی میں قرآن کریم کی معنوی تفسیر پر بہت عالمانہ اور منصفانہ بحث کی ہے، جو مطالعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مضمون اس ضرورت کے تحت لکھا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس کے معنوی اور روحانی عجائب کی طرف سے بھی غفلت نہیں ہونی چاہیے، تاکہ قرآن سے صرف دماغ ہی متاثر نہ ہو بلکہ قلب بھی متاثر ہو، جس کا اثر عملی زندگی میں ظاہر ہو۔

تیسرا مضمون مولانا سلطان احمد صاحب اصلاحی (رفیق ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علیگڑھ) کے قلم سے ہے جسکا عنوان "خصوصیات قرآن کا وسیع دائرہ" ہے، جو مجلہ کے تمام مضامین میں سب سے زیادہ لمبا اور طویل ہے، مولانا اپنے مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں۔

"قرآن حکیم .... نے اپنے بہت سے اسماء و خصوصیات کا ذکر کیا ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے تفصیل سے لکھنے کا خیال علامۃ العصر مولانا حمید الدین صاحب فراہی کو آیا، جنہوں نے "اوصاف القرآن" کے عنوان سے ایک رسالہ اس پر مرتب کرنا چاہا تھا لیکن جو غالباً ان کے دوسرے بہت سے کاموں کیطرح تشنۂ تکمیل ہی رہا........ زیر نظر مضمون میں قرآن کے بعض اوصاف و خصائص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالے نے توفیق دی تو انشاء اللہ "اوصاف القرآن" کے موضوع پر الگ سے تفصیل سے لکھا جائیگا اس کی روشنی میں قرآن کو صرف تلاوت اور حصول برکت کے مروجہ تصور کی غلطی کو بھی آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے"

چوتھا مضمون ڈاکٹر عبید اللہ فراہی (ریڈر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسیٹی لکھنؤ) کا ہے، جسکا عنوان "کلامیات قرآن مولانا عبد الباری فلسفی کے اشارات" ہے۔ مولانا عبد الباری ندوی صاحب (سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)، باوجود عربی داں اور فاضل ندوہ ہونے کے فلسفہ جدید کے بڑے ماہر تھے وہ "کلامیات قرآن" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھنا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اسکی حسرت اپنے دل میں ساتھ لے گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے علمی ترکہ کا جائزہ لیا گیا تو اس موضوع پر قرآنی الفاظ کے تحت کچھ مختصر اشارات اور بحثیں ملیں، ڈاکٹر فراہی صاحب نے انہی اشارات کو بہت ہی ترتیب اور ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح

مرحوم کا منتشر قیمتی سرمایہ محفوظ بھی ہو گیا اور اہل ذوق حضرات کی دلچسپی کا سامان بھی فراہم ہو گیا۔

پانچواں مضمون استاذ محترم مولانا ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب (استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کا ہے جسکا عنوان "مولانا فراہی کے قلمی حواشی۔ الاتقان فی علوم القرآن پر" ہے

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ انگریزی اور عربی کی بلند پایہ اور منتخب کتابوں کا مطالعہ فرماتے تھے۔ اور ان پر دوران مطالعہ تمام اہم مباحث پر عربی میں اپنے تنقیدی نوٹس بھی لکھتے جاتے تھے، اس طرح ان کے مطالعہ میں گذری ہوئی کتابیں اہل علم کے لئے بڑی قیمتی چیز بن گئی ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ میں محفوظ ہے دار المصنفین اعظم کی متعدد فنون کی کتابوں پر بھی مولانا کے قلمی حواشی درج ہیں، ان تمام حواشی کا تفصیلی جائزہ لے کر اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے، مولانا اجمل صاحب نے ان حواشی کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کا وعدہ کیا ہے، خدا کرے یہ وعدہ جلد از جلد پورا ہو، مولانا فراہیؒ نے امام سیوطیؒ کی کتاب الاتقان فی علوم القرآن پر جو حواشی لکھے تھے انہی کو مولانا اجمل صاحب نے سیاق وسباق کے ساتھ اصل عربی حاشیہ اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے اس کا سب سے بڑا فائدہ توجیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے یہ ہوا کہ یہ حواشی چھپ کر محفوظ ہو گئے اب ان کی حفاظت الاتقان کے صرف اس ایک نسخہ کی رہین منت نہیں رہی جو مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ میں ہے ہمیں امید ہے کہ اس سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو فائدہ پہنچے گا، مگر جب تک مولانا کی تحسین وتخطیہ کی تفصیل سامنے نہ آئے اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان حواشی پر مولانا نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہے جو ان کے قرآنیات کے وسیع مطالعہ کا مظہر ہیں۔

چھٹا مضمون "عہد وسطی میں ہندوستان کی فارسی تفسیریں۔ ایک تعارفی مطالعہ" ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اصلاحی اعظمی کے قلم سے ہے، جو اس وقت شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں استاذ ہیں، یہ مضمون بھی بہت ہی عالمانہ اور محققانہ ہے۔ اس مضمون سے پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ ہندوستان میں فارسی تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو ہم کو یہی معلوم تھا کہ باوجود اس کے کہ فارسی مسلمانوں کی زبان تھی۔ مگر جب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا فارسی ترجمہ سامنے آیا تو علماء نے اس کے خلاف بڑی شورش برپا کی تھی، اس مضمون سے

ظفر صاحب میں اچھے مضمون نگار سے زیادہ ایک اچھے محقق بننے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔
ساتواں مضمون ،، مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کی نسبت فراہی ،، ہے۔ جو ڈاکٹر شرف الدین صاحب اصلاحی (ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد پاکستان) کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر موصوف عرصے سے مولانا حمید الدین فراہی کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ الکا یہ مضمون اسی سوانح عمری کا ایک ٹکڑا ہے، مولانا کی جائے پیدائش کے متعلق انہوں نے جو کدوکاوش کی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے، لیکن اگر خود ان سے دریافت کیا جائے کہ اس کا حاصل کیا ہے تو شاید وہ بھی کچھ نہ بتا سکیں، مولانا کی جائے پیدائش کے بارے میں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ضلع اعظم گڑھ کا ایک قصبہ "پھریہا" ان کی جائے پیدائش ہے،
آخر میں "تحقیقات قرآنی" کے عنوان سے وہ قرآنی مخطوطات جن کی تحقیق ایم۔ اے، یا پی۔ ایچ ڈی کے تحقیقی مطالعہ کے طور پر جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں ہو رہی ہے انکی فہرست مولانا اجمل صاحب کے قلم سے ہے جو بارہ مخطوطات پر مشتمل ہے۔
اس سے پہلے مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کے قلم سے ،، ادارہ علوم القرآن ،، کے مقاصد تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں جو مختصر طور پر درجہ ذیل تین اہم نکات پر مشتمل ہیں

۱۔ اسلام کے دستور اساسی۔ قرآن۔ کو محور بنا کر انسانیت اور امت کو درپیش مسائل کا حل۔
۲۔ قرآن کی روشنی میں علوم دینیہ کی تجدید اور علوم جدیدہ کی تطہیر۔
۳۔ قرآن سے متعلق اصولی اور فنی موضوعات پر علمی اور تحقیقی کام۔

بلاشبہ علوم و افکار کی ایک وسیع دنیا ان دفعات میں سمٹ آئی ہے لیکن اگر اس ادارہ کے مقاصد میں مولانا فراہی کے قرآنی افکار کی اشاعت بھی شامل کر دی جاتی تو بہت اچھا ہوتا، دنیا کو ابھی ان کے معجزانہ فضل و کمال کی بنا پر جتنا جاننا چاہیئے تھا وہ ابھی نہیں جان سکی ہے اس ضرورت کو مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء ہی پورا کر سکتے ہیں اور ان کو کرنا چاہیئے
یہ مجلہ ظاہری اور اس سے بڑھ کر معنوی اعتبار سے اسقدر بلند اور معیاری ہے کہ اسکی تعریف کیلئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ خدا کرے ایک دو اشاعت کے بعد مجلہ ششماہی کے ماہانہ ہو جائے اور اسکے ذریعہ مولانا فراہیؒ کے جملہ علوم و معارف منصۂ شہود پر آجائیں
مجلہ کی سائز اگر چھوٹی ہو جائے تو زیادہ سنجیدہ معلوم ہو، مجلہ کو دیکھتے ہوئے اسکی قیمت ۱۲ روپیہ بہت زیادہ تو نہیں ہے مگر لوگوں تک پہنچانے کیلئے ضروری ہے کہ اسکی قیمت اور کم کیجائے۔

فتاوی احیاء العلوم

از مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مرحوم، مرتب مولانا جمیل احمد صاحب نذیری، تقطیع ۲۰/۲۶ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۵۲، مجلد، قیمت ندارد، شایع کردہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، اعظم گڈھ،

مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اس دیار کے مشہور ومعروف عالم اور مفتی تھے، مولانا اپنی سادگی، تواضع، سادہ لوحی، خلوت پسندی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی وجہ سے ہر طبقہ کے نزدیک مقبول اور قابل اعتماد تھے، مفتی صاحب مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگردوں میں سے تھے، انھوں نے اپنی ساری زندگی افتا، اور درس و تدریس میں گذار دی، اور تقریباً نصف صدی تک مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مسند افتاء و ارشاد پر جلوہ افروز ہوکر نہ صرف مبارکپور اور اس کے قرب وجوار کو فائدہ پہنچایا بلکہ ملک کے دوسرے حصوں تک ان کے درس و افتاء کا فیض پہنچا، مولانا مرحوم اپنے پیچھے اپنے فتووں کا ایک وسیع دفتر چھوڑ گئے ہیں، ضرورت تھی کہ مفتی صاحب کے اس علمی ترکہ کو شایع کرکے ہر خاص و عام کے لیے اس کا فیض عام کیا جائے، چنانچہ مفتی صاحب کے ایک شاگرد رشید مولانا جمیل نذیری صاحب (جو خود ایک باصلاحیت اور صاحب قلم عالم ہیں) نے اس دشوار گذار کام کا بیڑا اٹھایا، اور "فتاوی احیاء العلوم" کے نام سے مفتی صاحب کے فتاوی کی پہلی جلد مرتب کی، تکرار سے بچنے کے لیے انھوں نے انتخاب سے کام لیا ہے، منتخب مسائل کو مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے، اور ترتیب فقہی طرز کے بجائے حدیث کے طرز پر رکھی ہے، اس جلد میں حسب ذیل ابواب ہیں اور تقریباً پونے تین سو فتاوے پر مشتمل ہیں:-

(۱) کتاب الایمان والکفر (۲) کتاب الشرک والبدعات (۳) کتاب ما یتعلق بالقرآن والحدیث والآثار، (۴) کتاب الأکل والشرب، (۵) کتاب الحظر والاباحۃ، (۶) کتاب المتفرقات،

مولانا نذیری صاحب نے عام لوگوں کی آسانی کے خیال سے محولہ عربی عبارتوں کا ترجمہ اور ان عبارتوں کو جن کو نقل کیے بغیر صرف حوالہ دیا گیا تھا، مع ترجمہ حاشیہ پر درج کر دیا ہے،

اردو زبان میں ابتک بہت سے فتوؤں کے مجموعے مرتب ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں، اس مجموعہ سے اس ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے، جواب میں بہت زیادہ اختصار سے کام نہ لیکر سوال کے ہر گوشہ پر مدلل اور محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے، حوالہ کے ساتھ اصل عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے، اور صرف فقہ و فتاوی کی کتابوں پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے بھی استدلال کیا گیا، جس سے ان فتاوی میں اجتہادی شان پیدا ہو گئی ہے، زبان بھی انتہائی عام فہم، دلپذیر اور نہایت سلیس ہے، کتاب کے شروع میں چند علماء کے تاثرات، مدرسہ احیاء العلوم کی تاریخ اور مفتی صاحب کی مختصر سوانح عمری مولانا نذیری صاحب کے قلم سے درج ہیں، یہ فتاوے ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہیں،

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ قیمت عـہ

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہٗ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اسکا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہوا ہے، اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔ قیمت ۱۵

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب مکتبہ ملیہ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت [illegible]

قرآن پاک کی تعلیم اور اس کی عظمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے ہم بار بار پڑھیں، سمجھیں اور اپنی زندگی میں اسے اتاریں، مگر نہ صرف عام مسلمان اس سے غفلت برت رہے ہیں بلکہ ہمارے مدارس میں بھی اس کی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنا کہ اس کا حق ہے اس رسالہ میں اس کی توجہ دلائی گئی ہے

مسئلہ کفاءت

شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہیئے اس مسئلہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں میں برادریوں میں جو مصنوعی تقسیم قائم کی گئی ہے۔ شریعت میں اسکی حیثیت کیا ہے۔ اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۵

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یوپی)

Regd NO. AZM /N P 42 / [redacted] Phone:- 461
Regd NO. R.N. 38937 / 81

Monthly Jameatur Rasahad

Azamgarh (U.P.)

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرات (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جسکے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپیے کے قریب ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کیساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

جامعۃ

مجیب اللہ ندوی

دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

دار التالیف و الترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ حافظ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے، اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جسطرح فرض عبادت پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادت کے اہتمام کے ساتھ تمام اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت اور حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲×۱۸ ۔ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰/

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلبہ، اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ یہ تقریریں، تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ "الفرقان" میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک مجمع میں پڑھوا کر سنوایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ سائز ۲۲×۱۸ ۔ صفحات ۱۰۰ ، قیمت ۵۰/۱

اسلامی تعلیم

حصہ اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں، مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت حصہ اول ۱۲/، دوم ۵۰/۱ ، سوم ۳/، چہارم ۵۰/

تبع تابعین حصہ اول

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۹۰ اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی، اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں اُن صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و اڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد ۔ [illegible] اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ ہندوستان سے =/25 خصوصی معاون =/100 قیمت فی پرچہ 2/50	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان ماہنامہ جامعۃ الرشاد	سالانہ چندہ غیر ممالک سے بارہ ڈالر امریکی 12 =/

جلد ۱۲(۱) — دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ — شمارہ ۱۳(۵)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت	مطبوعہ
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی	نشاط آفسیٹ پریس (ٹانڈہ)

ضروری انتباہ

"اسلامی فقہ" کا سرقہ

آپ بھی حضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کی مشہور کتاب "اسلامی فقہ" کو مختصر سے رد و بدل کے ساتھ مکتبہ الحسنات دہلی نے اسی نام سے دوسرے مؤلف منہاج الدین مینائی کے نام سے شایع کیا ہے، جن کا علمی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، آج تک کوئی پمفلٹ یا کسی رسالہ میں کوئی علمی قسم کا اہم مضمون بھی نظر نہیں آیا، پھر اتنی ضخیم علمی فقہی کتاب کا ان کے ذریعہ اچانک وجود میں آجانا ایک محال بات ہے، عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب سے فائدہ اٹھانے کی بات ایک کھلا ہوا فریب ہے، ایک صفحہ میں بھی براہ راست اس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔

مولانا کی کتاب پہلے مکتبہ الحسنات ہی شایع کرتا تھا مگر بعض اسباب کی بنا پر مولانا نے اس سے اپنا معاملہ ختم کر لیا ہے، اور اب وہ مارکیٹ میں موجود نہیں ہے، مولانا کتاب پر نظر ثانی کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہے، مکتبہ الحسنات والے اس سے فائدہ اٹھا کر اس کتاب کے مضامین کا سرقہ کر کے کتاب کو اسی نام سے شایع کر کے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے بازار میں لائے ہیں۔

مولانا کی اصل کتاب ترمیم و اضافہ اور نئے مسائل اور دلائل کے ساتھ جلد ہی شایع ہونے والی ہے جو پہلے سے زیادہ ضخیم، لائق قدر اور قابل اعتماد ہوگی، اس لیے آپ اس سرقہ کتاب کو نہ خریدیں، ورنہ یہ تعاون علی الاثم ہوگا، ان شاء اللہ ہم قانونی چارہ جوئی بھی کریں گے، اس کا مزید افسوس ہے کہ اس میں مکتبہ الحسنات کے موجودہ کارکردہ ملک نسیم کے ساتھ ان کے والد عبدالحی صاحب بھی شریک ہیں، اس سے بھی افسوس ناک بات اس پر محمد فاروق خاں کا دیباچہ ہے۔

شائع کردہ
دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد،
اعظم گڈھ۔ (یو۔ پی)

رشحات

زیر نظر پرچہ میں راقم الحروف نے "مسلم پرسنل لاء اور دستور ہند" کے عنوان کے تحت جو کچھ عرض کیا ہے، اس سے ناظرین کو یہ اندازہ ضرور ہو جائے گا، کہ جس وقت "دستور ساز اسمبلی" میں بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ اور رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ پر بحث ہو رہی تھی، اس وقت صدر مسلم لیگ جناب محمد اسمٰعیل مرحوم اور نذیر الدین صاحب وغیرہ نے جو ترمیمات پیش کی تھیں، ان میں سے کسی ترمیم کو قبول نہیں کیا گیا، ان ترمیمات کے قبول نہ کرنے کے وقت ملک کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو تھے، اور گورنر جنرل راجہ گوپال اچاری تھے، اور یہ دستور ڈاکٹر امبیڈکر کی نگرانی میں بن رہا تھا، مگر دستور سازی کے پیچھے ذہنیت کام کر رہی تھی سردار پٹیل، پرشوتم داس ٹنڈن، اور کے ایم منشی اور سمپورنانند جیسے افراد کی، جن کا ذہن پہلے دن سے مسلمانوں کے کسی امتیاز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، گو ۱۹۵۴ء تک اس کا عملی اظہار بہت کم ہو پایا، مگر اس کے بعد دفعہ ۲۵ کی شق الف۔ ب۔ اور دفعہ ۴۴ کے تحت ہندو کوڈ بل، اسپیشل میرج ایکٹ وغیرہ کے ذریعہ دستور میں ترمیمات شروع ہوئیں، جن کا نام تو ہندو کوڈ بل رکھا گیا، مگر اس کا نشانہ مسلم پرسنل لاء تھا، جیسا کہ اس وقت کے وزیر قانون کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، جس کو ہم اپنے مضمون میں نقل کر چکے ہیں، پھر اندرا گاندھی کے دور میں تو دستور میں ترمیم بچوں کا کھیل ہو گیا، نہرو کے وقت تک ہماری عدلیہ بنیادی حقوق کو اہمیت دیتی تھی، اور وہ کم ہی جانب داری سے کام لیتی تھی، مگر اندرا گاندھی کے دور میں نہ تو بنیادی حقوق کی اہمیت باقی رہی، اور نہ راہنما اصولوں کی، جس کا اثر عدلیہ پر بھی پڑا، اور وہ فرقہ واریت اور جانب داری سے متاثر ہو کر رہی، جس کا اظہار ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے متعدد فیصلوں سے ہوتا ہے،

افسوس ہے کہ اس دستوری نزاکت کو پورے طور پر نہ تو مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران سمجھ سکے، نہ مسلمانوں کی کوئی اور جماعت، اور نہ عام پڑھے لکھے مسلمانوں میں اس کا کوئی شدید ردعمل ہوا، زیادہ سے زیادہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور دوسری جماعتوں نے دو ایک تجویزیں پاس کردیں، یا کسی بڑے شہر میں کوئی جلسہ کردیا، الّا اللہ خیر سلا، حالانکہ یہ حضرات ہم جیسے بے ذرایع لوگوں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے قانون دانوں سے مشورہ کرنے کی زیادہ اچھی پوزیشن میں تھے،

ادھر ایک مطلقہ عورت کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے جو غیر دانشمندانہ فیصلہ کردیا، اس کی وجہ سے تائید غیبی کے طور پر مسلمانوں کے اندر اس کا ایک شدید ردعمل اور تحفظ شریعت کا زندہ احساس پیدا ہوگیا، اور ان کے احتجاجی جلسوں کی آواز سے پورا ملک گونج اٹھا، اور حکومت جو بہت اونچا سنتی ہے، اس کے کانوں تک بھی یہ آواز پہنچ گئی، اور ملک کے وزیر اعظم بنگلور میں اور پھر مومن کانفرنس کے اجلاس میں مسلم پرسنل لا میں عدم مداخلت کا اسی طرح کا بیان دے دیا جس طرح کے بیانات سیاسی لیڈروں اور حکومت کے ذمہ داروں سے ہم ۳۷ برس سے سنتے آرہے ہیں، مگر ہمارے مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران جو قربانی کی بات تو الگ رہی کسی عملی اقدام سے بھی گھبراتے ہیں، ان کے بیان کی پوری تصدیق کے بغیر اظہار اطمنان کا ایک بیان دے ڈالا، اور دعوت جیسے تعمیری ذہن رکھنے والے اخبار نے ایک اڈیٹوریل لکھ مارا، سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے یہ راہنما، ۳۷ برس کی ہندی مسلمانوں کی خونچکاں تاریخ اور سیاسی لیڈروں اور حکومت کے کھوکھلے بیانات اور الکشن کے منوفسٹو کی وعدہ خلافیوں کو یکایک کیسے فراموش کر بیٹھے؟ ہم تو عارف محمد خاں کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ وہ بیان حکومت نے مسلمانوں کی نبض دیکھنے کے لیے دلوایا تھا، مگر جب حکومت کو اندازہ ہوا کہ پانسہ اس کے خلاف جارہا ہے، تو اس زخم پر مرہم رکھنے کیلئے ضیاء الرحمٰن انصاری سے بیان دلوادیا، اب ہم ان حضرات کے بیان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں۔

غالباً ۱۹۲۴ء میں شاہ ابن سعود کے پاس علماء، اور جدید تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل جو وفد گیا تھا، اس میں علماء، نے شاہ کے سامنے مسلمانوں کے جذبات کی ذرا ڈھیلی ڈھالی ترجمانی کی، رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ گو عربی زبان سے کم واقف تھے، مگر انہوں نے کھڑے ہوکر انگریزی

کا سہارا لیتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اپنے پورے جذبات کا اظہار کیا۔ پھر ہندوستان واپس آکر ایک سلسلۂ مضامین "ہمدرد" میں شروع کیا، جس میں انھوں نے بعض علما، کے بارے میں یہ فقرہ لکھا تھا، کہ "ان کے جسم میں پسلی کی ہڈی نہیں ہے، اس لیے ان کو جس طرف چاہیے موڑ دیجئے"۔ خدا نہ کرے کہ یہ فقرہ ہمیں مسلم پرسنل لا بورڈ کے محترم ممبران کے بارے میں دہرانا پڑے،

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو ان حضرات پر اعتماد نہیں ہے، ہم ان پر پورا اعتماد کرتے ہیں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات بیانات اور جلسوں کی واہ اور شاباش اور میمورنڈم اور راجیو صاحب سے بے فائدہ بات چیت سے ہٹ کر کوئی متحدہ عملی اقدام کی صورت سوچیں۔ اگر آپ اس مسئلہ کے سلسلہ میں عملی اقدام کی کوئی پہل نہیں کریں گے، تو یہ مسئلہ اب عوام کی عدالت میں پہنچ چکا ہے، اس لیے ممکن ہو کہ ایسے لوگ سامنے آجائیں جو مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیں،

مسٹر راجیو نے اپنے کسی بیان میں معلوم نہیں دفعہ ۱۲۵ اور ۱۲۷ میں ترمیم کی بات کہی ہے یا نہیں، مگر ان حضرات نے اپنے بیان میں اس کا ذکر کیا ہے، اگر ان کے بیان کی یہ صورت ہوتی کہ وہ خود مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران سے ملاقات کرتے، اور پھر ان سے بات چیت کے بعد کوئی بیان دیتے تو کسی حد تک اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، مگر ان حضرات نے خود ملاقات کی کوشش کی تو اس میں کامیابی ہوئی، ایسی صورت میں ان کے اس بیان کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ اگر وہ اس کے لیے کچھ قابل اعتماد مسلمانوں کی کمیٹی بنا دیتے، پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر اپنا بیان دیتے، یا بل پیش کرتے تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے بیان میں مخلص ہیں، لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا، پھر ہمارے راہنما اس پر کیسے اعتبار کر بیٹھے، سلیمان سیٹھ کے بیان میں جو حقیقت پسندانہ بات کہی گئی ہے، وہ ہمارے لیے سنجیدگی سے غور کرنے کی ہے کہ اگر وہ اس میں مخلص ہیں تو بنات والا کے بل کی واپسی پر کیوں اصرار ہے؟

اب مسئلہ صرف کسی ایک دفعہ میں ترمیم کا نہیں بلکہ مسلم پرسنل لا کے اس پورے ڈھانچہ کا ہے جس کی پوری صورت بگاڑ دی گئی ہے، جب تک پورے مسلم پرسنل لا کو جس میں نکاح وطلاق اور عدت ونفقہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وراثت، وصیت، وقف، ہبہ شفعہ

بھی شامل ہیں، جوں کا توں باقی نہ رکھا جائے۔ اس وقت تک مسلمانوں کو اطمینان نہیں ہوگا اور نہ ہونا چاہیے۔

فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں اگر کوئی ترمیم ہوتی بھی ہے تو وہ مسلمانوں کے مفاد میں اتنی نہیں ہے جتنی کہ ہندو قوم کے مفاد میں ہے، آج ہزاروں ہندو لڑکیاں اسی دفعہ ۱۲۵ کی بدولت ہر سال خودکشی کرتی ہیں، یا سسرال والوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، بحمد اللہ تمام خرابیوں کے باوجود مسلمان لڑکیوں میں خودکشی یا ان کے جلا ڈالنے یا مار ڈالنے کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طلاق کے ذریعہ آسانی سے علٰحدہ ہو سکتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ان کا ایمان چاہے جتنا بھی کمزور ہو، مگر اب بھی ان کے اندر خدا کا خوف باقی ہے، اس لیے اتنی مجرمانہ جرأت وہ نہیں کر پاتے، اس لیے اس دفعہ ۱۲۵ میں تو ان کو ترمیم کرنی ہی ہے، صرف وقت کا انتظار ہے، مگر ہمارا مسئلہ اتنے سے حل نہیں ہوتا،

ان گذارشات کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو حکومت کے کھوکھلے بیانات اور سیاسی یقین دہانیوں کی بنا پر اپنی تحریک کو ختم نہیں کرنا چاہیے بلکہ مزید تیزی کے ساتھ اسے جاری رکھنا چاہیے، اور جو لوگ اس میں کمزوری پیدا کرنا چاہتے ہیں، انہیں بھی رد کر دینا چاہیے۔

اس مہینہ میں لوک سبھا کے تین چار اہم الکشن ہوئے ہیں، جن میں سید شہاب الدین کا الکشن مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ مرکز توجہ بنا ہوا تھا، جس شخص نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ سے باہر بیانات اور اپنے انگریزی رسالہ "مسلم انڈیا" کے ذریعہ اپنی پارٹی کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے مسائل کی جتنی اچھی وکالت کی ہے، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور ڈاکٹر فریدی مرحوم کے بعد کسی دوسرے نے نہیں کی ہے، مگر افسوس ہے کہ ملک و ملت بچاؤ جیسی سطحی سیاسی تحریک چلانے والوں نے ان کے مقابلہ میں اپنے جنرل سکریٹری کو جن کا نہ کوئی کارنامہ ہے اور نہ سوجھ بوجھ کو کھڑا کر کے حکومت کے اشارہ پر جو سیاسی کھیل کھیلا تھا، خدا کا شکر ہے وہ ناکام ہو گیا، اور مسلمانوں میں ان کو اپنی حیثیت معلوم ہو گئی، ادھر جب سے مسلم پرسنل لا کا مسئلہ چھڑا ہے، اس میں اپنی حیثیت کو نمایاں کرنے کا موقع نہ پا کر دو مہینے کے اندر نہ جانے کتنی مذہبی حرکتیں یہ حضرات کر چکے ہیں، اور اسی کا ایک مظاہرہ اس

الکشن میں سید شہاب الدین کو ناکام بنانے کا حکومتی منصوبہ بھی تھا، جو خاک میں مل گیا۔

افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ صاحبزادہ مولانا اسعد صاحب مدنی کا مزاج ایسا بن گیا ہے، کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کام بھی ہو وہ ان کے چشم و ابرو کے اشارے پر ہو، جو کام ان کی صدارت میں یا ان کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو چاہے وہ دین و ملت کا کتنا ضروری کام کیوں نہ ہو، یہی نہیں کہ انہیں پسند نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کو کمزور کرنے میں لگ جاتے ہیں، وہ ہر سال کچھ نہ کچھ نئے نئے کاموں کا اعلان کرتے رہتے ہیں، مگر وہ نہ تو جمعیۃ العلماء کے پرانے کاموں میں کوئی پائیداری پیدا کرسکے، اور نہ ان کے نئے کام کی کوئی بیل منڈھے چڑھ سکی، البتہ کچھ دوسرے درجہ کے مادی مفادات وہ ضرور حاصل کر لیتے ہیں،

ادھر آسام کے مسئلہ میں وہ بڑے زور شور سے آگے آئے، مگر نہ تو حکومت کے رویہ میں کوئی نرمی پیدا کرسکے، اور نہ ان لوگوں کی شہریت کے سلسلہ میں کوئی آرڈی نینس پاس کرا سکے، جو ووٹ دینے کے حق سے محروم کردیئے گئے ہیں، بلکہ نیلے پردہ اپنے جنرل سکریٹری کو سید شہاب الدین کے مقابلہ میں الکشن لڑا کر لگانے کی کوشش کی، مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان واقعات اور حالات کے سلسلہ میں مستقبل کا مورخ اپنی ذمہ داری ضرور ادا کرے گا،

معذرت

کتابت کی دقت اور بعض شدید موانع اور اسباب کی بنا پر کئی ماہ سے الرشاد کافی تاخیر سے شایع ہو رہا ہے، نیز اگلا شمارہ (جنوری ۸۶ء) بھی ان ہی اسباب کی بنا پر تاخیر سے ہی قارئین تک پہونچ سکے گا، ہم اس کے لیے اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں، ان شاء اللہ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ فروری سے رسالہ ٹھیک وقت پر قارئین تک پہونچ سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلم پرسنل لا کا مسئلہ

اور

دستور ہند

اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء کے مشترکہ شمارہ میں شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض، نکاح کے اخلاقی مقاصد اور طلاق کی ضرورت و حیثیت اور اس کے تقاضوں کی پوری تفصیل کی جا چکی ہے، اگر نکاح و طلاق، عدت اور اس کے نفقہ کا مسئلہ مسلم پرسنل لا کا ایک جزء ہے، گو اس سے واسطہ مسلم معاشرہ کو سب سے زیادہ پڑتا ہے، مگر بہرحال اس کی اہمیت کے باوجود یہ پورا مسلم پرسنل لا نہیں ہے، اس لیے ہم آج کی گفتگو میں مسلم پرسنل لا اور اس کے مختلف پہلوؤں کی دستور ہند کی روشنی میں تفصیل پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم اس سے پہلے برابر اس طرف توجہ مبذول کراتے رہے ہیں کہ مسئلہ صرف نکاح و طلاق اور عدت و نفقہ کا نہیں ہے، بلکہ پورے مسلم پرسنل لا کا ہے، سب سے پہلے ہم کو اس سلسلہ میں دستور ہند کی دفعہ ۲۵ کا جائزہ لینا ہے، کہ دستور کے بنیادی حقوق کی یہ دفعہ ہمارے مسلم پرسنل لا کو کوئی ضمانت دیتی ہے یا نہیں؟ غلط فہمی میں ہم آج تک اس دفعہ کو مسلم پرسنل لا کے لیے ضمانت تصور کرتے تھے، مگر شاید ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ اس دفعہ ۲۵ کے ذریعہ جو حقوق دیے گئے ہیں وہ کچھ شرائط اور قیود کے ساتھ دیے گئے ہیں، اس دفعہ کا متن یہ ہے:

(1) Subject to public order, morality and helth and to other provisions of this part, all persons are equally entitled to freedom of Conscience and the right.

(2) Nothing in this article shall affect the opration of any existing law or prevent the State from making any law.

(a) Regulating or restricting any economic. financial or other secular activity which may be associated with religious practice.

(b) Providing for social welfare and reform, are the throwing open of Hindu religious - institutions of a public character to all Classes and Sections of Hindus.

دفعہ ۲۵ میں دیے گئے حقوق کے استعمال کی شرائط

"(۱) امن عامہ اور صحت عامہ کے تقاضوں اور اس باب کے دوسرے احکام کے تحت رہ کر تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی اور مذہب کو اختیار کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق حاصل ہوگا۔

دوسری قید

(۲) یہ آرٹیکل ایسے رائج الوقت قانون پر اثر انداز نہ ہوگا، اور نہ ریاست کے لیے کسی ایسی قانون سازی کے لیے مانع ہوگا، جس کے ذریعہ (الف) کسی مذہبی رسم کے معاشی، مالی، سیاسی یا کسی اور سیکولر پہلو کو پابند یا محدود کیا جائے۔ (ب) سماجی بھلائی اور اصلاح یا ہندوؤں کے عوامی نوعیت کے مذہبی اداروں کو ہندوؤں کے تمام طبقات کے لیے کھول دیے جانے کا اہتمام کیا جائے۔"

اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ضمیر اور مذہب اور اس کی تبلیغ کی آزادی کا جو اعلان اس میں ہے، وہ نہ تو غیر محدود ہے اور نہ غیر مشروط ہے، اور مہمی نہیں بلکہ اس مذہبی آزادی کی دفعہ ۲۵ کی ضمنی دفعات الف اور ب میں جو وضاحت کی گئی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امن عامہ، صحت عامہ اور سیکولر مزاج کے دوسرے تقاضوں کے تحت اس میں حکومت کو مداخلت کا ہر وقت حق حاصل ہے، اور پھر دفعہ ۴۴ ریاست کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنائے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ کی مذکورہ بالا تفصیلات اور پھر دفعہ ۴۴ کی وضاحت کے بعد مسلم پرسنل لا یا مذہبی آزادی کی ضمانت ایک فریب معلوم ہوتی ہے، جس وقت دستور بن رہا تھا اس وقت پورے ملک میں مسلمانوں کے

اندر ایک بے اعتمادی اور سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی، اس لیے اس کے بارے میں کوئی عوامی رد عمل ممکن نہیں تھا، مگر بعض سیاسی رہنماؤں نے اس کے اثرات کو سمجھ لیا تھا، چنانچہ مسلم لیگ کے سابق صدر جناب محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ کے سلسلہ میں یہ ترمیم پیش کی تھی:

To follow the Personal Law of the groups or Community to which he belongs or professes to be long.

(Constituent Assembly Debates. vol VII. P. 721)

(اس کو اس بات کی بھی آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جس گروہ یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہے، یا تعلق رکھنا چاہتا ہے، اس کے پرسنل لا پر عمل کر سکتا ہے)

اسی طرح جب دفعہ ۴۴ پر بحث ہو رہی تھی تو مسلم ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے جناب محمد اسماعیل صاحب نے یہ ترمیم پیش کی:

Provided that any group, Sections are Community of People Shall not be obliged to give up its own Personal Law, in Case it has such a law.

(Directive Principles in the Indian Constitutions By K. C. Muskanden P. 183)

(اگر عوام کے کسی گروہ، حصہ یا فرقہ کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے پرسنل لا کو ترک کر دے، اگر وہ ایسا کوئی قانون رکھتا ہو۔)

دوسری ترمیم جناب نذیر الدین صاحب نے پیش کی تھی، جس کی عبارت یہ تھی:

Provided that the Personal Law of any Community which has been guaranted by the Stat Shall not be Changed except with

the previous approval of the Community ascertained in succh manner as the Union Legislature May determine by law

(do Page 193)

(یعنی کسی فرقہ کے پرسنل لا کو جس کی ریاست نے ضمانت دے دی ہے، تبدیل نہیں کیا جائے گا، الا یہ کہ اس فرقہ سے پیشگی منظوری حاصل کرلی گئی ہو، اس طریقہ پر جو مرکزی قانون ساز ادارہ نے بذریعہ قانون اس کے لیے مقرر کیا ہو۔)

اس طرح کی متعدد ترمیمات پیش کی گئی تھیں، مگر یہ ساری ترمیمات رد کردی گئیں، اور یکساں سول کوڈ کی طرف دفعہ ۴۴ کے سایہ میں پارلیمنٹ اور عدلیہ اپنا قدم بڑھاتی رہی، چنانچہ دستور کے نفاذ کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء میں جس کا اثر ہندو مسلم دونوں پر پڑتا تھا، پاس ہوا، اور پھر ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ء میں جس کا اثر ہندو پرسنل لا پر پڑتا تھا، پاس ہوا، پھر ہندو پرسنل لا کو منسوخ کرکے ہندو کوڈ بل کو ۱۹۵۶ء میں پاس کردیا گیا، اب یہی ہندو کوڈ بل کچھ ترمیمات کے ساتھ مستقبل قریب میں ہندوستان کے تمام شہریوں پر لاگو کیا جائے گا، جس زمانہ میں ہندو پرسنل لا میں ترمیم کی جارہی تھی، اس وقت کے مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے ایک ریڈیائی تقریر میں کہا تھا:

"ہم نے اپنے آئین کے نفاذ یعنی ۲۶ جنوری سن ۵۰ء کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ اور ہندو میرج ایکٹ پاس کیے ہیں، ہندو قانون وراثت کا مسودہ زیر غور ہے، یہ سب ضابطہ دیوانی کو یکساں بنانے کے اقدامات ہیں، صرف جذباتی لوگ ان اقدامات کی مخالفت کرتے ہیں، اور دریافت کرتے ہیں کہ ہم صرف ہندو قانون ہی کو ایک ضابطہ میں لانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں، اس کا جواب صاف ہے، سارے سماج کو متحد اور منضبط بنانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس کے بڑے حصہ ہی کو اکٹھا کرنا ہوگا، ہم اس وقت تک سارے جماعت کے لیے واحد ضابطۂ دیوانی بنانے کا خیال بھی نہیں کرسکتے، جب تک ہم ملک کے ان لوگوں کے پرسنل لا کو ایک ضابطہ میں نہیں لاتے جنہیں ہندو کہا جاتا ہے، اور ملک کی آبادی کا پچاسی فیصدی ہیں"

مرکزی وزیر قانون نے اسی زمانہ میں ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:

"ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی، اگر ہم ایسا قانون بنانے میں کامیاب ہوگئے جو ہماری پچاسی فیصدی آبادی کے لیے ہو تو اس کا نفاذ بقیہ آبادی پر مشکل نہ ہوگا، اس قانون سے پورے ملک میں یکسانیت پیدا ہوگی۔"

مذکورۂ بالا خیالات[1] کی تائید پروفیسر جے۔ ڈنکن کے، جو لندن یونیورسٹی میں اورینٹل لا کے پروفیسر ہیں اس خیال سے بھی ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے انڈین سول کوڈ کے موضوع پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

The Civil Code promised in Article 44 of the Constitution is like the Hindu Code of which we have spoken before, a misnomer but a convenient one.

(Religion Law and the State in India By J. Duncun . P. 546)

"جس سول کوڈ کا دستور دفعہ ۴۴ میں وعدہ کیا گیا ہے وہ ہندو کوڈ کی طرح جس کے بارے میں ہم اس سے پہلے گفتگو کر چکے ہیں، اگرچہ (ہندو کوڈ) نام کے اعتبار سے غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، لیکن موزوں (سول کوڈ) یہی ہے"

یہ ہے حقیقی، آئینی اور عملی صورت حال اور ہندو قانونی ماہرین کے خیالات، اس میں اتنی بات کا اور اضافہ کر لیجیے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیاں مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے سوا اس معاملہ میں کانگرس کی ہم نوا ہیں، اور غیر مسلم رہنماؤں میں سے ہم کسی کو نہیں جانتے کہ جو اس معاملہ میں ملت اسلامیہ کے موقف کو اچھی طرح سمجھتا اور صحیح تسلیم کرتا ہو[1]۔

اوپر جن دستوری دفعات اور ان میں ترمیموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے نتائج یہ نکلتے ہیں، ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ء کی رو سے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کی جا سکتی، اگر کوئی کرے گا تو انڈین پینل کوڈ میں اس کے لیے سات سال کی سزا تجویز کی گئی ہے، طلاق کا حق مرد سے چھین کر عدالت کو دے دیا گیا ہے، اسی طرح عورت کو خلع کا حق بھی عدالت ہی کے ذریعہ مل سکتا ہے، اسی طرح اگر عدالت نے دونوں میں تفریق کرا دی تو نان نفقہ کی مقدار اور اس کا وقت مقرر کرنے کا اختیار عدالت ہی کو ہوگا، یعنی جب تک درخواست دہندہ کی دوسری شادی نہیں ہو جاتی، یا اس کا انتقال نہیں ہو جاتا، اسی طرح وراثت کے سلسلہ میں ہندو سکشن ایکٹ ۱۹۵۶ء نافذ العمل ہے جسے عام طور پر ہندو کوڈ کہا جاتا ہے، اس میں اگرچہ اسلام کے قانونِ وراثت سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مگر اس میں بعض ایسی ترمیمات کر دی گئی ہیں کہ اسلامی شریعت کا یہ حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح اسپیشل میرج ایکٹ کا

---

[1] حال ہی میں آر۔ ایس۔ ایس کے رہنما گرو گولوالکر اور رام راج پریشد کے رہنما سوامی کرپاتری جی نے یکساں سول کوڈ کی مخالفت کی ہے، ہندو سماج کا یہ اچھا رجحان ہے جو ہمارے سامنے آ رہا ہے (گو ان لا اور ان میں تبدیلی) مگر ان میں گرو گولوالکر اور کرپاتری صاحبان کا جذبہ دوسرا ہے۔

ذکر اوپر آچکا ہے، اس میں بہت سی قانونی دفعات کے ساتھ یہ بھی درج ہے کہ چچازاد بھائی، پھوپھی زاد بھائی، خالہ زاد بھائی اور ماموں زاد بھائی سے شادی ممنوع ہے، اسی طرح وقف اور ہبہ کے سلسلہ میں نہ جانے کتنی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، شفعہ کے حق کو بالکل ہی ختم کر دیا گیا ہے، غرض یکہ دفعہ ۴۴ کے ذریعہ یکساں سول کوڈ بنانے کی جو ہدایت دی گئی ہے اس پر ہماری سیکولر حکومت پورے طور پر عمل کر رہی ہے، اور بنیادی حقوق کی دفعہ پچیس ۲۵ میں جو ضمانت دی گئی ہے وہ اپنے شرائط و قیود اور دفعہ ۴۴ کی موجودگی میں ایک فریب ہو کر رہ گئی ہے، دستور بنتے وقت دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں جو ترمیمات ہمارے رہنماؤں نے پیش کی تھیں وہ رد کر دی گئیں، اور مسلمان اس وقت کے خونچکاں حالات میں کوئی موثر آواز نہ اٹھا سکے، نہ پارلیمنٹ کے اندر نہ اس کے باہر، ان ہی حالات کے پیش نظر مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل ہوئی، جس میں ہر خیال کے علماء اور اہل علم شریک ہوئے اور ہیں، اس وقت اس سلسلہ میں ہماری امیدوں کا مرکز وہی ہے، مگر بورڈ کے معزز ممبروں نے بڑے بڑے جلسے تو ضرور کیے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، مگر وہ کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھا سکے، اس لیے مسلم پرسنل لا کے ممبروں سے ہماری گذارش ہے کہ ان کو یہ سمجھ کر اس مسئلہ میں اپنی کوششوں کا رخ متعین کرنا ہے کہ ۳۰ برس کی اس طویل مدت میں مسلم پرسنل لا کی گردن میں نہ جانے کتنے ریشمی پھندے ڈال دیے گئے ہیں، اب اس وقت کا انتظار ہے کہ یہ پھندے کھینچ دیے جائیں اور اس کی سانس ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، گویا ہم اس سلسلہ میں ۳۰ برس پیچھے ڈال دیے گئے ہیں، اور وہاں سے ہمیں اپنی کوشش کا آغاز کرنا ہے۔

دفعہ ۲۵ کے ساتھ جو قیود لگے ہوئے ہیں ان کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے اگر کچھ مدد مل سکتی ہے تو دفعہ ۱۳ سے جس کی ایک شق یہ ہے:

13- Laws inconsistent with or in derogation of the fundamental rights.

(1) All laws in force in the territory of India immediately before the commencement of this Constitution, in so far as they are inconsistent with the provisions of this part, shall to the extent of such in

Consistency, be void.

(2) The State Shall not make any law which takes away or abridges the rights Conferred by this part and any law made in Contravention of this Clause Shall, to the extent of the Contravention be void

(۱) یعنی مملکت کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کیے ہوئے قانون کو چھین لے یا ان میں کمی کر دے
(۲) اگر کوئی قانون اس جزو کی خلاف ورزی میں بنایا جائے تو خلاف ورزی کی حد تک باطل ہوگا۔
(۳) وہ سب قوانین جو اس آئین کی تاریخ نفاذ سے عین قبل بھارت کے علاقہ میں نافذ ہوں، جہاں تک وہ اس حصے کے مناقض ہوں، ایسے تناقض کی حد تک باطل ہوں گے۔

گویا دفعہ ۴۴ کو اس دفعہ ۱۳ اور دفعہ ۲۵ کی روشنی میں باطل ہونا چاہیے، اسی طرح دفعہ ۴۴ اور فوجداری دفعہ ۱۲۵ کے تحت جو ترمیمات ہوئی ہیں، اور جس سے مسلم پرسنل لا مجروح ہوا ہے، ان سب کو کالعدم ہونا چاہیے، مگر جیسا کہ آگے ہم عرض کریں گے، ہماری کانگریس حکومت کو نہ تو بنیادی حقوق کا پاس و لحاظ ہے اور نہ رہنما اصولوں کا، وہ صرف فرقہ پرستوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے، اور اپنی حکومت کی بقا اسی میں سمجھتی ہے۔

مسلم پرسنل لا کی منسوخی کے محرکات

مسلم پرسنل لا کی منسوخی کے حقیقی اور اہم محرکات صرف دو ہیں، اس سلسلہ میں سید حامد علی صاحب کے الفاظ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) ہندوستان میں بعض سیاسی پارٹیاں یہ نقطۂ نظر رکھتی ہیں کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، اور ہندو تہذیب ہی ہندوستانی تہذیب ہے، ان کے نزدیک ملک کی فلاح اس میں ہے کہ کسی طرح یہاں کے سارے لوگ ہندو قومیت، ہندو تہذیب، ہندو رسم و رواج، ہندو روایات اور ہندو اکابر کو اپنا لیں، یہ کم سے کم بات ہے ورنہ ان کے نزدیک صحیح بات تو یہ ہے کہ ہندو دھرم کو چھوڑ کر یہ لوگ مجبوراً اسلام یا عیسائیت کی گود میں چلے گئے تھے، یہ مجبوری اب ختم ہو گئی ہے، اس لیے وہ ہندو ملت کے آغوش میں واپس لوٹ آئیں، اس طرح کی سیاسی پارٹیوں کا اثر چاہے ابھی ملک میں زیادہ نہ ہو، مگر ان کا یہ انداز فکر نوجوان نسل میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، اور ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی ایسی نہیں ہے جس کے افراد اس فکر کے اثرات سے بالکلیہ پاک ہوں، سیکولرزم کا اظہار سیاسی مصلحت کے تحت صرف

زبانی کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر کے رکھنے والے اسلام، مسلم پرسنل لا اور مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے، لیکن اس کے باوجود ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں ایسے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ تعلقات قائم کرکے ان پر یہ واضح کرنا چاہیے کہ یہ نقطۂ نظر خود ان کے مذہب اور تہذیب اور ان کے مقصد کے لیے مضر ہے، اس سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں شدید ردعمل ہوگا، انھیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اس سے ملک میں انتشار پیدا ہوگا، انھیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام فی الواقع کیا ہے؟ اور اس سے ملک اور انسانیت کی فلاح کس طرح وابستہ ہے، اور ان پر اپنے قول و عمل سے یہ بھی واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ مسلمان جان تو دے سکتا ہے مگر اسلام سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکتا۔

(۲) کچھ دوسرے لوگ ہیں، وہ ہندو قومیت کے بجائے ہندوستانی قومیت کے اور ہندو تہذیب کے بجائے ہندوستانی تہذیب کے قائل ہیں، وہ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی اور تمام فرقوں اور ملتوں کو ایک قوم خیال کرتے ہیں، اور ایک قوم سمجھنے کا تقاضا کرتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے مابین مذہبی اور تہذیبی امتیازات کم سے کم ہوں، تا آنکہ ایک مشترکہ مذہب اور مشترکہ تہذیب وجود میں آجائے، یہ حضرات اپنے کو سیکولر کہتے ہیں، اور اپنے اس نقطۂ نظر کو سیکولرزم۔

الگ الگ پرسنل لا کو متحدہ قومیت کے لیے سم قاتل سمجھتے ہیں، وہ ملت اسلامیہ کے انفرادی تشخص کے برقرار رکھنے کے بھی قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک جداگانہ پرسنل لا، جداگانہ تہذیب اور جداگانہ رسم الخط یہ سب چیزیں ہیں جو ہندوستانی قومیت میں انتشار پیدا کرتی ہیں، اور ملک کے لیے شدید خطرے کا موجب بنتی ہیں، بلکہ خود اقلیتوں کے لیے سخت مضرت رساں ہیں، ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کی علیحدگی پسندی ہے جو فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہے، اور فرقہ وارانہ فسادات کا سبب بنتی ہے، وہ بھارت، بھارتیہ راشٹر اور خود مسلمانوں کے تحفظ و فلاح کے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلم امتیازات کم سے کم ہوں، ان کے الگ الگ پرسنل لا ہونے کے بجائے ایک ہی پرسنل لا ہو، وہ الگ تیوہار منانے کے بجائے ایک ہی نیشنل تیوہار منائیں، مختلف فرقوں کے مابین شادی بیاہ کے روابط قائم ہوں، اور اس طرح سب لوگ ایک مشترکہ قومی دھارے میں ---

ایسے افراد کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اکبر جیسا فرماں روا اور کبیر اور نانک جیسے ... پیشوا اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے، بلاشبہ ہندوستانی سیاسی اور آئینی اعتبار سے ایک قوم ہیں، لیکن یہ ایک ایسی قوم ہے جو مختلف ملتوں، مذہبوں، تہذیبوں اور رسوم و روایات کے ماننے والوں پر مشتمل ہے، اور ملک کی

فلاح اس میں نہیں ہے کہ پورے ملک کے باشندوں کو ایک مذہب اور ایک تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا جائے، بلکہ اس میں ہے کہ ہر گروہ کے مذہب، پرسنل لا، تہذیب و روایات اور طور طریق کو پھلنے پھولنے کے یکساں اور پورے مواقع ملیں، تاکہ ہر گروہ دل سے یہ محسوس کرے کہ وہ واقعتہً آزاد ہے، اور اسے یکساں شہری حقوق حاصل ہیں

ایسے افراد کو یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ اسلام اور مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، وہ اگر زندہ رہیں لیکن ان کا پرسنل لا اور دین زندہ نہ رہا تو یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے، کیونکہ اس کا انجام آخرت کا عذاب الیم ہے، اور وہ دنیا کی ہر مصیبت سے بڑھ کر ہے۔"

اس سے پہلے ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ جس طرح انگریزوں نے اسلامی قوانین میں ترمیمات کر کے ہم کو چند مسائل میں فیصلہ کی آزادی دے رکھی تھی، جس کا نام انھوں نے محمڈن لا رکھا تھا، اسی طرح اس محمڈن لا میں ہماری سیکولر حکومت دستور سازی کے وقت ہی سے ترمیمات کے لیے زمین ہموار کر رہی ہے، زمینداری ابالیشن ایکٹ میں مزروعہ زمینوں میں لڑکیوں کا حصہ ختم کر دیا گیا، متبنّیٰ بل پارلیمنٹ میں پیش ہے، وراثت، وصیت اور ہبہ و وقف میں بہت سی ترمیمات ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں، نکاح وطلاق کے سلسلہ میں آپ ہندو کوڈ بل کی تفصیلات پڑھ چکے ہیں، یہ ہندو کوڈ بل جلد ہی ہندوستان کوڈ بل بننے والا ہے، ایسی صورت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران حضرات اور تمام مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے، اور یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے، اس کے لیے ایک طویل پُر امن جنگ کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ جس کے بارے میں ہمیں غور کرنا ہے، وہ یہ کہ دستور میں "بنیادی حقوق" (Fundamental Rights) کے نام سے کچھ دفعات شامل ہیں، اور کچھ "رہنما اصول"۔ (Directive Principles) کے تحت اس میں داخل ہیں، ان دونوں میں اہمیت کس کی ہے؟ اس میں ماہرین قانون کے درمیان اختلاف ہے، عدلیہ اب تک بنیادی حقوق کو اہمیت دیتی رہی ہے، جیسے سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس صاحب نے دفعہ ۴۴ اور ۱۲۵ کے ذریعہ مجروح کر دیا، اور ہماری حکومت رہنما اصول کو اہمیت دیتی رہی ہے، اگرچہ وہ بھی اسے ہمیشہ مجروح کرتی رہی ہے، رہنما اصولوں میں ہی ایک اصول شراب بندی کا بھی ہے، جسے کانگریس حکومتوں نے پارہ پارہ کر ڈالا ہے، اور یکے بعد دیگرے شراب بندی سے ہر صوبہ میں پابندی اٹھ رہی ہے، اگر حکومت اور عدلیہ دفعہ ۱۴ کی دی گئی ہدایت کا کچھ بھی لحاظ کر لیتی تو نہ تو دفعہ ۴۴ کی تلوار سے مسلم پرسنل لا مجروح ہوتا اور نہ دفعہ ۱۲۵ فوجداری ایکٹ شتر بے مہار ہونے پاتا، اس روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری حکومت کے

ذمہ داروں کے نزدیک نہ بنیادی حقوق کی اہمیت ہے اور نہ رہنما اصول کی، وہ اپنے مفاد اور خواہشات کی تکمیل چاہتے ہیں، اب یہی حال عدلیہ کا بھی ہوتا جارہا ہے، دستور کا احترام سب سے زیادہ اندرا گاندھی کے دور میں مجروح ہوا ہے غرض یہ کہ ہمیں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلہ میں ان دستوری نزاکتوں اور عملی دقتوں کو سامنے رکھ کر آیندہ اپنے اقدامات کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

آزاد ہندوستان میں ہمارے سامنے جو مسائل درپیش ہیں، ان میں سب سے زیادہ مسئلے دو ہیں، ایک یہ کہ ہمارا دینی تعلیم کا نظام یہاں کس طرح محفوظ رہے، اور دوسرے کم از کم ہمارے عائلی قوانین میں کسی حکومت کی مداخلت نہ ہو، اور جو ہو چکی ہے اس کو واپس کیا جائے، انگریزوں کے خلاف علماء [illegible] نے جو جد وجہد کی تھی، اس میں سیاسی آزادی کے ساتھ مذہبی آزادی کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں تھا اور ہمارے علماء اور عوام نے اسی جذبے سے سرشار ہو کر اپنے جسم وجان کی بازی لگا دی تھی، اس لیے ہم کو بھی اپنی جد وجہد کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھنا چاہیے۔ ہماری زبان، ہماری تعلیم، ہماری تہذیب اور ہمارا دین محفوظ نہیں ہے تو ایسی آزادی ہمارے لیے بیکار ہے۔

مسلم پرسنل لا پر اعتراضات اور اس کے سلسلہ میں شبہات

یہ تھی مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں قانونی پوزیشن، اب ہم مختصر طور پر ان اعتراضات کا جائزہ بھی لیں گے جو مسلم پرسنل لا پر نہیں بلکہ اسلامی شریعت پر کیے جاتے ہیں، مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں غیر مسلموں اور مسلمانوں کے اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے کچھ اعتراضات اور شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے جو مغربی تہذیب کا دلدادہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسے مستغرب کہنا زیادہ صحیح ہے، اگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراضات مسلم پرسنل لا پر نہیں، بلکہ اسلامی شریعت پر کیے جاتے ہیں، اس لیے کہ یہ حضرات اسلامی شریعت کو اپنی آزادی میں حارج سمجھتے ہیں۔

(۱) مسلم پرسنل لا پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ طلاق کا حق صرف مردوں کو دے دیا گیا ہے جس کی وجہ سے مرد جب چاہتا ہے طلاق دے کر عورت کو بالکل بے سہارا کر دیتا ہے، اس بے قید اختیار کی وجہ سے عورتوں کو مظلوم اور کمزور بنا دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے طرز عمل یا کسی بے راہ روی کی وجہ سے اس سے مطمئن نہیں ہے تو اسے طلاق کا حق حاصل ہے، اس حق کے غلط استعمال کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح اگر عورت کو شوہر سے تکلیف پہونچ رہی ہے۔ وہ اس کی کسی بے راہ روی سے پریشان ہے۔ اور وہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں کرتا ہے تو اسے بھی خلع کا حق ہے، وہ مسلمان حاکم کے ذریعہ خلع کرا سکتی ہے، اور امارت شرعیہ اور

جماعت شرعیہ کے ذریعہ بھی اسے یہ حق حاصل ہے، نکاح و طلاق کی تفصیل ہم گذشتہ رسالہ میں کر چکے ہیں، عورت خلع کن کن صورتوں میں کر سکتی ہے اس کی تھوڑی سی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) وہ شوہر جو عورت پر ظلم کرتا ہو، اس کو نان نفقہ حسب حیثیت نہ دیتا ہو۔

(۲) شوہر وطن سے باہر ہے اور بیوی کی کھوج خبر نہیں لیتا، یعنی غائب غیر مفقود ہے۔

(۳) مفقود الخبر ہے، (۴) عنین یعنی نامرد ہے، (۵) کوئی ایسی سخت بیماری ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات قائم رکھنے میں بیوی کے شدید بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق و فرائض میں صرف دونوں کی فطری ساخت اور دائرۂ کار کے اعتبار سے فرق ہے، نہ یہ کہ مرد کے مرد ہونے کی وجہ سے، اور عورت کے عورت ہونے کی وجہ سے اس سے پہلے میاں بیوی کے فرائض اور حقوق کے ضمن میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں، اور یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ نکاح مرد اور عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے، اسلامی شریعت میں نکاح ہندؤں کی طرح نہ تو دھارمک سنسکار ہے، اور نہ کنیادان ہے، بلکہ اسے ایک معاہدہ قرار دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں مرد اور عورت دونوں کی حیثیت برابر ہے، اور دونوں کے کچھ فرائض اور کچھ حقوق ہیں، ان میں سے کوئی اگر اپنا حق ادا نہیں کرتا ہے تو مرد کو طلاق کے ذریعہ اور عورت کو خلع کے ذریعہ علٰحدہ ہو جانے کا اختیار ہے، طلاق کی ضرورت پر بھی ہم اس سے پہلے روشنی ڈال چکے ہیں۔ طلاق کے بعد عورت کے لیے بے سہارا ہونے کی جو بات کہی جاتی ہے، اس کی تفصیل ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں، کہ عورت کو کسی صورت میں اسلام نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے، آگے مزید کچھ تفصیل آرہی ہے۔

(۲) مسلم پرسنل لا یا اسلامی شریعت پر دوسرا اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں مردوں کو دوہرا اور عورتوں کو اکہرا حصہ دیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ مسلمان عورتوں کی ہمدردی میں یہ اعتراض ان غیر مسلموں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو بھائی کی موجودگی میں بہن کو وراثت دینے کے قائل ہی نہیں ہیں، زمینداری ابالیشن ایکٹ میں سب سے پہلے لڑکیوں کا حصہ عورتوں کے ہمدردوں ہی کی طرف سے ختم کر دیا گیا، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، بہرحال پہلے اعتراض کی طرح یہ اعتراض بھی انتہائی سطحی اور اسلامی تعلیم سے عدم واقفیت پر مبنی ہے، مرد کو اگر شریعت نے جائداد، مکان اور نقد روپئے میں دو حصہ اور عورت کو ایک حصہ دیا ہے تو اس اعتبار سے دونوں کی ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں، جس طرح مرد کو لڑکے کی حیثیت بھائی کی حیثیت سے باپ اور چچا کی حیثیت سے اور اس کے علاوہ حالات کے لحاظ سے بہت سی صورتوں میں وہ دوہرا حصہ پاتا ہے، اسی طرح عورت بیٹی کی حیثیت سے، بہن کی حیثیت، ماں کی حیثیت، بیوی کی

حیثیت سے اور بہت سی حیثیتوں سے حصہ پاتی ہے۔

مرد دوہرا حصہ پاتا ہے تو اس میں اس کے اوپر اپنے بال بچوں کے کھانے پینے، کپڑے اور تعلیم اور دوا علاج کی ذمہ داری ہے، اگر باپ ماں کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے تو ان کی ذمہ داری بھی اسی کے اوپر ہے، اگر باپ ماں کا انتقال ہوگیا ہے، یا وہ معذور ہوگئے ہیں تو اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی ذمہ داری بھی اسی کے اوپر ہے۔

اس کے برخلاف عورت ایک حصہ پاتی ہے، مگر اس کے اوپر قانونی طور پر نہ تو شوہر کے اخراجات کی ذمہ داری ہے، نہ اس سے پیدا شدہ بال بچوں کی، نہ اپنے ماں باپ کی ذمہ داری اور نہ بھائی بہنوں کی، بلکہ اس کو جو کچھ بھی ترکہ میں ملے گا وہ ساری جائداد اور سرمایہ محفوظ رہے گا، صرف اس کو یا تو اپنی ذات سے متعلق چند ضروریات پر خرچ کرنا ہوگا یا پھر دینی فرائض مثلاً زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور قربانی، فدیہ وغیرہ کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔

یہ اعتراض کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی شریعت نے عورتوں کو کمتر اور مظلوم بناکر رکھ دیا ہے، مگر اوپر ذمہ داریوں کی جو تھوڑی تفصیل کی گئی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرد کو اگر دوہرا حصّہ ملتا ہے تو اس کی ذمہ داریوں کا دائرہ اس کا کئی گنا زیادہ وسیع ہے، اور عورت کو اکہرا حصہ ملتا ہے، تو اس کی ذمہ داریاں مردوں کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہیں، اگر کوئی عورت شوہر کی ذمہ داریوں میں اس کا ہاتھ نہ بٹائے تو شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے مجبور کرسکے، اگر وہ خود ہاتھ بٹاتی ہے تو یہ شوہر کے اوپر اس کا احسان ہوگا، اب فیصلہ کیجئے کہ اسلامی شریعت نے عورت کو کمتر اور مظلوم بنایا ہے، یا مرد کے مقابلہ میں اسے زیادہ بہتر اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہلکا پھلکا کردیا ہے۔

(۳) ایک خوبصورت مگر انتہائی پُرفریب جذباتی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت نے عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کرکے ان کی صلاحیتوں کو محدود کردیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات عورت کے سلسلہ میں اٹھائے جاتے ہیں وہ سب مغربی تہذیب کے اس جذباتی نعرہ اور جنسیاتی فلسفہ "مساوات مرد وزن" کی پیداوار ہیں، مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے عورت کو یہ پُرفریب نعرہ اور غیر فطری فلسفہ دے کر اس کی صنفی پاکیزگی کو جس طرح پامال کیا ہے، دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اس لیے ہم مساوات مرد وزن کے نظریہ پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں شاید دو رائے نہیں ہے کہ بحیثیت انسان عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ خاندانی نظام کو مستحکم کرنے میں بعض حیثیتوں سے اس کا مقام مرد سے اونچا ہے، مگر رائے کا اختلاف وہاں سے شروع

ہوتا ہے، جب مرد و عورت کے دائرۂ کار کی بات شروع ہوتی ہے، مغربی تہذیب کے دلدادہ اور اس سے متاثر افراد یہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کا الگ الگ کوئی دائرۂ کار نہیں ہے، بلکہ جس طرح ایک مرد سیاست، معیشت اور نظم و انتظام کے ہر میدان میں رواں دواں ہے، اسی طرح اس کے دوش بدوش عورت کو بھی رواں دواں ہونا چاہیے، اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بحیثیت انسان عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے، چنانچہ قرآن نے جہاں تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی کہا ہے کہ اس کے جنس سے ہم نے عورت کو بھی پیدا کیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ — وہی ذات ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا،

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اعراف) — اور اس کے جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔

اس کے جنس سے اس کا جوڑا بنانے کی جو بات کہی گئی ہے، اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ عورت کوئی ذلیل اور حقیر مخلوق نہیں ہے، بلکہ انسان کی حیثیت سے وہ بھی اسی شرف و عزت کی مستحق ہے جس کا ایک مرد مستحق ہے، قرآن کی اس تعلیم کی اہمیت کا پورا اندازہ اس وقت لگ سکتا ہے جب آپ پانچویں صدی عیسوی کی معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کریں گے، کہ بعثت نبویؐ کے وقت اور اس سے پہلے عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے معاشرہ میں عورت کی حیثیت کیا تھی؟ نہ صرف مشرکانہ ماحول ہی میں اس کی حیثیت ایک ذلیل غلام کی تھی، بلکہ خدا کی کتاب کے حاملین اہل کتاب کے یہاں بھی وہ ایک ناپاک مخلوق تھی، ایام ماہواری میں ان کے قریب جانا، ان کے نزدیک گناہ تھا، نسل آدم کی ساری غلطیوں کی ذمہ دار عورت تھی۔

عورت اور انتظام

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ جدید تہذیب نے "مساوات مرد و زن" کا غیر فطری فلسفہ دے کر جس طرح عورت کے گلشن عفت و عصمت کو پامال کیا ہے، اسلامی شریعت اس غیر فطری فلسفۂ مساوات کو تو تسلیم نہیں کرتی لیکن نفس مساوات کے تصور یا انسانی معاشرہ میں عورت کی باوقار حیثیت میں اس کو کوئی اختلاف نہیں ہے، اسلامی شریعت کا جدید تہذیب سے اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ عورت کو سیاسی اور اجتماعی نظم و انتظام میں مردوں کے دوش بدوش چلے بغیر اس کی باوقار مساویانہ حیثیت قائم رہ سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کا دائرہ محدود کرنے میں کون سے نقصانات یا فوائد ہیں، اس وقت جو لوگ اس کے دائرۂ کار کے وسیع کرنے کے داعی ہیں، عملاً وہ بھی دستور ساز اداروں اور نظم و انتظام یعنی ایڈمنسٹریشن کے کاموں میں عورت کو کہیں مساویانہ حیثیت نہیں دیتے ہیں، مگر عورتوں کا ووٹ حاصل کرنے یا ان کی سیاسی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یا پھر ان کو اپنی ہوسناکی کا شکار بنانے کے لیے یا مرعوبیت کی بنا پر نعرۂ مساوات مرد و زن میں لگاتے ہیں،

جہاں اس وقت کوئی عورت ملک کی سربراہ ہے جیسے کہ ہمارے ملک میں ابھی ایک سال پہلے اندرا گاندھی تھیں، وہاں بھی ان کو مذکورہ بالا شعبوں میں مساویانہ حیثیت نہیں دی گئی ہے، نہ تو روس میں کبھی عورت صدر یا وزیر اعظم بن سکی، اور نہ امریکہ و فرانس میں، [illegible] کسی ملک میں عورتوں کی فوج کی پوری بٹالین بنائی گئی ہو، اور پھر اس نے کسی محاذ پر پہونچ کر جنگ [illegible] انجام دیا ہو، ہندوستان میں ایک بار کچھ لوگوں نے عورتوں کو فوج میں بھرتی کے لیے کہا تو جنرل کری اپا جو اس وقت کے کمانڈر انچیف تھے یہ حکم جاری کیا:

"دیویو! تم گھر کے کام کاج سنبھالو، فوج کے کاموں میں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس اس کے لیے مردوں کی کمی نہیں ہے۔"

پھر ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس وقت کے گورنر جنرل نے ایک ہنگامی قانون نافذ کیا جس کے ذریعہ فوج اور ٹریڈ یونینوں میں عورت کی شرکت پر پابندی لگائی گئی (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۱۹۵۰ء)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے دائرۂ کار میں فرق ضرور ہے، اور اس کو شرق و مغرب ہر جگہ عملاً تسلیم کیا جا رہا ہے، عورت اور مرد کا دائرۂ کار مقرر کرنے میں یہ بات بھی صاف کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مغربی یا جاہلی تہذیب اور اسلام کے درمیان ایک فرق پردہ کی وجہ سے بھی ہے، پردہ کا نام سن کر بعض تعلیم یافتہ عورتوں، اور جن لوگوں کے لیے عورتوں کی بے پردگی جنسی تسکین کا سامان ہے، وہ حضرات ایک شدید قسم کی گھٹن محسوس کرتے ہیں، مگر پردہ کے نام سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اسلام نے یہ قید عورتوں کی حقارت کی بنا پر نہیں لگائی ہے، بلکہ اس لیے لگائی ہے کہ اس صنف نازک کی فطری لطافت طبع مجروح نہ ہونے پائے، اور نہ مردوں کو ان کے گلشن حیات کی نازک دستیوں کو پامال کر دینے کا کوئی بے قید موقع مل سکے۔

دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل غور ہے وہ یہ کہ کچھ اخلاقی قدریں ایسی ہیں جن کو مرد اور عورت کے تعلقات میں حد فاصل کی حیثیت حاصل ہے، خاص طور پر ہمارے ملک میں نہ صرف مسلمان قوم اس کا لحاظ کرتی ہے، بلکہ دوسرے برادران وطن بھی اس کو دائمی قدر کے طور پر نہ سہی مگر اس کو عملاً تسلیم کرتے ہیں، مثلاً مخلوط تعلیم، اور بے محابہ مرد و عورت کے اختلاط کو کسی نہ کسی درجہ میں ہمارے ملک کا ہر باشندہ تسلیم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک کے اندر مہیلا اسکول و کالج اور مدرسۃ النسواں اور مدرسۃ البنات نہ صرف قائم ہیں، بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، اور آج کوئی باعزت آدمی اپنی بیوی، بیٹی یا بہن کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ چراغ خانہ بننے کے بجائے بے محابا شمع محفل بنتی پھرے، یا وہ ہر شخص کے لیے خوان یغما بن جائے، ان چند آبرو باختہ لوگوں کا یہاں ذکر نہیں ہے جن کے

نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یہی وہ اخلاقی حس ہے جس کی وجہ سے ذمہ داران حکومت آبادی کے تناسب کے اعتبار سے عورتوں کو دستور ساز اداروں اور ایڈمنسٹریٹوشنوں میں جگہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، جیسا کہ ابھی ہم فوجی اداروں میں بھرتی کے سلسلہ میں عرض کرچکے ہیں، یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک کی عورتیں ابھی تعلیم میں پیچھے ہیں، اس لیے ایسا ہے، مگر جہاں سو فیصد تعلیم ہے وہاں بھی یہی فرق موجود ہے۔

حال ہی میں اقوام متحدہ کی سماجی تنظیم یونیسیف کی ایک میٹنگ دہلی میں ہوئی تھی جس میں کھل کر اعتراف کیا گیا کہ جدید تہذیب کی اس دنیا میں بچوں کے مقابلہ میں بچیوں کی حالت زیادہ قابل رحم ہے، ان کو بچوں کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے، افتتاحی اجلاس میں ملک کے مشہور صحافی خشونت سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"بدقسمتی سے ملک میں ہونے والے جرائم مثلاً بہوؤں کا جلایا جانا، یا جہیز کے لالچ میں ہونے والے قتل کی وارداتیں سکھ، جین اور ہندو مت کے ماننے والوں میں زیادہ ہوتی ہیں، اس کے برخلاف مسلمانوں اور عیسائیوں میں اس طرح کے انسانیت سوز واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔" (دعوت سہ روزہ، ۱۹ / اکتوبر ۱۹۸۶ء)

جدید تہذیب کے علمبرداروں کا یہ اعتراف بتاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو باوقار مقام دیا تھا، جدید تہذیب نے اسے اس سے نیچے گرادیا، گو زبان پر نعرہ مساوات مرد و زن کا لگاتے رہے،

عورت اور مرد کے سلسلہ میں ایک اور چیز قابل غور ہے، اور وہ ہے بچوں کی پرورش اور تربیت، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ بچوں کو پیدائش کے بعد حکومت کی بنائی ہوئی پرورش گاہوں میں دے دیا جائے جیسا کہ مغربی ملکوں میں ہے، یا پھر اپنے گھر کے ماحول میں اس کی تربیت کی جائے، پہلی صورت میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ بچہ کو پیدائش کے بعد تو کسی پرورش گاہ کنڈرگارٹن کے حوالہ کیا جاسکتا ہے، مگر پیدائش کے پہلے تو بہرحال اسے بطن مادر ہی میں رہنا ہے، ابھی تک کوئی ایسی ایجاد سامنے نہیں آئی ہے کہ بچہ کو بطن مادر میں جانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے، پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پرورش گاہ میں کام ظاہر ہے کہ مرد تو کرتے نہیں عورتیں ہی کرتی ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں کام کرنے والی ساری عورتیں خود پیدائش کی صلاحیت سے محروم ہوچکی ہوں گی، یا وہ سب بے شوہر کی ہوں گی، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، تو اس سے آسانی سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش کے ساتھ دوسرے بچوں کی پرورش بہرحال عورت ہی کرے گی، خواہ وہ ماں بن کر کرے یا انا

اور نرس بن کر کرے، اگر ایسا ہے تو ہمیں سوچنا ہے کہ بچہ کی صحیح تربیت ماں کی گود اور گھر کے ماحول میں ہوگی، یا کنڈر گارٹن میں، بچہ کی پرورش کا مسئلہ ایک دوسرے سوال سے جڑا ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ خاندانی نظام باقی رکھنا انسانی معاشرہ کے لیے مفید ہے، یا ختم کر دینا؟ مغرب کا خاندانی نظام چونکہ درہم برہم ہو چکا ہے اور انھوں نے اسے اپنے لیے مفید سمجھا ہے، اور ان کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ وہ بچہ کو ماں کی ماتا اور باپ کی محبت اور رشتہ کو کوئی اہمیت نہ دیں، مشرق میں بھی اس کے کچھ اثرات پڑنے شروع ہوئے ہیں، مگر ابھی یہاں خاندانی نظام بالکلیہ پاش پاش نہیں ہوا ہے، اس لیے ان کے لیے ایسا ممکن نہیں ہے کہ رشتہ و ناطہ، اور مہر و مروت کی جو قدریں انسانی معاشرہ کے لیے مطلوب ہیں وہ اسے یکسر ختم کر دیں، اسلام نے جو معاشرتی نظام انسان کو دیا ہے، اس میں بھی خاندانی نظام کو بنیادی اہمیت دی ہے، یہ خاندانی نظام جتنا پاکیزہ اور مہر و محبت کے رشتوں میں جڑا ہوگا اتنا ہی زیادہ معاشرہ اور اس معاشرہ سے پیدا ہونے والا تمدن پاکیزہ اور پرکشش ہوگا، آگے ہم امریکی معاشرہ کے بارہ میں نفسیات کی ایک ماہر خاتون کا بیان نقل کریں گے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے جو دائرہ مرد اور عورت کے لیے مقرر کیا تھا، اب مغرب بھی اس کی طرف پلٹنے لگا ہے۔

"عورت کے مسئلہ میں اگر آپ سنجیدگی سے غور کریں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عورت کی ذمہ داریاں دو طرح کی ہیں، ایک اس کی فطری جنسی ذمہ داریاں، دوسرے اس کی فطری ذمہ داریوں کو معاشرہ کے لیے مفید بنانا، اس کی فطری ذمہ داریوں سے مراد یہ ہے کہ عورت کو خدا نے افزائش نسل کا ذریعہ بنایا ہے، عورت اس ذمہ داری کو جتنے بہتر طریقہ سے ادا کرے گی ویسے ہی معاشرہ میں اچھے اور کارآمد افراد پیدا ہوں گے، اس کی یہ ایسی ذمہ داری ہے جسے کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا، افزائش نسل کے لیے اگر کوئی غیر فطری طریقہ اختیار کیا جائے تو سارے انسان نہ تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور نہ اس کے وہ مفید نتائج سامنے آسکتے ہیں جو فطری طریقہ سے حاصل ہوتے ہیں، اور جس سے ہر امیر و غریب یکساں فائدہ اٹھاتا اور اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔"

ان باتوں کے ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ مرد و عورت اپنی جسمانی ساخت یا ذہنی ارتقاء اور فطری افتادِ طبع کے اعتبار سے برابر ہیں، یا ان میں کوئی فرق ہے، یہ موضوع بہت وسیع ہے، جسے ہم کسی دوسرے موقع سے پیش کریں گے، اس وقت ہم صرف دو ایک اقتباس مغربی علماء کی کتابوں سے پیش کرتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"مرد اور عورت میں بعض جسمانی ترکیب و ساخت کے لحاظ سے اختلافات اگرچہ جزوی اختلاف نظر آتا ہے، لیکن [illegible] اختلاف [illegible] ہے مثلاً عورت کے اور تمام اعضاء سے بے شک مرد کے اعضاء سے [illegible]"

الگزس کیرل [illegible] مرد و عورت کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان [illegible] کو (جو عورت و مرد کے طبعی فرق پر دلالت کرتے ہیں) نظر انداز کر دینے کی وجہ سے آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں، حالانکہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلاف پائے جاتے ہیں، عورت کے جسم کے ہر خلیہ پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرتسم ہوتے ہیں، یہی بات اس کے اعضاء کے بارے میں بھی صحیح ہے اور بالخصوص نظامِ عصبی کے متعلق عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تشکیل کرنی چاہیے، بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں، تہذیب کے تحفظ اور ارتقاء میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کا زیادہ حصہ ہے، اس لیے انھیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے۔"

(عورت اسلامی معاشرہ میں ص ۳۷)

موجودہ دور کے مشہور فلسفی پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دور عام طور پر دہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔ قدیم تاریخ میں پانچویں صدی مسیح کا یونان ترقی کے معراج پر پہونچا ہوا تھا، لیکن اس دور میں عورت گھر کی زینت تھی، مگر سکندر کے بعد جس زمانہ میں شہری ریاستیں روبہ زوال تھیں اس وقت بھی ایک ایسی ہی آزادیٔ نسواں تحریک شروع ہوئی تھی جیسی آج ہمارے زمانہ میں پائی جاتی ہے۔" (ایضاً، ص ۴۷)

ہم نے ان جدید مفکرین کے خیالات اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ روشن خیال حضرات اس پہلو سے غور کر سکیں کہ اسلام نے مرد اور عورت کے لیے جو دائرۂ کار مقرر کیا ہے اور ان کے جو حقوق و فرائض مقرر کیے ہیں وہ عورت اور مرد کے فطرت کے عین مطابق ہیں، اور جب ان کی اس فطرت سے ان کو ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے، مسٹر ٹائن بی کے قول کے مطابق انسانی معاشرہ اور تمدن کو اس سے نقصان پہونچا ہے، اور ظاہری چمک دمک کے باوجود زوال پذیر ہوا ہے، مغرب دو صدی کے تجربہ کے بعد اسی لیے پھر ماضی کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کا اندازہ ایک

امریکی خاتون جون رینخ کے بیان سے ہوگا جو نفسیات اور جنسیات کی بڑی ماہر سمجھی جاتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ:

"امریکی سوسائٹی سیاسی، اقتصادی اور جنسی لحاظ سے اب بہت تیزی سے ماضی کی روایات کی طرف لوٹ رہی ہے جس سے عورت کی آزادی بہت محدود ہوتی جارہی ہے، مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن اب دور نہیں جب امریکی عورت اپنی قدیم روایات کے مطابق گھر کی چار دیواری میں بند ہوکر خود کو بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں تک محدود کرلے گی"

مسز رینخ نے اس احساس کا اظہار جنسیات کے موضوع پر منعقدہ ساتویں عالمی کانفرنس میں کیا جو پچھلے ہفتے نئی دہلی میں ہوئی تھی، مسز رینخ کہتی ہیں کہ امریکہ میں جنسی آزادی اب محدود سے محدود ہوتی جارہی ہے۔

(سہ روزہ دعوت، ۱۳ نومبر ۱۹۸۵ء)

(۴) اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی دو گواہی کو مرد کی ایک گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے اس سے عورت کی حیثیت کم تر ہوجاتی ہے، اوپر کی تفصیلات سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مرد اور عورت کے درمیان اللہ تعالیٰ نے جو صنفی فرق رکھا ہے، اس کی بنا پر اجتماعی معاملات اور نظم و انتظام میں ناگزیر صورتوں کو چھوڑ کر عورتوں کو موجودہ مغربی تہذیب کے دلدادوں نے بھی کم ہی دخیل کیا ہے فطری طور پر عورت کی عمومی ذہنی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ گواہی شہادت کی ذمہ داریوں کو وہ پورے طور پر نباہ نہیں سکتی، اس میں کچھ مستثنیات ہوسکتی ہیں، مگر عمومی طور پر ان کے اندر احساس ذمہ داری کی کمی اور طبیعت میں جذباتیت اور بات صاف نہ کرنے کی عادت ہوتی ہے اور یہ چیزیں گواہی و شہادت میں حارج ہوتی ہیں، پھر اسلام نے عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے ایسے تمام مواقع سے اسے دور رکھا ہے جس سے اس صنف نازک کا دامن عفت و عصمت داغدار ہوسکے، ظاہر ہے کہ شہادت دینے کے لیے عورت جائے گی تو اسے مردوں سے اختلاط کا سامنا کرنا ہوگا، پھر عدالت کی حاضری اور پھر اس کی طرف سے جو جرح ہوگی، احساس ذمہ داری کی فطری کمی اس کی زبان سے بہت سی خلاف واقعہ باتیں نکلوا سکتی ہے، اس لیے اس کمی کو ممکن ہے کہ دوسری عورت پوری کردے، یہ ایک بالکل فطری اور تجرباتی اصول قرآن پاک نے بیان کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ غیر اسلامی عدالتوں میں بھی عورتوں کو گواہی میں پیش کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، آخر اس کا سبب کیا ہے، یہ باتیں تو اس اعتراض کے جواب میں کہی گئی ہیں، ورنہ وہ معاملات جن کا تعلق خالص عورتوں کے مسائل سے ہے، اس میں ایک عورت کی بھی شہادت کافی ہوجاتی ہے، ہدایہ میں ہے:

ویقبل فی الولادۃ والبکارۃ والعیوب — ولادت، بکارت، اور عورتوں کے ان عیوب کے

بالنساء في موضع لا يطلع عليه الرجال شهادة امرأة واحدة	سلسلہ میں جن سے عام طور پر مرد واقف نہیں ہیں، ایک عورت کی گواہی بھی قبول کر لی جائے گی ۔
([illegible])	

فقہائے احناف نے یہ اصول اس حدیث نبوی کی بنا پر بنایا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ جن امور پر مرد مطلع نہ ہو پائیں ان میں عورتوں کی گواہی جائز ہے، ابن شہاب زہری کے اس اثر سے اس کی تائید ہوتی ہے جسے صاحب مصنف عبدالرزاق نے نقل کیا ہے :

مضت السنۃ تجوز شہادات النساء فیما لا یطلع علیہ غیرھن او من ولادات النساء وعیوبھن۔	سنت یہ رہی ہے کہ ولادت اور عورتوں کے وہ عیوب جن سے عام طور پر مرد واقف نہیں ہوتے، ان کی تنہا شہادت جائز ہے۔
(ھدایہ)	

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان کچھ فطری فرق قدرت نے رکھ چھوڑے ہیں، ان ہی کے اعتبار سے اجتماعی معاملات میں اسلام نے اس کا دائرۂ کار متعین کیا ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کہ عورت کوئی کمتر مخلوق ہے، عام معاملات میں اس کی تنہا گواہی شہادت تسلیم نہیں کی گئی ہے، مگر اپنے دائرۂ کار میں وہ تنہا بھی شاہد بن سکتی ہے، جیساکہ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں، مگر یہاں یہ بات بھی عرض کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے کہ یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جن کے یہاں کسی حال میں عورت کی گواہی صحیح نہیں ہے، "منوسمرتی میں ہے کہ ایک بھی نرلوبھی (جسے لالچ نہ ہو) پرش ساکھی (گواہ) ہو سکتا ہے، لیکن بہت سی عورتیں پاکباز ہونے پر بھی ساکھی نہیں ہو سکتیں، کیونکہ عورتوں کی عقل چنچل ہوتی ہے" (اشلوک ۷۷ ...۸) اس اشلوک کی روشنی میں اسلام کی معتدل تعلیم جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے،

(۵) اسلامی شریعت پر ایک اعتراض چار شادیوں کی اجازت کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے، یہ بہت پرانا اعتراض ہے، اور اس کے مدلل جوابات بارہا دیے جا چکے ہیں، یہ اعتراض بھی اسی نظریۂ مساوات کا پیدا وار ہے، اور یہ اعتراض وہی لوگ زیادہ کرتے ہیں، جو انسانوں کو جانوروں کی طرح جنسی انارکی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، ورنہ معاشرہ کو جنسی آوارگی سے پاک رکھنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو اخلاقی حدود کے اندر خواہش نفس کی تکمیل کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ ہر ہرے بھرے کھیت میں منھ نہ مار سکیں، چار شادی کی اجازت

اسی جنسی آوارگی کو روکنے کی ایک اخلاقی تدبیر ہے، لیکن یہ اجازت بے قید نہیں بلکہ اس میں بیویوں کے ساتھ عدل وانصاف کی اخلاقی قید لگی ہوئی ہے، اس لیے اس آزادی میں بھی مرد اخلاقی حدود کا پابند رہتا ہے، اور جہاں یہ آزادی نہیں ہے، وہاں جنسی آوارگی کی وجہ سے پانچ فیصد عورتوں کی عفت وعصمت بھی محفوظ نہیں ہے، آپ ان ملکوں کے جنسی جرائم کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو جائز حدود میں چار شادیوں کی اجازت معاشرہ کے لیے ایک رحمت معلوم ہوگی۔

(۶) مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں اس شبہہ کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ اگر مسلمانوں کا پرسنل لا بالکل جدا رکھا گیا تو اس سے علٰحدگی پسندی کے جذبات کو شہ ملے گی اور قومی یکجہتی کو نقصان پہونچے گا، یہ شبہہ اس ذہنی تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس نے اس سے پہلے بھی ملک کو نقصان پہونچایا، اور آج بھی نقصان پہونچا رہی ہے، ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ جن صوبوں اور علاقوں میں ہندی کے علاوہ دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں، وہاں ہندی بولنے والے صوبوں سے کیوں تعصب پایا جاتا ہے، بلکہ وہ بسا اوقات علٰحدگی پسندی کی بات بھی کرنے لگتے ہیں، آخر ان کا کون سے پرسنل لا کا مسئلہ ہے۔

یہ حقیقت تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ اس ملک میں درجنوں زبانیں بولی جاتی ہیں، اور یہاں کے باشندے نصف درجن سے زیادہ مذہبوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور تہذیب وغیرہ کے لحاظ سے بھی نہ جانے کتنے طبقے اور گروہ موجود ہیں، اور یہ کسی ملک کا عیب نہیں، بلکہ خوبی ہے، اس لیے ان مختلف زبان، تہذیب اور مذہب رکھنے والوں میں یکجہتی اس طرح پیدا نہیں ہوسکتی کہ سب کو ایک زبان بولنے پر مجبور کر دیا جائے، یا ان پر ایک مذہب اور ایک تہذیب مسلط کر دی جائے، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر گروہ کو ان کی زبان، ان کی تہذیب اور مذہب کے سلسلہ میں پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں، اس سے ہر طبقہ مطمئن بھی رہے گا اور اسے ملک سے محبت بھی رہے گی، اور کسی زبان یا طبقہ سے اس کے اندر نفرت یا انتقامی جذبہ پیدا نہیں ہوگا، اس کے برخلاف اگر اس پر کوئی زبان یا تہذیب یا مذہب لادنے کی کوشش کی گئی تو اس سے نہ صرف بے اطمینانی کی فضا پیدا ہوگی بلکہ یہ چیز نفرت اور تشدد کو جنم دے گی، جیسا کہ پنجاب، آسام وغیرہ کے واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ قومی یکجہتی ظاہری ہم آہنگی سے نہیں پیدا ہوگی، بلکہ اس کے لیے ایک بڑی ذہنی تبدیلی کی ضرورت ہے

ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس ملک میں دو تین ہزار سال پہلے آئے، اس لیے وہ بھارت ماتا کے حقیقی سپوت ہیں، اور دوسرے لوگ جو بعد میں آئے وہ سوتیلے ہیں، جب تک یہ ذہنیت نہیں

بڑے بھی اس وقت تک ذہن کچھ پیدا ہونا ممکن ہے اتفاق سے ہندو مذہب ماننے والے اکثریت میں ہیں، اس لیے وہ اس حیثیت سے بھی اپنا حق زیادہ سمجھتے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی فرقہ کے امتیازات ختم کر کے ان کے اوپر اپنی زبان اور تہذیب مسلط کرنے کی آپ کی اس دنیا میں کتنے جمہوری ملک ہیں جہاں کئی کئی زبانیں سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہیں اور ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کے پورے مواقع موجود ہیں۔

(۷) اس سلسلہ میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ سیکولرزم کا تقاضا ہے کہ سارے باشندگان ملک کا یکساں سول کوڈ ہو، میرے خیال میں جو لوگ سیکولرزم کی یہ تعبیر کرتے ہیں وہ یا تو سیکولرزم کو سمجھتے نہیں، یا دانستہ طور پر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں، سیکولر کا مفہوم اتنا ہوتا ہے کہ حکومت کا خود کوئی مذہب نہیں ہوگا، اور مذہب کے معاملہ میں اس کا طرز عمل مساویانہ ہوگا، اور دنیا میں دوسرے جتنے سیکولر ملک ہیں سب کے یہاں اس کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے تھائی لینڈ برما، یونان، ایتھوپیا، گھانا وغیرہ سیکولر ملک ہیں، ان میں ہر جگہ مسلم پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی ہے، سیکولرزم کا مفہوم یکسانیت پیدا کرنا نہیں ہے۔

ہمارے کچھ مسلمان دانشور اور کچھ غیر مسلم حضرات مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کی اہمیت گھٹانے کیلئے کچھ مسلم ممالک کی مثالیں پیش کرتے ہیں، کہ وہاں خود مسلمان حکمرانوں نے اپنے پرسنل لا کو ختم کر دیا ہے، یا اس میں ترمیم کر دی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات تو یہ ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ اگر کوئی اسلامی ملک یا کئی اسلامی ممالک اس طرح کا فیصلہ کر دیں تو بھی اس سے یہ بات کہاں سے نکل گئی کہ ان کو اس کا حق تھا، یہاں ہم بات حکومت یا افراد کی نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہم بات شریعت کی کر رہے ہیں، اگر کسی ملک کے مسلمان کسی شرعی حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے عمل کرنے والے مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔

اس وقت مسلمانوں کے تقریباً ۳۸۔ ۳۹ ملک ایسے ہیں جہاں ان کی حکومت ہے، ان میں ترکی اور البانیہ (جن کی ہم ہمیشہ مذمت کرتے رہتے ہیں) کے علاوہ ایک بھی مسلم ملک میں پرسنل لا کو ختم نہیں کیا گیا ہے، حتیٰ کہ اسرائیل میں بھی مسلم پرسنل لا کو ختم نہیں کیا گیا ہے، سعودی عرب، مصر، شام، سوڈان، نائیجیریا، کویت، متحدہ امارات کی سات ریاستیں ابوظبی، شارقہ، راس الخیمہ وغیرہ، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، مالدیپ، ان میں سے کسی ملک میں مسلم پرسنل لا ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی شریعت نافذ ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ کہیں فقہ حنفی کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں، کہیں مالکی فقہ، کہیں شافعی فقہ اور کہیں حنبلی فقہ اور کہیں زیدی فقہ اور کہیں شیعہ فقہ رائج ہے۔

آخر میں یہ بات عرض کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے جب پورے عالم اسلام میں

کئی صدیوں سے ہر طرف سیاہ کاری کا سناٹا چھایا ہوا تھا، مگر فتنہ و فساد کے باوجود اس دور میں بھی قرآن و سنت کی جتنی خدمت ہندوستان کے علماء نے کی ہے اس کی مثال پورا عالم اسلام پیش نہیں کر سکتا، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نویں صدی ہجری کے بعد سے اب تک علم دین کا جتنا کام ہندوستان میں ہوا وہ دوسری جگہ نہیں ہوا، ادھر عالم اسلام میں ایک علمی و دینی بیداری پیدا ہوتی ہے اور بہت سی قیمتی علمی، تحقیقی اور دینی کام سامنے آ رہے ہیں، مگر اس وقت جو ذرائع اور وسائل اسلامی ملکوں کے اہل علم کو حاصل ہیں، ہندوستان کے علماء اس سے ہمیشہ محروم رہے ہیں، اور آج بھی ہیں، مگر اس کے باوجود بحمد اللہ ہندوستان کے علماء اور اہل علم اب بھی علم و تحقیق میں کسی اسلامی ملک سے پیچھے نہیں ہیں۔

یہ تو علمی پہلو تھا، عملی اعتبار سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گذرا ہے جس میں دعوت و عزیمت و احیائے دین کا کام یہاں نہ ہوتا رہا ہو، اور توحید و رسالت کا صاف ستھرا تصور یہاں کے مسلمانوں کے سامنے نہ پیش کیا گیا ہو، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے تو یہ کام پورے تسلسل کے ساتھ ایک اجتماعی پیمانہ پر ہو رہا ہے، مگر اس سے پہلے ہمارے علماء و صلحاء نے انفرادی طور پر مسلمانوں کی عملی زندگی میں دین کو نافذ کرنے کی جو کچھ کوششیں کیں، وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ان ہی کوششوں کا اثر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق کتاب و سنت کے اصلی سرچشمہ سے برابر قائم رہا اس سے نہ صرف ان کا مزاج دینی رہا بلکہ ان کی عملی زندگی میں اس کی تابندگی برابر قائم رہی، اور اس کی روشنی عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھی پہونچتی رہی، اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہم دین میں کسی عرب یا غیر عرب ملک، یا اسلامی ملک کے زلہ بردار اور طفیلی نہیں ہیں، بلکہ کتاب و سنت کے چشمۂ صافی سے براہ راست ہم نے جرعہ کشی کی ہے، ہم کو کسی اسلامی ملک کی مثال دے کر مرعوب نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہم کو کسی اسلامی ملک کی پیروی کی ضرورت ہے، بلکہ خدائے قدوس کی اس نعمت پر اس کا ہزار بار شکر ادا کرتے ہیں کہ علمی اور عملی دونوں میدانوں میں خاص طور پر دعوت و تبلیغ کے میدان میں ہندوستان کا مسلمان اپنی تمام پریشانیوں کے باوجود ساری دنیا کی راہ نمائی کر رہا ہے، اسی طرح علم دین کی تعلیم و ترویج پر یہاں کا غریب مسلمان اپنی گاڑھی کمائی کا جتنا پیسہ خرچ کر رہا ہے کوئی مسلمان ملک اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا، صرف ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے عربی مدارس اور دینی مکاتب پر سالانہ ایک کروڑ سے زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے، اس لیے دین کے معاملہ میں ہم کو کسی ملک یا افراد کی مثال دے کر مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی جائے ہمارے لیے شریعت نے یہ اصول دیا ہے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں)۔

فقہی اختلافات کی حقیقت

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی (پاکستان)

"الفقہ" جو ہمارے یہاں ایک مقدس فن کے طور پر معروف ہے اس کا لغت میں معنی "کسی شئ کو جاننا اور سمجھنا ہے"، اور اہل لغت نے احکام شرعیہ کا علم ادلۂ تفصیلیہ کے ساتھ "نیز" حذاقت وزیرکی بھی اس کا معنی بیان کیا ہے[1] فقیہ جس کی جمع فقہاء آتی ہے، اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے اللہ رب العزت دینی احکامات سے متعلق حذاقت وزیرکی عطا فرما دے سورہ توبہ کی آیت ۱۲۲ میں فقہ وتفقہ کی فضیلت اس طرح بیان کی گئی۔

"اور مومنوں کو یہ مناسب نہ تھا کہ وہ سب ہی کوچ کر لیتے، سو کیوں نہ کوچ کیا ان میں ہر فرقہ سے ایک طائفہ اور گروہ نے تاکہ وہ دین میں تفقہ پیدا کر لیں اور اپنی قوم کو ڈرائیں۔ جب وہ ان کی طرف لوٹیں تاکہ وہ بچ جائیں"۔

اس کے بالمقابل کافروں کی قباحت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا: "بے شک وہ ایسی قوم ہے جو سمجھتی نہیں ہے[2]"۔

فقہ سے تہی دست اور فقاہت سے محروم لوگوں کے متعلق ہے "سو کیا ہو چکا ہے اس قوم کو جو بات سمجھنے کے قریب نہیں لگتی[3]"۔

احادیث میں غور کریں تو بہت سی روایات اس حوالہ سے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔

"جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو دین کی سمجھ اور فقاہت

---

[1] مصباح اللغات ۶۴۲، [2] الانفال: ۶۵، [3] النساء: ۷۸

عطا فرما دیتا ہے بخاری[1] اور اس سے ملتے جلتے الفاظ مسلم[2] اور دارمی مطبوعہ شام میں بھی ہیں۔"
بالکل انہی الفاظ کے ساتھ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسند دارمی[4] میں منقول ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اس حدیث میں واضح طور پر علماء کی فضیلت باقی تمام طبقات افراد پر اور تفقہ فی الدین کی فضیلت تمام علوم پر بیان کی گئی ہے۔[5]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

جو ان میں سے جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر رہیں گے بشرطیکہ وہ فقہ سے موصوف ومتصف ہو جائیں۔[6]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح[7] میں اور امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح[8] میں ایک روایت نقل کی جس میں حضور نبی کریم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے جو علم و ہدایت دیکر مجھے دنیا میں بھیجا اس کی مثال زور دار بارش کی ہے آگے اس بارش سے زمین کس طرح سیراب ہوئی اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کیسے فائدہ اٹھاتی ہے اس کے لیے تین باتوں کا ذکر فرمایا بعض قطعات ارضی تو ایسے ہیں جو پانی جذب کرتے ہیں اور پھر ان سے انواع واقسام کی سبزیاں اور اناج وغیرہ اگتے ہیں بعض حصے ایسے ہیں۔ جن کی سختی کے سبب پانی جذب نہیں ہوتا ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض حصے ایسے ہیں جو بالکل چٹیل ہیں نہ ان میں پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے نہ روکنے کی۔ اس کے بعد ارشاد نبوی ہے۔

"پس یہ مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں فقاہت حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس چیز سے نفع عطا فرمایا جو چیز دے کر اللہ تعالیٰ نے

---

[1] بخاری ۱۶ ج ۱، [2] مسلم ۳۳۳ ج ۱، [3] دارمی ۷۳ ج ۱، [4] مسند دارمی ۷۹ ج ۲، [5] فتح الباری ۱۳۴ ج ۱

[6] بخاری ۴۷۴ ج ۱، مسلم ۲۰۷ ج ۲، [7] صحیح، [8] صحیح:

مجھے بھیجا ہے، اس نے اس کو سیکھا اور سکھلایا اور مثال ہے اس کی جس نے ہدایت خداوندی کی طرف جس کو میں لے کر آیا ہوں مطلق سر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں "

اس حدیث میں چٹیل زمین سے واضح طور پر مراد وہ عام لوگ ہیں جن کو نہ محدث ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور نہ ہی فقیہ ہونے کا شرف۔ دوسری مثال اس زمین کی ہے جس نے پانی جمع کر لیا اس سے مراد محدثین کرام ہیں جنہوں نے جناب رسالت مآب علیہ السلام کے ارشادات و فرامین کو محفوظ رکھا اور ان کی خوب خوب حفاظت کی۔

جبکہ پہلی مثال ان حضرات کی ہے جنہیں "فقیہ" کہا جاتا ہے جن کے قلوب کی زمین کو "طائفۃ طیبۃ" کہا گیا، انہوں نے اپنے سینوں اور قلوب میں وحی الٰہی اور فرامین رسالت کی موسلا دھار بارش کو جا کیا اور پھر اس سے ہر نوع کی سبزیات، اناج اور پھل وپھول پیدا ہوتے یعنی مسائل واحکامات کا وسیع ذخیرہ سامنے آیا جس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی ضروریات پوری ہوتیں۔

یہ بات کہ فقہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ عجیب سی بات ہے، اور ایسا سوال وہی کر سکتے ہیں جو عقل و دانش سے بے بہرہ ہیں۔ علامہ ابن خلدونؒ نے بالکل سچ کہا۔

والوقائع المتجددۃ لا توفی بہا النصوص [1]

کہ نئے نئے پیش آمدہ مسائل جن سے روزمرہ پالا اور واسطہ پڑتا ہے ان کے لیے نصوص صریحہ ناکافی ہیں اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے اس ارشاد نبوی میں جس کا تعلق حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفر سے ہے کہ حضور علیہ السلام نے انہیں بطور قاضی وہاں بھیجتے ہوئے پوچھا کہ لوگوں کے مسائل کا حل کیونکر کرو گے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ذریعہ، سوال تھا کہ وہاں سے بات نہ بنی تو؟ عرض گزار ہوئے آپ کی ارشادات سے رہنمائی حاصل کروں گا، پھر رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر کیا ہوگا؟ عرض کیا کہ اپنی رائے اور عقل و دانش سے کوشش وسعی کرونگا۔۔۔ اس پر نبی کریم علیہ السلام کی مسرت وخوشی دیدنی تھی، ارشاد ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر کہ اس نے اپنے رسول کے رسول (حضرت معاذ رضی اللہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۴ مطبوعہ مصر

تعالیٰ عنہ کو صحیح بات کی توفیق دی۔

نبوت کی بصیرت محسوس کر رہی تھی کہ ضروریات زمانہ اس موڑ پر لوگوں کو لائیں گی، اور اسی طرف اشارہ کیا علامہ ابن خلدون نے، اور وہ حدیث میں خوشی و مسرت اور دعا کے انداز میں فرمایا گیا۔

"اس بندہ کو اللہ تعالیٰ خوش و خرم رکھے جس نے میری بات سنی اور یاد کی پھر انہیں سنائی جنہوں نے مجھ سے براہِ راست نہ سنی — کیوں؟ — بسا اوقات ایک حاملِ فقہ تو ہوتا ہے لیکن فقیہ نہیں ہوتا اور یوں بھی ہوتا ہے کہ حاملِ فقہ فقیہ ہے لیکن اعلیٰ درجہ کا نہیں، اس ذریعہ سے بات اس تک پہنچ جائے گی جو اس فن میں اس سے ارفع اور اعلیٰ ہوگا۔" [1]

اسی سبب سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو! تَفَقَّهُوا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوا کہ سردار بننے سے پہلے تفقہ حاصل کرو[2] اس علم و فن یعنی "فقہ" کی اس اہمیت کا اعتراف ہر کسی نے کیا ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے محدث فقہا کو "اعلم بمعانی الحدیث" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں[3] تو محدث سلیمان بن مہران الاعمش رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

اے گروہِ فقہاء تم طبیب ہو تو ہم پنساری[4] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حدیث کی معرفت اور اس میں تفقہ پیدا کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے اس کی نسبت کہ محض حدیث کے الفاظ یاد کروں[5] .... اور امام ولی اللہ الدہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن و حدیث کے بعد مدارِ اسلام فقہ کو قرار دیتے ہیں[6] نواب صدیق حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں کہتے ہیں[7]

حفظِ حدیث کا درجہ اور ہے۔ اور ملکہ علمیہ کا مقام اور امام ابو الحسن منصور بن اسمٰعیل الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو عجیب ہی بات ایک عربی رباعی کی شکل میں کہی

عاب التفقہ قوم لا عقول لھم   وما علیہ اذا عابوہ من ضرر

---

[1] مسند دارمی ۷۵، [2] بخاری: ۱۷، [3] ترمذی ۱۱۸، [4] جامع بیان العلم ۱۳۱، [5] منہاج السنۃ ۱۱۵ ج ۴ [6] قرۃ العینین ۱۷، [7] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، مطبوعہ لاہور۔

ما ضر شمس الضحی وھی طالعة ان لا یری ضوءھا من لیس ذا بصر

کہ فقہ حاصل کرنے کو ان لوگوں نے معیوب قرار دیا جو عقل سے محروم ہیں اور ایسے لوگوں کے علم فقہ پر عیب لگانے سے کوئی ضرر نہیں (کیونکہ) اگر کوئی نابینا آفتاب کو جو...... طلوع ہو چکا ہے نہیں دیکھتا تو اس سے آفتاب کی روشنی کو کیا نقصان پہنچتا ہے، ایک زمانہ میں " فقہ " سے مراد " علم الآخرة ومعرفة دقائق آفات النفوس والاطلاع علی الآخرة وحقارة الدنیا " ہوتا تھا اور " فقیہ " زاہد " کو کہا جاتا تھا۔

الزاہد فی الدنیا الراغب فی الآخرة[2] لیکن بعد میں یہ اس " علم شریفہ " کے لئے مخصوص ہو گیا جس میں مسائل واحکام کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے[3] اشباہ والنظائر میں بالکل صحیح لکھا ہے:

الفقہ معقول من منقول فقہ ایک عقلی علم ہے جو منقول (قرآن وسنت) سے حاصل کیا گیا ہے ابن نجیم مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں

واقف ہونا، اطلاع پانا لغت پر فقہ کا معنی ہے اور شریعت میں خاص قسم کی واقفیت کا نام فقہ ہے، یعنی نصوص شرعیہ کے معانی سے، ان کے اشاروں سے جن چیزوں پر وہ دلالت کریں ان سے اور ان کے مضمرات سے اور جو کچھ ان کا مقتضیٰ ہو ان سب سے واقف ہونے کا نام فقہ ہے،[4]

تمام مختلف الانواع تعریفات سے جامع تعریف وہ ہے جسے ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی صفحہ پر ان الفاظ سے نقل کیا۔

معرفة النفس ما لها وما علیها کہ آدمی یہ جان لے کہ اسے کن چیزوں سے نفع پہنچ سکتا ہے کن سے ضرر، اور کہتے ہیں کہ عرفہ الامام، کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی تعریف کی اور یہ قدیم ترین تعریف ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے ایک قلمی رسالہ بعنوان " تدوین فقہ " میں اسی تعریف

---

[1] طبقات سبکی ۱۲۱ ج ۲ [2] کشاف اصطلاحات الفنون للتھانوی ج ۱ ص ۲۱ [3] الاشباہ والنظائر ص ۵ [4] بحر الرائق مصری ج ۱ ص ۶

کو قدیم ترین اور جامع ترین قرار دیا اور قریب قریب ایسا ہی دعویٰ دائرۃ المعارف [1] میں ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو "محمصانی" کی "فلسفۃ التشریع الاسلامی" ملاحظہ فرمائیں۔

اس فن شریف کی بنیاد نصوص شرعیہ ہیں۔ اہل علم نے نصوص شرعیہ میں سے قرآن کی آیات تک گن ڈالیں جن سے مسائل فقہ مستنبط ہوتے ہیں امام غزالی قدس سرہٗ تو پانسو آیات کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ملا جیون رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفسیرات احمدی میں صفائی سے لکھا

جن آیات میں صراحت کے ساتھ احکام کا بیان ہے وہ ڈیڑھ صد ہیں اور گیلانیؒ ہی نے ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایسی احادیث کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ لکھی ہے [2]

ان المحصر فیھا المسائل مائۃ وخمسون [3]

ان آیات و احادیث کی روشنی میں جن لوگوں نے اتنا بڑا ذخیرۂ علمی فراہم کر کے انسانیت کی ضرورتوں کو پورا کیا ان کے محسن ہونے میں کیا شبہ؟ ایسے بہت تھے لیکن جنہیں قبول عام کا شرف حاصل ہوا وہ معروف معنوں میں ۴ ہیں، امام ابو حنیفہ، امام مالکؒ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ، انہی کی نسبت سے فقہ حنفی، شافعی، مالکی، اور حنبلی معروف و مشہور ہیں بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی تو کہتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ غیبی امداد ہوئی کہ دین کے غیر بنیادی حصہ (ایک حصہ تو وہ ہے جو قرآن و سنت میں ۲+۲=۴ کی طرح صاف اور واضح ہے، ایک وہ جہاں استنباط کی ضرورت ہے یہاں یہی مراد ہے) کے متعلق اگرچہ ابتدا میں بیسیوں آراء اور مسلک پیدا ہو گئے تھے اور ہر ایک کا انتساب کسی نہ کسی مجتہد اور امام ہی کی طرف تھا لیکن بتدریج ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے یہاں تک آ پہنچی کہ آج مسلمانوں کی اکثریت غالبہ میں (یعنی اہل سنت) لے دے کے صرف چار مسلکوں کا رواج باقی رہ گیا ہے اور ان میں بھی اگر سچ پوچھیں تو حنابلہ کی تعداد اتنی اقلیت میں ہے کہ شاید یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اب اسلامی دنیا زیادہ تر صرف حنفیہ، مالکیہ، اور شافعیہ پر ہی مشتمل ہے [4] لیکن افسوس کہ بعض لوگوں نے اس اختلافی کیفیت کو جس نے

---

[1] دائرۃ المعارف: جامعہ پنجاب لاہور [2] تدوین فقہ، بحوالہ گیلانی: ص۔ ۱۱۰ . . . .

. : ۱۱ [4] تدوین فقہ قلمی: ص ۹۶

مسلمانوں کی ملی وحدت کو کبھی مجروح نہیں کیا۔ایسی ایسی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا کہ گویا یہ اختلاف شاید یہود ونصاریٰ جیسے اختلاف ہیں جو ایک دوسرے کے متعلق کہتے ہیں:

وقالت الیہود لیست النصاریٰ علیٰ شیء
وقالت النصاریٰ لیست الیہود علیٰ شیء[1]

کہ یہود عیسائیوں کو کہتے ہیں کہ ان کے پلے کچھ نہیں اور نصاریٰ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ لاشی محض ہیں اور حقیقت سے خالی۔ حالانکہ یہ چار فقہی مسالک یا بہ لفظ گیلانی "تین" ایسے نہیں ان کا آپس میں جو باہمی احترام اور تعلق ہے اس کا اندازہ واقعاتی طور پر ساری دنیا میں نظر آتا ہے، حنفی شافعیؒ کی اقتدا میں اور شافعی مالکی کی اقتدا میں برابر نماز پڑھ رہا ہے، ایک دوسرے سے لین دین، شادی بیاہ، ربط وضبط سب جاری ہے محض اس حوالہ سے جھگڑے کی کوئی بات نہیں — بلکہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ تو اور ہی نکتہ طرازی فرماتے ہیں، مولانا گیلانی جنہیں شیخ سے گہری مناسبت ہے لکھتے ہیں۔

شیخ محی الدینؒ ابن عربی نے اپنے طویل مضمون میں اختلافی مسائل کے متعلق یہ نقطہ پیدا کیا ہے کہ نسل انسانی میں جو سراپا محمد ستودہ صفات بنا کر پیدا کیا گیا تھا، ایسا ستودہ صفات کہ شاعر النبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا مشہور نعتیہ مصرعہ فانک قد خلقت کما تشاءُ (یعنی آپ اس طرح پیدا کئے گئے جیسا کہ آپ چاہتے تھے) شعر نہیں بلکہ واقعہ اور حقیقی واقعہ تھا، ظاہر ہے کہ جو ایسا ہو اس کے ہر فعل اور ہر فعل کے ہر پہلو کو ابد تک اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کے لئے اگر قدرت نے یہ کیا کہ کسی نہ کسی جماعت یا فرد کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اسی کو وہ اختیار کرے تو محبت کا اقتضا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ شیخ کا خیال ہے کہ جو نمازوں میں رفع الیدین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا اور اٹھتا ہے وہ اسی کے جلوے کو اللہ تعالےٰ کے سامنے پیش کر رہا ہے جیسے اللہ چاہتا ہے اور جو اس عمل کے بغیر اپنی نمازیں ادا کرتا ہے وہ بھی وہی کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کا محبوب کرتا تھا۔[2]

حضور اکرم علیہ السلام جنہوں نے فقہ وفقیہ کی بہت تعریف کی، سب سے بڑے فقیہ خود تھے علم ودانش حذاقت وزیرکی کا جو مقام آپ کو نصیب ہوا وہ اور کس کو نصیب نہیں ہوا، آپ آفاقی دین لے کر

---

[1] البقرہ: ۱۱۳ [2] تدوین فقہ: ۵ - ۹۴ ملخص

دنیا میں آئے جس نے مشرق و مغرب کے اندھیاروں میں اجالا کرنا تھا، اس بھری پڑی دنیا کے لوگ شہروں میں رہنے والے تھے تو دیہاتوں کے رہنے والے بھی، سمندروں کے کنارے بسنے والے تھے تو ان سے دور بھی، اللہ تعالٰی نے اپنے حبیب پاک علیہ السلام کے دامن سے جنہیں وابستہ کیا وہ ایک جگہ کے نہ تھے مختلف علاقوں کے تھے ان کے احوال شخصیہ مختلف تھے، ان کی استعدادیں مختلف تھیں" البینات "یعنی بنیادی حقائق کے معاملہ میں وہ سب یکساں اور متحد القول والعمل تھے لیکن "غیر بنیادی حصہ" میں "الدین یسر" اور "یسروا ولا تعسروا" کے تحت ایسی سہولتیں بن گئیں، اور صحابہ کے وقت سے ہی، تاکہ آنے والے دور میں امت کسی زحمت کا شکار نہ ہو۔

اختلافات فقہا اور فقہی اختلاف کا بڑا چرچا ہے، قدم قدم پر لڑنے والے اہل دانش غریب فقہا پر برستے ہیں اور خوب برستے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں کہ ان اختلافات فقہاء و مجتہدین کا بڑا حصہ تو دراصل ان کے اختلافات پر مبنی ہے جنہیں محبت و رفاقت نبوی حاصل تھی۔ یہ اختلافات نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئے، ابتدائی دور میں ہی ان کے متعلق سوال سامنے آیا، ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ تعالٰی عنہا کے حقیقی بھتیجے حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالٰی عنہم جو فقہائے سبعہ میں سے ایک ہیں، انہوں نے جواب دیا — "الموافقات" میں نقل ہے ترجمہ دیکھیں۔

نبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے صحابہ کے جو اختلافات ان کے اعمال میں تھے۔ اللہ تعالٰی نے ان سے یہ نفع پہنچایا کہ اہل اسلام میں سے جو صحابہ میں سے کسی صحابی کے طرز عمل کے مطابق عمل کرتا ہے اسے ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہ جو کر رہا ہے۔ وہ اپنے سے بہتر آدمی کے مطابق ہی کر رہا ہے۔

گویا اللہ تعالٰی نے ان اختلافات میں خیر کا یہ پہلو پیدا کر دیا، اسی سے حضور علیہ السلام کی اس حدیث کا بھی مفہوم سمجھ لیں جس میں آپ نے اپنے صحابہ کو آسمان ہدایت کے ستاروں سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ

ان میں سے جس کے پیچھے بھی چلوگے ہدایت کی راہ پالوگے

آخر ستارے تو سبھی ہیں، روشنی اور نور تو سب میں ہے، یہ نہ سہی وہ سہی، اس لئے بقول حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر:

ان اختلافات میں سے جسے بھی اختیار کرلو تو پھر چاہیئے کہ تمہارے دلوں میں کوئی کھٹکا نہ رہے۔ صحابی کی نظیر و اسوۃ موجود ہے تو پھر کھٹکا کس کا؟ پھر تو مطمئن ہو کر عمل کرو اور یقین کرو کہ تمہارے اس عمل میں جلوہ محمدی موجود ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالےٰ کو اہل اسلام نے خلفاء راشدین کی صف میں کھڑا کیا اور انہیں ان کے دور کے علماء نے نوازا "معلم العلماء" کے خطاب سے

یہ معلم العلماء فرماتے ہیں کہ۔

ما احب ان لم یختلفوا۔ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا تو مجھے یہ بات پسند نہ ہوتی۔

پھر فرمایا ما یسرنی ان لی باختلافہم حمر النعم۔ ان اختلافات سے مجھے اتنی خوشی ہے کہ سرخ اونٹوں سے اتنی نہ ہوتی۔

آخر وہ ان اختلافات پر اتنے خوش کیوں ہیں؟ اس کا جواب خود ہی ارشاد فرماتے ہیں لانہ لو کان قولا واحدا کان الناس فی ضیق ایک ہی فتویٰ ہوتا تو لوگ تنگی میں مبتلا ہو جاتے۔

اور سنن دارمی[۱] صفحہ ۸۰ میں ان ہی کا قول نقل ہے۔

"اگر صحابہ ایک ہی بات پر متفق ہو جاتے تو اس بات کا ترک سنت کا ترک ہوتا اور جب وہ مختلف ہو گئے تو ان میں سے جس کے قول پر بھی عمل ہوا گویا اس نے سنت اختیار کرلی۔"

جن کی نگاہوں میں وسعت نہ تھی انہوں نے انہی سے عرض کیا۔

"کاش آپ لوگوں کو کسی ایک ہی مسلک و موقف پر متحد کر دیتے[۲]"

لیکن اس وسیع المشرب خلیفہ اور معلم العلماء نے ممالک محروسہ کے ذمہ داروں کو لکھا" داری اٹھا کر دیکھ لیں۔

ہر ملک کے باشندے اس کے متعلق فیصلہ کریں جس پر وہاں کے فقہا کا اتفاق ہو

[۱] دارمی۔ [۲] ایضاً

اس لئے ان اختلافات کی اہمیت تھی اور بے پناہ اس میں لوگوں کے لیے وسعت آسانی اور سہولت کا سامان موجود تھا۔ اس اختلاف کا مقصد ہوا تے نفسانی نہ تھا کہ اس سے تو خرابی لازم آتی ہے حتی کہ اعتقادات تک متاثر ہوتے ہیں لیکن "غیر بیناتی" دنیا میں بھی اسکی اہمیت ہے" الشاطبی" نے انہی خلیفہ محترم کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے تمام شہروں کے ذمہ داروں کو لکھا

"اختلافات کا جسے علم نہیں وہ فقہ کی بو بھی نہیں سونگھ سکتا۔"

اور اسی "الشاطبی" نے جناب قتادہ جیسے عالم ربانی کی بات نقل کی "جس نے اختلاف نہیں سنے اسے عالم شمار نہ کرو" اب سنیں اس کی وجہ، اور وجہ بیان کر رہے ہیں ایوب سختیانی

"جسے علماء کے اختلافات کا زیادہ علم ہوگا وہ حکم لگانے میں جلدی نہ کرے گا۔"

کہ حکم لگا کر کسی کو کفر وفسق کی وادی میں دھکیل دینا بڑا آسان ہے لیکن مسلمان کے عقیدہ وایمان اور اس کی جہد عبادت کی حوصلہ افزائی بڑی مشکل ہے، اس فروعاتی دنیا میں اختلافات کی جو کثرت نظر آتی ہے ان کا فائدہ اسی طرح سامنے آتا ہے کہ نفاذ میں آسانی ہو جاتی ہے ورنہ تو جھٹ سے حکم لگے گا۔

ایوب سختیانی رحمہ اللہ کے استاذ ابن عیلیہ فرماتے ہیں۔

"فتوی میں جری وہی ہوگا جو اختلاف سے واقف نہیں۔" (باقی)

فرقۂ ملامتیہ

سعید نفیسی کی نظر میں

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

صوفیوں کے اُس گروہ کے بارے میں جو ملامتیہ کے نام سے معروف ہے، کوئی مستند مفصل اور ان کے افکار و نظریات کے ہر پہلو پر حاوی تصنیف اردو زبان میں نہیں ملتی، فارسی زبان میں بعض حضرات نے صوفیوں کے اس گروہ کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے، مگر وہ حضرات ان کے افکار و نظریات کی تعبیر و تشریح میں الجھ کر رہ گیے ہیں، اور اس بات کی نشاندہی سے قاصر رہے ہیں، کہ اس گروہ کی ابتدا کب ہوئی، کون لوگ اور کیوں ملامتیہ کے نام سے موسوم کیے گیے، اور اُن میں اور دوسرے صوفیوں میں کیا فرق و اختلاف ہے؟ سعید نفیسی نے البتہ اپنی کتاب "سرچشمۂ تصوف در ایران" میں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، درج ذیل سطور میں سعید نفیسی کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ جو لوگ تصوف سے علمی یا نظری تعلق رکھتے ہیں، وہ سعید نفیسی کی تائید یا تردید میں قلم اٹھائیں گے، اور صوفیوں کے اس گروہ کو اس کے اصل خدوخال میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے،

سعید نفیسی نے اپنی بات کا آغاز ملامتیوں کے دو مخصوص خصائص کے ذکر سے کیا ہے، انہوں نے ان دونوں خصائص کو ظاہر کرنے کے لیے جدید فارسی کے جو دو الفاظ منتخب کیے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ دلچسپ ہیں بلکہ ہم کو مزید دعوت غور و فکر بھی دیتے ہیں، ان صوفیوں کو انہوں نے تُند رَو (ultra progressive) انتہا پسند (Extremist) کا نام دیا ہے، اور بتلایا ہے کہ صوفیوں کا یہ گروہ خود کو "ملامتی" کہتا، سعید نفیسی نے یہ بھی اطلاع ہم پہونچائی ہے کہ ایرانی صوفیوں کے وہ دوسرے فرقے جو شریعت کے "ظواہر" کا

احترام کرتے، اور خوارق کے "بے پردہ" کرنے کو مناسب نہ سمجھتے، وہ ظاہری طور پر ملامتیوں سے بیزار رہتے، یہاں پر سعید نفیسی نے لفظ "ظاہر طور پر" استعمال کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے، کہ اصلاً تو اس فرقے سے دوسرے صوفیوں کو کوئی اختلاف نہ تھا، مگر چونکہ یہ لوگ حد سے زیادہ "ترقی پسند" اور "انتہا پسند" تھے، علاوہ بر ایں شریعت کے ظواہر کے بھی پابند نہ تھے، اس لیے عام ایرانی صوفی ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے، ورنہ بہ باطن عام ایرانی صوفیوں کو ملامتیوں سے کوئی اختلاف نہ تھا، یہ تاثر دینے کے بعد انھوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جس کو انہی کے الفاظ میں نقل کرنا ناگزیر ہے،

"اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ بعض بزرگان تصوّف نے "اصول دین" کی پابندی کو کبھی بے کار اور عبث سمجھا، اور ان میں سے بعض کی نفی کی، اور کبھی قابل ملامت بھی قرار دیا ہے[1]، ان بزرگان تصوّف نے نجات کا ارفع ترین راستہ کشف اور شہود کو سمجھا ہے"

(ص ۱۶۱)

اس کے بعد وہ وحدت الوجودیوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں، "ہر چہ ہست وجود اوست" (جو کچھ ہے اُن کا (خدا کا) وجود ہے) اور اس قول کی یہ توجیہ کرتے ہیں، کہ خیر ہو یا بدی جو کچھ بھی ہے اُسی (خدا) کا وجود ہے، اس لیے بد اپنی بدی پر قائم رہ سکتا ہے، اور لوگ بدی سے صرف نظر کر سکتے ہیں، سعید نفیسی کے قول کے مطابق اس نظریے کے بعض حامیین نے اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ "بد" کا وجود ہی سرے سے تسلیم نہ کریں، اور ہر چیز کو خیر قرار دیں، یہ لوگ اپنی اس کوشش میں اتنے آگے چلے گیے، کہ انھوں نے کفر و دین دونوں کو یکساں قرار دیدیا، اور دونوں ہی سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا، سعید نفیسی کے نزدیک فریدالدین عطار کی درج ذیل غزل اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہے،

ای ردی در کشیده بازار آمده	خلقی بدین طلسم گرفتار آمده
غیر تو هر چه هست سراب و نمایش ست	کین جا نه اندکست نه بسیار آمده
اینجا حلول کفر بود، اتحاد هم	کین وحدتیست لیک بتکرار آمده
ای ظاهر تو عاشق و معشوق باطنت	مطلوب را که دید طلب گار آمده

---

[1] ایسے بیانات دیتے وقت سعید نفیسی کو اپنا ماخذ درج کر دینا چاہیے تھا، مگر اس پوری کتاب میں ایک بھی حاشیہ نہیں ہے، جس سے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ سعید نفیسی نے زیر بحث بات کس کتاب سے لی ہے۔

بوی بجان ہر کہ رسیدست ازین حدیث   از کفر و دین ہر آئنہ بیزار آمدہ

بقول سعید نفیسی ان لوگوں (ملامتی یا وحدت الوجودی ؟) کے نزدیک نفس کی معرفت حاصل کرنا ہی سب کچھ ہے اور نفس کی معرفت کو ہی ان لوگوں نے رب شناسی کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ سعید نفیسی کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے یہ نتیجہ من عرف نفسہ عرف ربہ کے مشہور و معروف قول سے اخذ کیا ہے اور اس قول کو سترہویں صدی کے مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کے اس قول "میں سوچتا ہوں اس لئے میرا وجود ہے" کے مماثل قرار دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہی نکتہ صائب تبریزی کی اس غزل کا مرکزی خیال ہے جس کا مطلع یہ ہے:

در ہیچ پردہ نیست کہ نبود صدای تو   عالم پر است از تو خالی ست جای تو

عین القضاۃ ہمدانی کے درج ذیل اشعار میں بھی سعید نفیسی کو انہی جذبات کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

در بتکدہ تا خیال معشوقۂ ماست   رفتن بہ طواف خانہ از عقل خطاست

گر کعبہ از و بوی ندارد کنش است   با بوی وصال او کنش، کعبۂ ماست

مولانا روم کی درج ذیل غزل بھی سعید نفیسی کے نزدیک اسی خیال کی توسیع اور شرح کا کام انجام دیتی ہے:

ای قوم بہ حج رفتہ کجا یید کجا یید   معشوق ہم اینجاست، بیائید، بیائید

معشوق تو ہمسایۂ دیوار بہ دیوار   در بادیہ سرگشتہ شما در چہ ہوائید؟

گر صورت بی صورت معشوق ببینید   ہم خواجہ و ہم بندہ و ہم قبلہ شمائید

صد بار ازیں پردہ بدان خانہ برفتند   یک بار ازان خانہ بدین بام برائید

اسی طرح سعید نفیسی نے ابوالفتوح احمد غزالی اور حافظ کے بھی اشعار اپنی بات کی تائید میں پیش کئے ہیں جن سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ ملامتیوں کے افکار کے پس منظر سے بحث کرتے ہوئے سعید نفیسی نے جس دوسرے نکتے پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک کامیابی و کامرانی کی راہ صرف عشق ہے اور بس اس سلسلے میں عقل پر کوئی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ شیطان کی پیرو ہے۔ عشق کو برتری کا حامل قرار دینے اور عقل کی مذمت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ملامیتوں کے نزدیک عقل، مصلحت اور منفعت کی تابع ہوتی ہے اور عشق صرف تلاش حق اور حقیقت میں مصروف رہتا ہے (یہ صرف ملامتیوں کا نظریہ نہیں ہے

بلکہ صوفیوں کے پیشتر گروہ عشق کی برتری کے قابل ہیں نہ جانے کیوں سعید نفیسی نے اس چیز کو صرف ملامتیوں سے مختص کر دیا ہے، اس مقام پر سعید نفیسی نے وہی پرانی کہانی دہرائی ہے کہ جب عشق کی آفرینش ہوئی تو تمام موجودات عالم میں انسان کے علاوہ کوئی اور ایسا نہ تھا جو اس بارگراں کا متحمل ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے حافظ کے درج ذیل اشعار کو اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے:

در ازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد　　عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد
جلوہ کرد رخت، دید ملک عشق نداشت　　عین آتش شد ازین غیرت و بر آدم زد
عقل می خواست کزان شعلہ چراغ افروزد　　برق غیرت بہ درخشید و جہان برہم زد
مدعی خواست کہ آید بہ تماشاگہ راز　　دست غیب آمد و بر سینۂ نامحرم زد

ان اشعار کی مدد سے سعید نفیسی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس طرح یہ بات تعجب انگیز نہیں رہ جاتی کہ عاشق اپنے معشوق (خدا) سے پیوست ہو جائے اور معشوق اپنے عاشق کو قبول کر لے۔ اس سلسلے میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں صحیح تر بات حافظ نے کہی ہے۔

ساکنانِ حرم ستر و عفاف ملکوت　　با من راہ نشین بادہ مستانہ زدند
اسمان بار امانت نہ توانست کشید　　قرعۂ کار[1] بنام من دیوانہ زدند

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بہت سی باتیں لکھی جا سکتی ہیں جن میں سے کچھ کی شرح وہ اس مقام پر کریں گے جہاں "پیوستن بہ مبداء" (اصل میں مل جانا) کے تصور سے بحث کریں گے یہاں تک سعید نفیسی نے جو کچھ لکھا ہے اس کو تمہید سمجھنا چاہیے اس تمہید کے بعد وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ملامتیوں نے اس سلسلے میں مبالغہ اور غلو کی انتہا کر دی اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ ایرانی تصوف کے بہت سے عظیم مشایخ نے ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ ملامتیوں کا مسلک تیسری صدی (ہجری) کے اواخر میں عالم ظہور میں آیا۔ طاہر بن طاہر مقدسی نے ۵۰۷ھ کی اپنی تالیف کردہ کتاب "البدء والتاریخ" میں ان انتہا پسند غالیوں کو چار گروہوں میں متعارف کرایا ہے۔ حبینیہ، ملامتیہ، سوقیہ اور معذوریہ اور کہا ہے کہ مجموعی طور پر

[1] متن مطابق اصل۔ فال؟

ان لوگوں کا کام یہ ہے کہ یہ لوگ کسی معروف تصوف کے دبستان فکر کے پیرو یا کسی مخصوص عقیدے کے حامل نہیں کیونکہ یہ لوگ خودرائی اور پندار کا شکار ہیں اور اپنی رائے کے سامنے دوسرے کی رائے کو مطلقاً قابل اعتنا سمجھتے۔ ان میں سے کچھ لوگ نظریۂ حلول کی باتیں کرتے ہیں چنانچہ ان لوگوں میں سے ایک شخص کی زبان سے میں نے سنا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا مقام و مرکز بے ریش و بروت لڑکوں کے رخساروں کے درمیان ہے۔ ان لوگوں میں سے کچھ لوگ اباحت اور غفلت و بے پروائی کی باتیں کرنے اور سرزنش کرنے والوں کو سرزنش کرنے سے نہ چوکتے (کہ وہ لوگ ان کی سرزنش کیوں کرتے ہیں) ان میں سے کچھ لوگ عذر کی باتیں کرتے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک کفار اپنے افراد و انکار حق کے سلسلے میں معذور رہیں کیونکہ حق (خداوند تعالیٰ) ان لوگوں کے درمیان جلوہ فرما ہوا ہی نہیں بلکہ ان کی نگاہوں سے مستور رہے اور ان میں سے کچھ لوگ کہتے خدا کسی کو بھی سزا نہیں دیتا اور اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی کچھ دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ الحاد محض اور الحاد کی باتیں کرتے اور ان لوگوں کا کام صرف یہ تھا کہ کھائیں پئیں، سماع میں مشغول رہیں اور نفس کی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے رہیں۔

اس سلسلے میں جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ان افکار میں سے بعض موجودہ دور کے فلسفۂ وجودیت (Existentialism) میں بھی موجود ہیں۔ جیساکہ معلوم ہے اس فلسفۂ وجودیت کے عالم ظہور میں آنے کا سبب یورپ کے گذشتہ پچاس برسوں کے آلام و حوادث اور دو بڑی جنگیں ہیں (جنہوں نے آلام و آفات کو سنگین تر بنا دیا ہے) اس لئے ملامتیوں کے افکار کو بھی ان ناآسودگیوں اور محرومیوں کا نتیجہ سمجھنا چاہئے جو غیروں یعنی عربوں اور ترکوں کے ایران پر مسلط ہونے کے بعد ایرانی معاشرے کے حصے میں آئیں۔" (ص ص ۱۶۵-۱۶۶)

اس طول طویل اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سعید نفیسی نے اپنی تحریر میں ملامتیوں کے بارے میں معلومات درج کی ہیں وہ ان کے اصل الفاظ میں اردو دنیا کے سامنے آجائیں۔ اس اقتباس سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ یہ طریق تصوف تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ایران کے ان صوفیوں

کے ہاتھوں عالم وجود میں آیا جو اپنے افکار و رفتار میں انتہا پسند اور حد سے زیادہ ترقی پسند تھے۔ اس اقتباس سے یہ دلچسپ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس فرقے کے صوفیوں میں بھی کئی دبستان فکر ہو گئے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کیا کرتے۔ اگر اس موقع پر سعید نفیسی نے سینیہ۔ ملامتیہ، سوقیہ اور معذوریہ چاروں دبستانوں کے افکار پر الگ الگ روشنی ڈالی ہوتی تو ان لوگوں کے افکار و نظریات کے فرق کو سمجھنا آسان ہو جاتا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس دبستان فکر کے افکار و خیالات ملحدانہ ہیں اور وہ کون سا دبستان فکر ہے جو نوعمر لڑکوں کے رخساروں کے درمیان اپنے مقام و مرکز کے ہونے کا دعوے دار ہے۔ اگر تمام باتوں کا تفصیلی ذکر کر دیا جاتا تو ملامتیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی اور یہ فیصلہ کیا جا سکتا کہ اس گروہ کا تعلق واقعی صوفیوں سے ہے یا یہ آزاد اور بے عقیدہ اور بے کردار لوگوں کا ایک گروہ ہے جس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے جس کی وجہ سے بہت سے برگزیدہ مشائخ نے اس گروہ سے برملا اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اسی سلسلہ سخن میں سعید نفیسی نے اس گروہ کے پیشواؤں کا تعارف کرایا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سعید نفیسی نے بغیر کسی حوالے کے یہ بات لکھی ہے کہ لوگوں کے نزدیک ابوصالح حمدون بن احمد بن عمارہ قصار نیشاپوری (م ۲۷۱ھ) اس گروہ کے اولین پیشوا ہیں انہوں نے پہلے تو نیشاپور میں اس طریق تصوف کی اشاعت کا کام سرانجام دیا پھر وہاں سے اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت کے لئے عراق چلے گئے۔ سعید نفیسی نے بغیر کسی کتاب کا حوالہ دیئے یہ بھی دعویٰ کیا ہے! ابومحمد سہل بن عبداللہ شوستری (تستری) متوفی ۲۸۳ھ اور ابوالقاسم جنید بغدادی قواریری زجاج خراز جو کہ اصلاً نہاوندی تھے، دونوں حضرات نے ابوصالح حمدون کے عقاید کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس بات سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ طریق تصوف صرف ایران ہی میں قابل قبول نہیں سمجھا گیا بلکہ اسکو ایرانی حضرات نے بھی قابل قبول سمجھا جو ایران سے باہر اپنی زندگی گذار رہے تھے ابوصالح حمدون کے بارے میں سعید نفیسی نے صرف اتنی ہی اطلاع فراہم کی ہے اگر وہ اپنے ماخذ کا حوالہ دے دیتے تو اس کا فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا کہ کیا واقعی سہل بن عبداللہ اور جنید بغدادی نے ابوصالح حمدون کے افکار و نظریات کی توصیف کی ہے یا یہ سعید نفیسی کا ایک موہوم سا خیال ہے۔ ہمارے نزدیک حوالے کی اس کمی نے سعید نفیسی کی بات کو بے وزن کر کے رکھ دیا ہے۔

ابوصالح حمدون کے بعد ابوحفص عمر بن سلمہ حداد نیشاپوری (م ۲۶۴ یا ۲۶۵ یا ۲۶۷ھ) کو ملامتیوں کا دوسرا پیشوا سمجھا جاتا ہے۔ انکو ملامتیوں کا پیشوا قرار دینے کی وجہ سے سعید نفیسی نے

یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ملامتیوں کے افکار و نظریات پورے ایران میں بالعموم اور نیشاپور میں بالخصوص بہت مقبول تھے ان کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ ابو صالح حمدون نے جب اپنے افکار و نظریات کا برسرِ عالم اعلان کیا تو ایک دوسرے برگزیدہ صوفی ابوحفص عمر معروف بہ حدّاد نیشاپوری ان کے ہم نوا و ہم آواز بن گئے۔ سعید نفیسی کے نزدیک ملامتیوں کے تیسرے پیشوا ابوعثمان سعید بن اسمٰعیل جبری نیشاپوری (م ۲۹۸ھ) ہیں جنکا اصل وطن تو شہر رے تھا مگر وہ رہتے نیشاپور میں تھے۔ ان کے بارے میں سعید نفیسی نے نہ صرف یہ کہ تفصیلی معلومات فراہم نہیں کی ہیں بلکہ ان کا نام بھی صرف اس لئے لیا ہے تاکہ وہ یہ بات ثابت کر سکیں کہ نیشاپور میں یہ طریق تصوف کس قدر مقبول تھا۔

اس باب میں محمد عبداللہ بن محمد بن منازل نیشاپوری (م ۳۲۹ یا ۳۳۰ھ) کو ملامتیوں کا چوتھا بڑا پیشوا بتلایا گیا ہے ان کے بارے میں بھی سعید نفیسی نے تفصیلی معلومات فراہم نہیں کی ہیں بلکہ صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ لوگ ان کو ابوصالح حمدون کے حلقے کا فرد سمجھتے تھے۔ چونکہ ان کا انتقال ابوصالح حمدون کے انتقال کے تقریباً ساٹھ سال بعد ہوا ہے اس لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ محمد عبداللہ نے ابوصالح حمدون سے اپنی نوعمری میں ہی اکتساب فیض کیا ہوگا۔

درج بالا چاروں حضرات کا اجمالی تعارف کرانے کے بعد سعید نفیسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے:

"ابوحفص نیشاپوری نے کہا ہے "فتوت انصاف کو ادا کرنے اور مطالبہ انصاف کو ترک کرنے کا نام ہے (مطلب یہ ہے کہ فتی یا جوانمرد خود تو انصاف کرے مگر اپنے لئے انصاف کا طالب نہ ہو) اور یہ بھی کہا ہے" اگر تم جوانمرد ہو تو تمہاری موت کے دن تمہارا گھر جوانمردوں کے لئے عبرت اور نصیحت کی جگہ ہونا چاہئے"۔ ابوعثمان جبری نے کہا ہے" جوانمرد وہ ہیں جو خود کو نہ دیکھیں" ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوانمردوں یا فتیوں میں مکمل ہم آہنگی تھی اور یہ بات کہ فتی یا جوانمرد انتہا پسندی کے کاموں مثلاً رہزنی اور قتل سے بھی دریغ نہ کرتے تھے (اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ) یہ لوگ بھی ملامتیوں کی طرح وہ کام کرتے اور ان کو انجام دینے پر سراسیمہ و پریشان نہ ہوتے جو ظاہری طور پر لوگوں کو پسند نہ آتے (یہ بات اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ

ان دونوں گروہوں کے عقاید میں ایک گونہ اشتراک تھا" (ص ص ۱۶۷ - ۱۶۹)

سعید نفیسی نے "جوانمردوں" اور ملامتیوں کو ایک ہی قبیل کے افراد قرار دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتلائی ہے کہ دونوں گروہوں کے لوگ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے جن سے عوام برملا اپنی بیزاری بلکہ نفرت کا اظہار کرتے لیکن صرف اسی ایک مماثلت کی بنا پر دونوں گروہوں کے افراد کو ہم عقیدہ قرار دینا درست نہیں ہے۔ خود سعید نفیسی نے ملامتیوں کے ایک ایسے گروہ کی نشاندہی کی ہے جن کی باتوں کو انہوں نے الحاد سے تعبیر کیا ہے لیکن "جوانمردوں" باطنیوں کی وحشت و بربریت کے اعتراف کے باوجود انہوں نے اس گروہ کی کسی ایسی بات کی نشاندہی نہیں کی ہے جس پر الحاد کا اطلاق کیا جا سکے "جوانمرد" یا فتی جس طرح نو عمروں کی تربیت کرتے اور پھر ان کو اپنے سلسلہ میں داخل کرتے ان کا حال ایک الگ مقالہ میں لکھا جا چکا ہے۔ نو خیزوں کو داخل سلسلہ کرنے کے باوجود "جوانمردوں" میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں ملتا کہ نو خیز لڑکوں کے رخساروں کے درمیان ان کا مقام و مرکز ہے یعنی انہی کے ذریعے وہ حقیقت مطلق تک پہونچتے ہیں صرف اس ایک اشتراک کی بنا پر کہ دونوں گروہ کے افراد ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے جن کو عام طور سے لوگ پسند نہ کرتے، دونوں گروہوں کے عقاید کو مشترک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر سعید نفیسی نے ملامتیوں اور جوانمردوں کے عقاید کا تقابلی مطالعہ بھی مختصر مگر جامع انداز سے پیش کر دیا ہوتا تو ان کی بات باوزن اور بادلیل ہو جاتی۔ اس طرح کے تقابلی مطالعے کے فقدان کی وجہ سے ہم ان کی بات کو ظن و تخمین کا نام دینے پر مجبور ہیں۔

اپنے اس مطالعے میں سعید نفیسی نے اعتراف کیا ہے کہ فرقۂ ملامتیہ کے پیشواؤں کی کوئی تحریر ہم تک نہیں پہونچی ہے۔ ان کے بارے میں جو اطلاعات ہماری دسترس میں ہیں وہ وہی ہیں جو ان صوفیوں کی تحریر کردہ ہیں جو ملامتیوں کو اپنے آپ سے بالکل جدا گروہ کا فرد سمجھتے ہیں اور ان سے بیزاری کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ سعید نفیسی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دوسرے صوفیوں نے ملامتیوں پر نہ صرف اعتراضات کئے ہیں بلکہ ان کے صوفی ہونے کے بھی قایل نہیں ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان صوفیوں نے مبالغہ سے کام لیا ہوگا، معلوم ہوتا ہے در پردہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسرے صوفیوں نے ملامتیوں کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ غلط اور تعصب سے معمور ہیں صوفیوں

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "ایرانی تصوف میں جوانمردی کا تصور"

نے ملامتیوں کے افکار و نظریات کے بارے میں جو معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ یہ ہیں۔

ملامتی بھی اس بات کے قایل تھے کہ خدا معبود مطلق ہے اس لئے ان کا یہ خیال تھا کہ اسی کو مخلوق کے اعمال کو منتخب کرنا چاہیے، اس لئے سالک کو نہ تو اپنے اعمال پر نظر کرنا چاہئے اور نہ ہی اس بات کی مطلق پرواہ کرنی چاہیئے کہ دوسرے لوگ اس کے عمل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کو تو اپنا ہر کام خلوص کے ساتھ انجام دینا چاہیئے اور ریاکاری سے بچنا چاہیئے۔ جب سالک کو اپنے نفس سے بدگمانی ہونے لگے تو وہ یہ سمجھے کہ وہ حق سے حسنِ ظن کی طرف پہلا قدم اٹھا رہا ہے (مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس سے بدگمان ہونا، حق سے حسن ظن رکھنے کے مترادف ہے) اپنے اخلاق اور معاملات میں آزاد رہے اور صوفیوں کی طرح کوئی ایسا لباس نہ پہنے یا ایسے اعمال اختیار نہ کرے جو اس کو عام لوگوں سے ممتاز و متمائز کریں تاکہ وہ خودنمائی میں مبتلا نہ ہو سکے۔

ملامتیوں کو اس بات کی خاص طور سے ہدایت کی جاتی کہ وہ خیر کو ظاہر کرنے اور شر کو چھپانے کی مطلق کوشش نہ کریں انکو یہ بھی تعلیم دی جاتی کہ وہ عبادت کو خالق اور مخلوق کے درمیان کا ایک راز سمجھیں اور نیکیات کی کوشش نہ کریں کہ عوام ان کی عبادت کو تعریف وتحسین کی نظر سے دیکھیں، بلکہ اس طرح عبادت کریں کہ خلق خدا ان کو ملامت کرنے لگے جو ملامتی ریا میں ملوث نہ ہوں وہ بھی کوشش کرکے اپنے نفس کے عیوب اور قبائح عوام کے درمیان بیان کرتے رہیں تاکہ عام لوگ ان کو اپنے جیسا ہی انسان سمجھیں اور ان سے دور نہ بھاگیں۔ یہ انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ اس فرقہ سے منسلک لوگ ہمیشہ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے جس کی بنا پر خلق خدا ان کی مذمت کرتی۔ یہ عمل ملامتیوں کے لئے اس لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی عبادت پر ناز و غرور نہ کرنے لگیں اور نہ ہی اپنی عبادت ریاضت کو عوام میں مقبول ہونے کا ذریعہ بنائیں۔

سعید نفیسی کے نزدیک عام صوفیوں اور ملامتیوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ صوفیوں کے نزدیک انسانی نفس کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس لئے صوفیوں کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ اپنے نفس کو نابود کر دینے کی کوشش میں سرگرداں رہتے بقول سعید نفیسی صوفیہ ظاہری اعمال کو اپنے باطن کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے اور اپنے زہد، ریاضت اور کرامت کو ظاہر کرنے پر فخر و غرور بھی کرتے، صوفیوں کے برعکس ملامتیہ فرقہ کے افراد اپنے باطن کو برملا ظاہر کرتے، یہی نہیں بلکہ اس گروہ کے افراد کا یہ بھی

خیال تھا کہ اپنے زہد، ریاضت اور کرامت کو ظاہر کرنا جہل و نادانی ہی نہیں ریا کاری بھی ہے اس لئے اس گروہ کے افراد اپنے باطن کو عوام الناس کے سامنے ہمیشہ بے نقاب رکھتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ وہ ان میں مقبول نہ ہونے پائیں۔

سعید نفیسی نے اپنی اس تحریر میں درپردہ اس بات کا بھی جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ صوفیوں نے ملامتیوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیوں کیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی بناپر وہ صوفی حضرات بھی ملامتیوں کی آواز سے اپنی آواز نہ ملا سکے جو سعید نفیسی کے قول کے مطابق خود بھی مطلقاً ظاہری شریعت کے پابند نہیں تھے۔ اس سلسلے میں سعید نفیسی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"اس بات میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ صوفیہ بھی مطلقاً شریعت کے ظواہر کے پابند نہ تھے اور جب بھی انکو موقع ملا انہوں نے شریعت کے ظواہر کی نفی کی باتیں کی ہیں لیکن انہوں نے اپنے مخالفوں کی ہنگامہ آرائی سے بچنے اور اپنے مسلک و طریق کو بے اثر یا غیر فعال نہ ہونے دینے کے لئے ملامتیوں کے بے باکانہ اظہارات کا انکار کیا ہے اور اپنے عقاید کے جوہر و اصلیت کو کنایوں، استعاروں اور اپنی مخصوص اصطلاحوں میں ملفوظ کر کے بیان کیا ہے تاکہ متشرع حضرات کے شر، بدخواہی اور ہنگامہ آرائی سے محفوظ و مامون رہیں۔" (ص ۱۶۹)

اسی سلسلۂ سخن میں سعید نفیسی نے ابن العربی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ابن العربی کے نزدیک فرقۂ ملامتیہ سے "تعلق رکھنے والے افراد" کا ملان اہل طریقت" تھے، سعید نفیسی نے ابن العربی سے یہ بات بھی منسوب کی ہے کہ ان کا قول ہے کہ اگر لوگوں کو ملامتیوں کے مقامات بلند کا علم ہو جائے تو لوگ خدا کی طرح ان کی پرستش کرنے لگیں ان لوگوں کے عقاید کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، ان کا درک وہی کر سکتا ہے جو اہل اللہ میں سے ہو۔ اسی ضمن میں ابن العربی نے حضرت بایزید بسطامی، حضرت عبدالقادر گیلانی اور خود اپنے آپ کو اسی فرقے کا فرد گردانا ہے اور کہا ہے ملامتیہ اس مقام پر فائز ہوتے ہیں جس سے بلند درجہ صرف نبوت کا ہوتا ہے۔ سعید نفیسی نے ابن العربی سے منسوب جو بات لکھی ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ نہیں لکھا کہ ابن العربی نے اپنی کس کتاب میں اس طرح کی بات لکھی ہے جب تک ابن العربی کی اصل عبارت محقق نہ ہو جائے اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ابن العربی

کا قول ہے یا سعید نفیسی کی ذہنی اختراع ؟

اسی سلسلہ میں سعید نفیسی نے اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ ایک طرف تو صوفیوں نے کبھی بھی "جوانمردوں" یا فیتوں کو اجنبی یا غیر نہیں سمجھا اور دوسری طرف فتیوں یا "جوانمردوں" نے ملامتیوں کے عقاید یعنی ایثار، سخاوت، ایذا رسانی سے اجتناب، کسی طرح کا شکوہ و شکایت نہ کرنا وغیرہ کو اپنائے رکھا۔ ان باتوں کی وجہ سے سعید نفیسی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صوفیوں نے ملامتیوں سے اپنی جس بیزاری کا اظہار کیا ہے وہ مصلحت وقت کی بنا پر تھی ورنہ درحقیقت صوفیوں اور ملامتیوں کے افکار و خیالات و نظریات میں کوئی فرق و اختلاف نہ تھا۔ انکے نزدیک صوفی، ملامتی، فتی یا "جوانمرد" یہ تینوں ایک ہی اصل کے تین رخ ہیں۔ جس طرح صوفیوں میں مختلف سلاسل عالم وجود میں آئے اسی طرح ملامتیوں میں بھی مختلف دبستانوں کا ظہور رہا جن میں آپس میں جزوی اختلاف تو تھا مگر اصل روح کے اعتبار سے سب ایک ہی جیسے تھے۔

ان اطلاعات کو فراہم کرنے کے بعد سعید نفیسی نے اس بات سے بحث کی ہے کہ نقش بندی صوفیہ، ملامتیوں کے بارے میں کس خیال کے حامل تھے اور انکو کس نظر سے دیکھتے تھے؛ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم آئندہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے

صفحہ ۵۶ کا بقیہ غیاث الدین صاحب نے آسان اور موجودہ رائج زبان میں منتقل کر کے لذت سحر کے نام سے شایع کیا ہے اور آخر میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کا ایک بیش قیمت مضمون مضمون تہجد بھی شامل کر دیا ہے اس کے مطالعہ سے قارئین کو لذت آہ سحر گاہی اور ذوق نیم شبی سے ضرور بہ کچھ نہ کچھ حصہ ملے گا

عطار ہو رومی ہو رازی ہو یا غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

الرشاد کی ڈاک

مکرمی تسلیم

مدت سے آپ کی خیریت نہیں ملی ہے، خدا بخش خطبات کے لیے آپ کی طرف سے وقت کا انتظار ہے، اس سے پہلے بھی میں نے لکھا تھا، اب پھر دہرا رہا ہوں کہ آپ کے دیئے ہوئے عنوانات میں فقہ اسلامی کا دائرہ کار اور اس میں اجتہاد کی حیثیت، میرے خیال میں سب سے زیادہ مفید رہے گا، خصوصاً اس لیے کہ آپ نے اس موضوع کے متعلقات پر جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس موضوع پر بھی آپ کے خطبات خاصے کی چیز ہوں گے، براہ کرم جواب سے نوازیں، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ——— والسلام

عابد رضا بیدار

میمونہ خاتون، ٹیچرس فلیٹ نمبر ۱
بنارس ہندو یونیورسٹی

۲۱ / ۱۲ / ۱۹۸۵ء

علیم و خبیر کون ؟

اللہ رب العلمین یا علمائے ملت اسلامیہ ہند،

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن پاک میں اختلافات زن و شوہر کی اصلاح و درستگی کیلئے جو حکیمانہ نسخۂ شفا تجویز کیا ہے، وہ یہ ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا، اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا، (نساء، ۳۵)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائیگا، تو چاہیے کہ ایک پنچ شوہر کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبے سے، اگر دونوں پنچ چاہیں گے تو اللہ میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کردیگا، بیشک ... اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے،

جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے تمام ملک کے منتخب چھ سو سے زائد علماء کی موجودگی میں تعلقات زن و شوہر کی اصلاح و درستگی کے لیے جو قرارداد پاس کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے ۔

" ایک قرارداد میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کو اسلام کے عطا کیے ہوئے حقوق نہ ملنے کی وجہ سے بعض اوقات جو دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کے سدباب کی ایک صورت یہ ہے کہ نکاح کے وقت اس قسم کا عہدنامہ گواہوں کی تصدیق کے ساتھ لکھ دیا جائے کہ شرعی حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہونے پر ایک معاملہ فہم متدین شخص سے (جس کا پہلے سے تعین کر دیا جائے) رجوع کیا جائے، جس کا فیصلہ دونوں فریقوں کو منظور ہوگا، اور اس فیصلے کے خلاف کوئی فریق کسی عدالت میں نہیں جائے گا۔" (قومی آواز لکھنؤ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

(۱) خدائے علیم و خبیر نے دو حکم کا تعین کیا ہے۔ جمعیۃ العلماء کی قرارداد میں صرف ایک معاملہ فہم متدین شخص کو متعین کیا گیا ہے۔

(۲) خدائے علیم و خبیر نے تصریح فرمائی ہے کہ ان میں سے ایک شوہر کے گھرانے سے ہونا چاہیے، اور دوسرا بیوی کے گھرانے سے۔ اس کے برخلاف جمعیۃ العلماء کی قرارداد میں یہ بات گول کر دی گئی ہے کہ وہ معاملہ فہم متدین شخص کون ہوگا اور کہاں سے آئے گا؟

(۳) خدائے علیم و خبیر نے دو حکم کا تعین اس وقت کرنے کا حکم دیا ہے، جب یہ معلوم ہو جائے کہ زن و شوہر میں اختلافات اس درجے کو پہنچ گئے ہیں، کہ طلاق یا خلع کے ذریعہ دائمی جدائی و مفارقت پر منتج ہو سکتے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی قرارداد میں یہ تکلف رشتۂ عقد و نکاح کے نقطۂ آغاز ہی میں کیا گیا ہے۔

(۴) خدائے علیم و خبیر نے دونوں حکموں کو اتنے وسیع اختیارات نہیں دیئے ہیں، جتنے اختیارات جمعیۃ العلماء کی قرارداد میں صرف ایک معاملہ فہم متدین شخص کو دے دیئے گئے ہیں۔

فیصلہ ملت اسلامیہ ہند کے عوام کو کرنا ہے کہ وہ اپنے لئے مذکورہ صدر دونوں نسخوں میں سے کون سا نسخہ پسند کرتے ہیں، میرا فرض تھا کہ دونوں نسخوں کے تضادات کی نشاندہی کر دوں، سو میں اس فریضہ کو ادا کر چکی۔

(ادارہ) راقم الحروف نے جمعیۃ علمائے ہند کی تجویزیں دیکھی نہیں ہیں، اگر واقعی وہی تجویز ہے جس کا ذکر آپ نے کیا ہے، تو واقعی یہ تجویز قرآن پاک کی صراحت کے خلاف ہے، اور آپ کا اعتراض صحیح ہے، اسی بنا پر آپ کی تحریر عام فائدہ کے لیے شائع کی جا رہی ہے۔

کوائف جامعۃ الرشاد

مدرسہ کے کتب خانہ میں بحمد اللہ پہلے سے تفسیر، حدیث اور فقہ کی تقریباً تمام اہم کتابیں موجود ہیں، مگر ادھر عزیزی محمد عامر رشادی سلمہ کی کوششوں سے تفسیر وحدیث کی بعض اور اہم کتابوں کا اضافہ ہوا ہے، مثلاً حافظ ابن کثیر کی "البدایہ والنہایہ" مکمل، "تاریخ بغداد" مکمل، زرکلی کی "الاعلام" مکمل، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مختصر تفسیر ابن کثیر، سمہودی کی وفاء الوفاء مکمل، امام رازی کی تفسیر رازی مکمل، محمد امین بن محمد مختار کی اضواء البیان مکمل، تفسیر ابن سعود مکمل، ابن ندیم کی الفہرست، ابوبکر خلیفہ اموی اشبیلی کی فہرست، ماروا عن شیوخہ اور حاجی خلیفہ چلپی کی کشف الظنون مکمل،

بعض کتابیں جو پہلے سے موجود تھیں، ان کے نئے ایڈیشن آگئے ہیں، مثلاً سیرت ابن ہشام، زاد المعاد اور المغنی وغیرہ

مدینہ یونیورسٹی اور جامعۃ الامام وغیرہ میں پہلے سے مدرسہ کی سندوں کا معادلہ موجود ہے، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے یہاں کی فضیلت کی سند کو براہ راست ایم۔ اے میں داخلہ کے لیے منظور کرلیا ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے کئی سال پہلے اس کی عالمیت کی سند کو منظور کرلیا ہے، رانچی یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے خط وکتابت جاری ہے،

ربیع الاول کے آخر میں عربی درجات اور حفظ کے طلبہ کا ششماہی امتحان ہوا، اور ربیع الثانی کے شروع میں مکتب کے بچوں کا امتحان ہوا، بحمد اللہ امتحان اسی اہتمام سے ہوا جس

اہتمام سے سالانہ امتحانات ہوتے ہیں، زیادہ تر مضامین کے امتحانات تحریری ہوئے، حتیٰ کہ کتب کے درجہ دوم تک کے بچوں کے امتحانات تحریری ہوئے، اور نتائج قابل اطمینان رہے۔

اس ماہ مدرسہ کے لیے ایک غم آمیز خوشی کی بات یہ ہوئی کہ اونچے درجہ کے ایک استاذ مولانا عبدالحی صاحب خیرآبادی کو افریقہ کے ایک مدرسہ میں ذمہ دار کی حیثیت سے بلا لیا گیا، جس سے ہم کو بھی خوشی ہوئی۔ مگر ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا، اس سے ہم سب لوگوں کو غم بھی ہے، انھوں نے جس دلجمعی اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دیئے، اس زمانہ میں اس کی مثال کم ملتی ہے، ہم سب دعاگو ہیں کہ وہ وہاں خوش و خرم رہیں، اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں، انھوں نے اپنی الوداعی تقریر میں یہ وعدہ کیا کہ جب بھی وہاں سے واپسی ہوگی، جامعۃ الرشاد ہی میں واپس ہوں گا، انشاء اللہ!

مسلک اہلحدیث اور
۱- ایک ہاتھ سے مصافحہ
۲- اور طلاق ثلاثہ

پہلے پمفلٹ میں احادیث نبوی کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ افضل دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا ہے، لیکن ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر جو لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں، ان کا طرز عمل سنت نبوی کے خلاف ہے،

دوسرے پمفلٹ میں طلاق ثلاثہ کے متعلق سعودی عرب کے علماء کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے، پھر مرتب الرشاد کے قلم سے اس پر تحقیقی بحث ہے،

ناشر:-

دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ، یو-پی

نئی کتابیں

(نسیم ظہیر اصلاحی غازیپوری)

احکام میت از مولانا محمد احمد صاحب قاسمی، چھوٹی سائز، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط صفحات ۴۶، قیمت ندارد، ناشر عبدالاحد قریشی منیجر مکتبہ فیض طیب۔ محلہ چاندپورا چوراہا، شہر بہرائچ، (یوپی)

میت اور متعلقات میت کے احکام سے جہاں عموماً لوگ ناواقف ہوتے ہیں، وہیں جہلا میں نہ معلوم کتنے رسوم و بدعات اور طرح طرح کے خرافات ایجاد ہو گیے ہیں، میت اور اس سے متعلق ضروری احکام فقہ و فتاوی کی بڑی بڑی کتابوں میں بلاشبہ تفصیل سے موجود ہیں، مگر ان سے عام لوگوں کا مستفید ہونا مشکل ہے، ایسی صورت میں فاضل مصنف کا یہ رسالہ یقیناً عوام اور بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بڑی ضرورت کی چیز ہے، مصنف نے بڑے سلیقہ اور ترتیب سے "موت کے حالات، طریقۂ غسل، کفن، قبر کے احکام، طریقۂ ایصال ثواب، سیوم، دسواں، چالیسواں کی شرعی حیثیت، قبر پر پھول چادر چڑھانا، اس پر تعمیر اور گنبد وغیرہ بنانا" ان کے علاوہ اور بہت سے جزوی مسائل کو قرآن و حدیث اور فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق بیان کیا ہے، اس لیے یہ کتاب عام لوگوں کے پڑھنے اور مطالعہ کے لائق ہے،

زبان میں سلاست اور روانی نہیں ہے، جہاں بعض رسوم و رواج کا رد کیا ہے، وہاں زبان بہت تیز ہو گئی ہے، بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا حوالہ ضروری تھا، مثلاً "اگر بغیر روشنائی کے انگلیوں سے میت کی پیشانی یا سینہ پر کلمہ شریف لکھ دے تو کوئی حرج نہیں"۔ (ص ۳۵)

ہمارے یہاں مردے کیلئے یا مکان اور دکان میں برکت کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کا بڑا رواج ہے اس سلسلہ میں مصنف "نصاب الاحتساب" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

ان ختم القرآن جہرا بالجماعۃ ولیسمی بالفارسیۃ سیپارہ خواندن مکروہ است، | قرآن کو تمام لوگ بآواز بلند برائے ایصال ثواب جو پڑھتے ہیں جس کو سیپارہ پڑھنا کہتے ہیں، کروہ ہے،

جگہ جگہ عربی عبارتوں کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے، آئندہ اڈیشن میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے، مجموعی حیثیت سے رسالہ مفید ہے، اور مطالعہ کے لائق ہے،

شاہ طیب بنارسی | از محمد ارشد اعظمی، صفحات ۷۰، کاغذ، کتابت وطباعت غنیمت، قیمت ۳/روپئے، مکان نمبر ۱/۱۶ دلی بازار بنارس کینٹ،

اب سے چار صدی پہلے بنارس میں ایک اہل دل بزرگ مولانا شاہ محمد طیب بنارسی گذرے ہیں، جن کی ذات گرامی بنارس و نواح بنارس کے لیے سرچشمہ ہدایت تھی، زیر نظر کتابچہ انہی کے حالات زندگی پر مشتمل ہے،

مرحوم کے ایک خاص شاگرد اور مرید مولانا شاہ محمد لیسین بنارسیؒ نے "مناقب العارفین" کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا، جس کا ایک قلمی نسخہ مظہر العلوم بنارس کے کتب خانہ میں موجود ہے، اسی کی روشنی میں مولانا محمد ارشد صاحب نے شاہ صاحب موصوف کے حالات اور فضائل و کمالات کو مرتب کیا ہے، اس رسالہ کے مطالعہ سے ایک اہل اللہ کے مقدس حالات زندگی سے واقفیت ہوگی، اور اپنی زندگی کے لیے عبرت حاصل ہوگی،

لذتِ سحر | علامہ نواب قطب الدین صاحب مرحوم، تسہیل مولانا غیاث الدین صاحب مظاہری صفحات ۸۸، مکتبہ عزیزیہ بخشی بازار الہ آباد،

شارح حدیث مولانا قطب الدین خاں صاحبؒ (۱۲۱۶ھ، ۱۲۸۹ھ) مصنف "مظاہر حق" شرح مشکوٰۃ نے "ناشئۃ اللیل" نامی ایک رسالہ تہجد کے احکام و فضائل پر مشتمل تحریر فرمایا تھا جو اب تقریباً نایاب ہے، اگر کہیں کوئی اس کا نسخہ موجود ہے بھی تو ایک صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے اس کی زبان و بیان کا اسلوب عام لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہوگیا ہے، چنانچہ اسی رسالہ کو مولانا

باقی بر صفحہ ۵۰

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں، اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔ قیمت ۲/

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں، اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ "الاقبال" میں بھی شائع ہوا ہے، اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔ قیمت ۱۵/

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جن میں جدید مسائل کے حل کے لئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جن کی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت للعہ/

قرآن پاک کی تعلیم اور اس کی عظمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے ہم بار بار پڑھیں، سمجھیں اور اپنی زندگی میں اسے اتاریں، مگر نہ صرف عام مسلمان اس سے غفلت برت رہے ہیں بلکہ ہمارے مدارس میں بھی اس کی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنا کہ اس کا حق ہے اس رسالہ میں اس کی توجہ دلائی گئی ہے

مسئلہ کفاءت

شادی بیاہ میں کن چیزوں کی برابری ہونی چاہیئے اس مسئلہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں میں برادریوں میں جو مصنوعی تقسیم قائم کی گئی ہے۔ شریعت میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱۵/

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ یو پی)

Regd. No AZM / N. P. 42 / 84 Phone :- 461
Regd. No. R. N 38937 / 81

Monthly Jameatur Rasahad
Azamgarh (U. P.)

شہر اعظم گڈھ کا مشہور ادارہ

جامعۃ الرشاد
ایک نظر میں

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرات (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ اس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جسکے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ڈیڑھ درجن سے زائد لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ چار لاکھ روپئے کے قریب ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اسکا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہوچکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کیساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئے مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہوجاتا ہے۔